رسول کریم ﷺ کے آخری ایّام

مؤلفہ:

فیروزالدین احمد فریدی

جملہ حقوق بحقِ مؤلّف محفوظ

(یہ کتاب، مؤلّف کی تحریری اجازت کے بعد، چھاپنے کی اجازت ہے)

نام کتاب: رسول کریم ﷺ کے آخری ایّام

تحقیق وتالیف: فیروزالدین احمد فریدی

اشاعتِ اوّل: ۲۰۱۳ء

مطبع: ایجوکیشنل پریس، پاکستان چوک، کراچی

ہدیہ: (پاکستان میں) ۳۱۳/ پاکستانی روپے

(بھارت میں) ۲۰۰/ بھارتی روپے

(دیگر ممالک میں) ۲۰/ امریکی ڈالر

ISBN: 978-969-8235-07-09

ناشر:

فاطمہ پبلی کیشنز، کھتوال ہاؤس

A-54، سٹریٹ۔15، باتھ آئی لینڈ، کراچی۔75530

Email: firozuddin_ahmed@yahoo.com

اکیسویں صدی عیسوی/ پندرھویں صدی ہجری
کے انسان کے نام

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
(اقبال)

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

(غالبؔ میں نے اپنے خواجہ کی ثنا اللہ پر چھوڑ دی
کہ وہی پاک ذات محمدؐ کا صحیح مرتبہ جانتی ہے)

حُسنِ ترتیب

۱۔ حرفِ اول وحرفِ آخر ۶

۲۔ وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ ۷

۳۔ رسول کریم ﷺ کے آخری ایّام ۱۳

۴۔ رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات ۱۹۹

۵۔ رسول کریم ﷺ کا وقتِ وصال ۲۵۷

۶۔ جہاں حضور ﷺ آرام فرما ہیں ۲۹۱

حرفِ اوّل وحرفِ آخر

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستان لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

(شبلی)

وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ

ان سطور کی ابتدا، ایک عاشقِ رسول ﷺ کے ایک خط کے چند الفاظ سے ہے، جو پچھلی صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں لکھا گیا۔ یہ صاحب، بحری جہاز میں، ہندوستان سے انگلستان جارہے تھے۔ مہینا ستمبر کا تھا، سال ۱۹۳۱ء۔ جب جہاز عدن کے قریب پہنچا اور بحیرۂ عرب کی نرم موجوں پر تیرتی ہوئی ان کی نظر پہلی بار جزیرہ نمائے عرب کی زمین پر پڑی تو قلب میں طوفان بپا ہوگیا اور جس طرح صدف کے منہ میں قطرۂ آب ٹپک کر گہرِ آب دار بن جاتا ہے، ان کے قلم سے یہ ۴۳/ الفاظ، یکے بعد دیگرے، موتیوں کی مانند ٹپکے اور انمول ہوگئے:

''اے عرب کی سرزمین! تو ایک پتھر تھی جسے دُنیا کے معماروں نے رَد کردیا تھا، مگر ایک یتیم بچے ﷺ نے خدا جانے تجھ پر کیا اَفسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دُنیا کی تہذیب وتمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔''

یہ مختصر، سیدھے سادے، دل نشین الفاظ نہ صرف عشق وعقیدت سے شرابور ہیں بلکہ تاریخ کی ایک لازوال حقیقت کے ترجمان بھی ہیں۔ ان لازوال الفاظ کے مرتب ومعمار کا نام تھا: محمد اقبالؒ

دُنیا میں کم لوگ ایسے گزرے ہیں جنہیں مہد سے لحد تک اتنے مصائب، مشکلات اور مہمات کا سامنا کرنا پڑا ہو، جتنے محمد ﷺ کو اپنی مختصر دُنیاوی زندگی میں پیش آئیں جو قمری تقویم کے حساب سے ۶۳/ اور عیسوی کیلنڈر کے مطابق ۶۱/ برسوں پر محیط رہی۔ ماں کے پیٹ

میں تھے کہ باپ چل بسے۔ چھ برس کے ہوئے تھے کہ ماں کی گود سے محروم ہوگئے۔ نو برس کے تھے کہ سرپرست دادا اللہ کو پیارے ہوئے۔ چچا کی سرپرستی میں آئے تو چچا کی مالی حالت پہلے ہی سے زبوں تھی اور اِس طرح دُنیا کا عظیم ترین انسان ﷺ جس سے ربِ ذوالجلال کو رہتی دُنیا تک انسانوں کی گلہ بانی کا کام لینا تھا، مکے کے گرد واقع جھلسی ہوئی سیاہ پہاڑیوں، خشک ٹیلوں اور گرم صحراؤں میں مویشیوں کی گلہ بانی کرتا رہا۔ ان حالات میں جنم لینے والے گم نامی میں پیدا ہوتے، گم نامی میں زندگی کی سانسیں پوری کرتے، اور گم نامی میں ہی مرجاتے ہیں، اور ان کی موت کے چند برس، بلکہ بعض اوقات چند ماہ بعد، خود ان کی اپنی اولاد بھی انہیں بھولنے لگتی ہے، لیکن مکے کے اس یتیم بچے ﷺ کے لیے لوحِ محفوظ میں درج تھا:

"وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" ''ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا''

یہ اللہ کا حکم تھا جو آسمانوں پر لکھا ہوا تھا اور وقت آنے پر، جب اس حکم اور فیصلے کا اعلان، عرب کی زمین پر، ایک ایسے انسان ﷺ کی زبان سے کرایا گیا جو رسمی تعلیم سے محروم تھا تو وہ وقت اس انسان ﷺ کی ۶۱ سالہ زندگی کا سخت ترین دور تھا۔ دوست چند، مخالف دو چند اور مصائب دہ چند۔ اُس وقت اُن مٹھی بھر دوستوں کو چھوڑ کر باقی سب نے یہی سوچا، یا کہا ہوگا کہ لو سنا تم نے! کیسی نا قابلِ یقین بات کہی جارہی ہے، لیکن جب صاحبِ کُنْ فَیَکُوْن ایک بار حکم دیتا ہے کہ ''ہوجا'' تو انہونی باتیں آناً فاناً ہوجاتی ہیں۔ چند برسوں میں یہ نا قابلِ یقین بات حقیقت بن گئی اور وہ ذکر جو عقبہ کی گھاٹیوں اور فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوا تھا پورے جزیرہ نمائے عرب پر چھا گیا۔ سال صدیاں بنتے گئے۔ آج چودہ صدیاں بیت چکی ہیں۔ میں نے اپنے گناہ گار کانوں سے آسٹریلیا کے مغربی ساحل پر بھی یہ ذکر بلند ہوتے سنا۔ سوئٹزرلینڈ کے برف پوش پہاڑوں کے دامن میں بھی انسانوں کو یہ گواہی دیتے اور پہاڑوں کو اِسے دُہراتے سنا۔ افریقہ کے ریگ زاروں اور انگلستان کے سبزہ زاروں، سپین کے کلیساؤں اور امریکہ کی وسعتوں میں بھی اس پاک ذکر کو اپنی پوری رعنائیوں سے جلوہ گر دیکھا۔ بھلا اس بندے ﷺ کے ذکر کی رفعتوں کا کیا ٹھکانا جس پر خود اس کا آقا اور مولا سلام بھیجے۔ یہی تو وہ ایک کام ہے

جس میں عبد کے ساتھ معبود اور مخلوق کے ساتھ خالق بھی برابر کا شریک ہے۔

محمد ﷺ جب غارِ حرا میں داخل ہوئے تو محمد بن عبداللہ تھے، جب نکلے تو محمدؐ رسول اللہ ﷺ تھے، لیکن تفویضِ رسالت سے پہلے بھی، محمد بن عبداللہ کی زندگی کا محور اللہ کی ذات تھی جو منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے بعد، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، ان کی رگ رگ، روئیں روئیں اور نفس نفس میں سما چکا تھا۔ ''من تو شدم تو من شدی'' کی اس سے مکمل عملی تفسیر دُنیا کبھی پیش نہ کر سکے گی۔ قرآن پڑھیں تو بعض جگہ یوں لگتا ہے جیسے دو دوستوں میں دِل کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کہیں محبت کا اظہار ہو رہا ہے، کہیں تسلی دی جا رہی ہے، کہیں تعریف کی جا رہی ہے، کہیں خوش خبری دی جا رہی ہے، کہیں معمولی لغزشوں پر ٹوک کر درگزر کیا جا رہا ہے اور کہیں دوست ﷺ پر سلام بھیجا جا رہا ہے۔ سلام بھیجنے والا کون؟ اور دوست ﷺ بھی کیسا!

محمد ﷺ دیکھنے میں تو گوشت پوست کے ایک انسان لگتے تھے لیکن حقیقت میں اللہ کا ایک جامع پروگرام تھے جو کمپیوٹر کے پروگرام کی طرح اُن کے دِل، دماغ اور روح میں جذب کر دیا گیا تھا اور انہیں ہر لمحے کنٹرول کرتا تھا کیوں کہ ان کو بھیجنے والے نے اس مبارک ہستی ﷺ کو ایک خاص مقصد کے لیے اس جہانِ فانی میں بھیجا تھا۔ ان ﷺ کا ہر قول اور ہر فعل اللہ کی طرف سے تھا اور انہیں بھی علم تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جب یہ فیصلہ کرنے کا وقت آیا کہ وہ ﷺ مدینے میں کس کے مہمان ہوں گے تو زبان سے نکلا کہ جہاں بھی میری اونٹنی بیٹھ جائے۔ اونٹنی جہاں بیٹھی، وہاں ایک نالے، چند قبروں، کچھ درختوں اور چھوارے بنانے کے چند چبوتروں کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن اونٹنی کے بیٹھنے کے بعد، چودہ سو برس سے، لاکھوں نہیں، کروڑوں نہیں، اربوں کی تعداد میں دُنیا کے ہر کونے سے، ہر عمر، رنگ، زبان، ملک اور قوم کے انسان، ہر قسم کی سواریاں دوڑاتے، اس مختصر سی جگہ کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے کے لیے رواں دواں رہے ہیں اور انسان کی بات محض اس لیے کی جا رہی ہے کہ انسانی آنکھ ابھی انسانوں کو ہی دیکھ سکتی ہے۔ اسی طرح چند برس بعد جب حدیبیہ کے مقام پر فیصلہ کرنا تھا کہ اسلامی لشکر کہاں

پڑاؤ ڈالے تو پھر یہی فرمایا کہ جہاں میری اونٹنی بیٹھ جائے۔ اونٹنی جہاں بیٹھی وہاں پانی سواری کے لیے تھا، نہ سواروں کے لیے۔ ساتھیوں کو قدرتی طور پر تشویش ہوئی لیکن اونٹنی سوار ﷺ کے اترتے ہی پانی بھی مل گیا اور وہ معاہدہ بھی ترتیب پایا جسے رب العالمین نے ''فتحِ مبین'' قرار دیا۔ فیصلہ اونٹنی کر رہی تھی نہ وہ ﷺ۔ فیصلہ تو کوئی اور ہی کر رہا تھا! سچ تو یہ ہے..... ہر چند ہر سچ کی طرح اس سچ میں بھی مشکل بہت ہے..... کہ جب انسان اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ پھر انسان کے ہاتھ میں اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اللہ کے فیصلے انسان کے فیصلے ہو جاتے ہیں اور انسان کے فیصلے اللہ کے فیصلے بن جاتے ہیں۔

محمد ﷺ کی زندگی اللہ کے کلام کے مطابق اُسوۂ حسنہ تھی۔ قرآن کے الفاظ میں آپ ﷺ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر تھے۔ ان ﷺ کی محبوب ترین بیوی عائشہؓ کے الفاظ میں قرآن آپ ﷺ کا اخلاق تھا۔ ایک قرآن وہ ہے جسے ہم اور آپ دیکھتے، سنتے اور پڑھتے ہیں۔ ایک قرآن وہ تھا جو مکے کے بازاروں اور مدینے کی گلیوں میں گشت کرتا تھا۔ جو خانہ کعبہ میں ملتزم سے لپٹ کر، بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا تھا۔ جو تپتے بخار کی حالت میں، رات رات بھر، جنت البقیع میں، اپنے امتیوں کی قبروں پر گڑگڑا، گڑگڑا کر ان کے لیے دُعائے مغفرت کیا کرتا تھا۔ جو معصوم بچوں کو کبھی اپنے سینے سے چمٹاتا، تو کبھی ان کے لیے سواری بن جاتا۔ مبارک ہیں وہ آنکھیں جنہوں نے اسے ﷺ دیکھا۔ مبارک ہیں وہ کان جنہوں نے وہ پیاری آواز سنی۔ مبارک ہیں وہ دل جن کی دھڑکنوں میں وہ ﷺ آج بھی بس رہے ہیں۔ ان ﷺ سے بڑا انسان ان ﷺ سے پہلے پیدا ہوا، نہ ان ﷺ کے بعد پیدا ہوا، اور نہ کبھی ہوگا۔ وہ ﷺ نہ صرف خاتم النبیین تھے بلکہ رحمت للعالمین بھی تھے اور یہ الفاظ خود رب العالمین کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے حبیب ﷺ کا ذکر ہی بلند نہیں کیا بلکہ جس نے بھی اللہ کے حبیب ﷺ کو اپنا محبوب جانا، اس کا بھی ذکر بلند کیا۔ حبشی بلال کو ویسے بھلا کون جانتا اور مؤذنِ اسلام بلالؓ کو کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کی شہرت اگر ہوتی بھی تو صرف اپنے اپنے قبیلے، علاقے یا زمانے تک محدود رہتی لیکن یہ اس یتیم بچے ﷺ کی

مقناطیسی قوت اور کیمیا گری کا ہی اثر تھا کہ جو بھی کھنچا چلا آیا، نام پا گیا، اور جو جتنا قریب آتا گیا، اس کے نام کو اس جہاں میں اتنی ہی جِلا ملی اور دو جہاں میں اتنا ہی اونچا مقام ملا۔ خطّاب کا غصیل بیٹا ننگی تلوار سونتے قتل کرنے آتا ہے لیکن اللہ کا حبیب ﷺ اسے، اپنے اللہ سے، اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے، مانگ چکا ہے۔ تلوار نیام میں چلی جاتی ہے، جب نکلتی ہے تو اسلام کی تلوار بن جاتی ہے، آدھی دنیا پر چھا جاتی ہے اور رہتی دنیا تک یاد رہتی ہے۔ عمر بن خطّاب امیر المومنین عمر فاروق ؓ بن جاتے ہیں اور قبیلہ بنوعدی کے اس فرد کا نام صرف اسلام کی ہی نہیں بلکہ دُنیا کی تاریخ کے عظیم ترین حکمرانوں میں شامل ہوجاتا ہے۔ یہ صرف مقناطیسیت ہی نہیں، کیمیا گری ہے، عام دھات کو سونا بنانے کا عمل۔

انسان تو انسان، دشوار گزار پہاڑوں کے جن غاروں میں قیام کیا، انہیں بھی نہ صرف شہرتِ لازوال عطا ہوئی بلکہ زیارت گاہِ خاص وعام بنادیا۔ یہ پہاڑ نہ ہمالیہ کی طرح بلند تھے کہ بلندی کی بنا پر نام پاتے، نہ کوہِ مری یا ایلپس کی طرح خنک اور سرسبز کہ صحت افزا مقام بن کر انسانوں کے کام آتے۔ ان کی اگر کوئی صفت ہے تو صرف اور صرف یہ کہ ایک یتیم بچے ﷺ نے، ایک خاص وقت میں، یہ دُور افتادہ غار اپنے قیام کے لیے چُنے، اور اسی انتخاب نے کسی بے نام غار کو حرا، اور کسی بے نور غار کو ثَور کا نام دے کر رہتی دُنیا تک ان کا نام کردیا۔ لوگ تو چودہ برس بعد اپنے باپ دادا کو بھول جاتے ہیں اور یہاں چودہ سو برس گزرنے کے بعد بھی انسانوں اور غاروں کے ناموں کو شہرت ہی نہیں، کھربوں انسانوں کی عقیدت بلکہ محبت حاصل رہی ہے۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر یہ معجزہ نہیں تو پھر معجزہ کیا ہوتا ہے؟ اور ہمیں مافوق الفطرت واقعات میں معجزے تلاش کرنے کا خیال ہی کیوں آتا ہے۔

وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ کا اس سے بڑا، جیتا جاگتا اور مستند ثبوت بھلا اور کیا ہوسکتا ہے؟ یہ ذکر کل بھی بلند تھا، آج بھی بلند ہے اور انشاء اللہ کل بھی بلند رہے گا۔ یہ ذکر ازل سے بلند ہے اور ابد تک بلند رہے گا۔ یہ ذکر اس گھڑی تک بلند رہے گا جب تک اللہ کا نام بلند ہے، اور اس وقت تک موجود رہے گا جب تک اللہ موجود ہے، اور اللہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے

گا۔ اس ذکر کو بلند کرنے کے لیے بلند آواز ضروری نہیں، بلند دعوے درکار نہیں۔ جو بھی سچے دِل اور صحیح عقیدے سے ایک بار خود کو اس سے وابستہ کردے گا وہ اس کا حصہ بن جائے گا۔ یہ ذکر بلند سے بلند تر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا کیوں کہ اس کی جبلت میں بلند ہونا ہے، اور اپنے وابستگان کو بھی بلند سے بلند تر کرتا رہے گا کیوں کہ اسے بلند کرنے کا ذمہ اُس نے لیا ہے جو کائنات کی ہر شے سے بلند و برتر ہے۔

"وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ" "ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا"

اس تحریر کا آغاز ایک عاشقِ رسول ﷺ کی عشق وعقیدت سے شرابور نثری تحریر سے ہوا تھا۔ مناسب لگتا ہے کہ اس کا اختتام بھی اسی کی عشق ومستی میں ڈوبی ہوئی شعری تحریر سے ہو:

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق ومستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یاسیں، وہی طاہا

اللھم صلّ علیٰ محمد النبی الامّی و اٰلہٖ و اصحابہٖ وسلّم

❁ ❁ ❁

رسول کریم ﷺ کے آخری ایّام

رسول کریم ﷺ کے آخری ایام کے بیان کا آغاز، آپؐ کی تاریخِ وفات کے ذکر سے ہونا چاہیے۔ تاہم سیرت النبیؐ (جلد دوئم) میں، سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ''کتبِ حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخِ وفات کی مجھ کو کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی۔''[۱] یہ ایک حیرت انگیز انکشاف ہے کیوں کہ آپؐ کے وصال کے وقت اور دن، دونوں پر صحیح بخاری میں احادیث موجود ہیں۔ آپؐ کے وقتِ وصال اور تاریخِ وفات کے موضوعات پر، راقمِ حروف نے الگ الگ مضامین لکھے ہیں۔ جنھیں ان موضوعات کی تفصیلات اور تجزیے سے دلچسپی ہو، وہ یہ مضامین پڑھ لیں۔

رسول کریم ﷺ کے یومِ وصال (پیر) کا ذکر سب سے پہلے، امام مالکؒ بن انس نے اپنے مجموعہ احادیث ''مؤطا''[۲] میں کیا، جس کی تالیف دوسری ہجری میں ہوئی۔ (صحیح بخاری اور صحاح ستہ کی باقی کتب کی تالیف تیسری صدی ہجری میں ہوئی)۔ مؤطا میں ''کتاب الجنائز''[۳] میں ''**ماجاء فی دفن المیت**''[۴] کے زیرِ عنوان درج ہے کہ ''امام مالک کو پہنچا کہ رسول اللہ ﷺ نے پیر کے روز انتقال کیا۔''[۵] دیگر کتبِ احادیث میں بھی یومِ وصال کے طور پر ''پیر'' کا ذکر ہے، لیکن اس کے ساتھ، یا اس سے علیحدہ، تاریخِ وفات کا نہیں۔

رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وصال کو سب سے پہلے مشہور سیرت نگار محمد بن عمر بن واقدی ضبطِ تحریر میں لائے، جو ان کی تین جلدوں پر مشتمل کتاب ''المغازی''[۶] میں ان الفاظ

میں درج ہے:

''فتوفی رسول اللہ حین زاغت الشمس یوم الاثنین لاثنتی عشرہ خلت من ربیع الاول.'' [۷]

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے پیر کے روز بارہ ربیع الاول کو زوالِ آفتاب کے بعد وفات پائی۔''

واقدی ۱۳۰ھ میں مدینے میں پیدا ہوئے، وہیں زندگی گزاری اور ۲۰۷ھ میں انتقال کر گئے۔ امام مالکؒ ۹۳ھ میں مدینے میں پیدا ہوئے، وہیں زندگی گزاری، ۱۷۹ھ میں وفات پائی، اور جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ مدینے کے باسی ان دو ہم عصر بزرگوں کی تالیفات دوسری صدی ہجری میں لکھی گئیں۔ ایک نے یومِ وفات (پیر) لکھا، جو حدیث ہے اور جس پر کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ دوسرے نے تاریخِ وفات (۱۲/ربیع الاوّل) لکھی جو ''تاریخ'' ہے اور جس پر اختلاف ضرور ہے لیکن جن مشاہیر نے ۱۲/ربیع الاوّل (۱۱ھ) کی تاریخ سے اتفاق کیا، ان میں تیسری صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کے پانچ مشہور سیرت نگار اور علما، اور اسی طرح چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی کے پانچ سیرت نگاروں اور مورخین کے نام نیچے درج ہیں۔ آغاز قدیم سیرت نگاروں اور علما کے ناموں سے کرتے ہیں۔

نمبر شمار	نام	کتاب کا نام	ہجری سنین میں	عیسوی سنین میں	ریمارکس
۱۔	ابنِ سعد	طبقاتِ کبیر	۱۶۸ھ تا ۲۳۰ھ	۷۸۴ء تا ۸۴۵ء	یہ پانچوں نام مندرجہ ذیل کتابوں میں درج ہیں:
۲۔	بلاذری	انساب الاشراف	نامعلوم تا ۲۷۹ھ	نامعلوم تا ۸۹۲ء	(۱) اردو دائرہِ معارفِ اسلامیہ جلد ۱۹، صفحہ ۶۷، سالِ اشاعت (باردوئم) ۲۰۰۸ء
۳۔	ابنِ حزم	جوامع السیرۃ	۳۸۴ھ تا ۴۵۶ھ	۹۹۴ء تا ۱۰۶۴ء	(۲) ''سیرۃ خیر الانامؐ'' اردو دائرہِ معارفِ اسلامیہ، صفحہ ۱۶۷
۴۔	ابنِ الجوزی	الوفا	۵۱۰ھ تا ۵۹۷ھ	۱۱۱۶ء تا ۱۲۰۰ء	
۵۔	ابنِ کثیر	السیرۃ النبویۃ	۷۱۰ھ تا ۷۷۳ھ	۱۳۱۰ء تا ۱۳۷۳ء	(سالِ اشاعت: ۱۹۹۹ء)

چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی کے پانچ مشہور اور معتبر سیرت نگاروں کے نام اور دیگر کوائف یہ ہیں:

نمبر شمار	نام	کتاب کا نام	صفحہ	سالِ اشاعت	ناشر
۱۔	ابوالکلام آزاد	رسول کریمؐ اور خلفائے راشدین کے آخری لمحات	۳۸	۲۰۰۸ء	مکتبہ جمال، اردو بازار، لاہور
۲۔	محمد سلیمان سلمان منصور پوری	رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)	۲۷۷	۱۹۹۰ء	دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
۳۔	سید ابوالحسن ندوی	نبی رحمتؐ (تیسرا اڈیشن)	۵۴۵	نامعلوم	مجلسِ نشریاتِ اسلام، ناظم آباد، کراچی
۴۔	صفی الرحمٰن مبارک پوری	الرحیق المختوم	۶۳۰	۲۰۰۳ء	مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور
۵۔	مارٹن لنگز (ابوبکر سراج الدین)	Muhammad (دوسرا اڈیشن)	۳۴۰	۱۹۸۵ء	سہیل اکیڈمی، لاہور

یہ تحریر پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں رہے کہ اس میں درج شدہ واقعات اگرچہ مشہور اور مستند تاریخی کتابوں اور احادیث کے مجموعوں سے لیے گئے ہیں لیکن یہ واقعات چودہ صدی پہلے وقوع پزیر ہوئے اور ان کی روایات ڈیڑھ دو صدیوں تک صرف یادداشت کی بنیاد پر اور صرف زبان کے ذریعے ایک سے دوسرے فرد اور ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہیں۔ اس عمل میں ایک سے دوسرے فرد اور خصوصًا ایک سے دوسری نسل تک بات پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہوسکتی ہے۔ یہاں بات ایک شخص اور ایک نسل سے کہیں بڑھ کر ہے۔

رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات کا احادیث میں نہ ملنا جہاں تاریخ کا ایک معمہ ہے، وہاں آپؐ کی مختلف تاریخ ہائے وفات کا مختلف تواریخ میں اندراج انسانی حافظے اور زبان کے سہو کا مظہر ہے، جس پر کسی بدنیتی کا شمہ بھر شائبہ نہیں ہوسکتا، تاہم سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر تاریخِ وفات کے بارے میں مختلف روایات وجود میں آئیں حالاں کہ یہاں اختلافِ رائے کی گنجائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تو کیا آپؐ کے مرض الموت کے دوران، اور آپؐ کی وفات

کے فورًا بعد ہونے والے واقعات کی جو روایات مختلف راویوں نے مختلف انداز میں بیان کی ہیں، وہ سب من وعن درست ہوسکتی ہیں؟ اکیسویں صدی عیسوی کا مسلمان اس پر غور کرے۔

اس ضمن میں تین روایات خصوصی طور پر اکیسویں صدی عیسوی کے مسلمان کی توجہ کی طالب ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ آپؐ نے مرض الموت کے دوران کاغذ دوات لانے کا حکم دیا تھا تاکہ امت کو ہمیشہ کے لیے گمراہی سے بچانے کی ایک دستاویز لکھ دیں۔ دوسری روایت کا تعلق حضرت علیؓ کو ''مولا'' کہنے سے ہے، اور تیسری روایت کا تعلق ان واقعات سے ہے جو آپؐ کی وفات کے روز ہی سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوئے۔ ان تین روایات کو بنیاد بنا کر، امتِ محمدی کو دو گروہوں میں اس طرح تقسیم کر دیا گیا کہ یہ تقسیم چودہ صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ روایت کو روایت سمجھ کر اس پر تدبر کیا جائے؟

اس تحریر کا مقصد ان روایات کو دہرانا نہیں جو بارہ صدیوں سے مختلف کتابوں میں لکھی جاری رہی ہیں۔ جس طرح امام بخاریؒ نے لاکھوں احادیث میں سے تقریبًا ڈھائی ہزار احادیث کو صحیح قرار دیا، اسی طرح آج کے مسلمان کو کم از کم ان روایات پر ضرور تدبر کرنا چاہیے جنھوں نے امتِ محمدی کو تقسیم کر دیا۔ اگر احادیث اس کثیر تعداد میں ضعیف نکل سکتی ہیں تو کیا تاریخی روایات نہیں؟ خصوصًا وہ جنھوں نے امت کو تقسیم کر دیا۔ چوں کہ اس تحریر کا بڑا مقصد سچ کے متلاشی مسلمان کو تدبر پر آمادہ کرنا ہے، اس غرض سے اولاً اس تحریر میں بعض ایسے نکات نظر آئیں گے، جو اب تک لکھی ہوئی بیشتر کتابوں میں درج نہیں، اور ثانیًا روایات کو قبول یا رد کرنے کی بجائے، ان روایات پر بعض ایسے زاویوں سے نظر ڈالی گئی ہے، اور ان پر چند ایسے نئے سوالات اٹھائے گئے ہیں جو فکر و تدبر کے اس عمل میں اکیسویں صدی عیسوی کے حق کے متلاشی مسلمان کی مدد کریں گے۔

اس پسِ منظر میں رسول کریم ﷺ کے آخری ایام کے واقعات پیش ہیں۔ یہ مئی ۶۳۲ء کے آخری ہفتے اور صفر ۱۱ھ کے آخری دنوں کی ایک گھپ اندھیری رات تھی۔ آپؐ نے آدھی رات کو اپنے آزاد کردہ غلام ابومویہبہ کو بلایا اور بقیع کے قبرستان ساتھ چلنے کو کہا۔ آپؐ کے

حجرے اور گورستانِ بقیع کے درمیان کوئی تین فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ وہاں پہنچے تو کہا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ اہلِ بقیع کے لیے دعائے مغفرت کروں۔ آپؐ نے دعائے مغفرت کی اور کہا کہ آپؐ ان سے جلد ملنے والے ہیں۔

دوسری صدی ہجری میں، سب سے پہلے ابنِ اسحاق نے آپؐ کی پہلی سوانحِ حیات[۸] میں لکھا کہ دعائے مغفرت سے پہلے، آپؐ نے قبروں کے درمیان کھڑے ہوکر کہا ''اے اہلِ قبور! السلام علیکم، جس حالت میں لوگ ہیں، اس کے مقابلے میں تمہیں وہ حالت مبارک ہو جس میں تم ہو۔ فتنے سیاہ رات کے ٹکڑوں کی طرح سامنے آگئے ہیں۔ ہر دوسرا ٹکڑا پہلے ٹکڑے کے پیچھے آرہا ہے اور ہر دوسرا ٹکڑا پہلے ٹکڑے سے زیادہ پُرفتن ہے۔'' نصف صدی بعد، ابنِ ہشام نے ''سیرۃ النبیؐ''[۹] میں یہی روایت من وعن دہرائی۔[۱۰] تیسری صدی ہجری میں، طبری نے اپنی تاریخ[۱۱] میں اس روایت کو جگہ دی۔ چودھویں صدی ہجری (بیسویں صدی عیسوی) میں، مصر کے[۱۲] محمد حسین ہیکل[۱۳]، انگلستان کے مارٹن لنگز[۱۴] (ابوبکر سراج الدین) اور الرحیق المختوم کے بھارتی مصنف اور انعام یافتہ سیرت نگار صفی الرحمٰن مبارک پوری[۱۵] نے یہ روایت اپنی اپنی کتابوں میں درج کی۔

اس روایت کے سب سے پہلے، اور واحد، راوی ابومویہبہ ہیں۔ روایت کے الفاظ پڑھیں تو آپؐ سخت مایوس اور مضطرب نظر آتے ہیں۔ اس زمانے کی تاریخ پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تقریباً تمام عرب اسلام لاچکا تھا۔ قرآن پڑھیں تو آپؐ کو یہ نوید دی جاچکی تھی کہ اللہ نے آپؐ پر اپنی نعمتیں تمام کردیں۔[۱۶] اس کے بعد ابومویہبہ کی روایت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ گھر پہنچے تو سر میں شدید درد تھا۔ یہ مرض الموت کا آغاز تھا۔ مرض کی نوعیت معلوم نہیں۔ دو ہفتے بعد آپؐ کا وصال ہوگیا۔ وصال کے وقت آپؐ کی نو بیویاں زندہ تھیں۔

آپؐ نے ہر بیوی کے ساتھ ان کے حجرے میں رات گزارنے کی باری مقرر کررکھی تھی۔ یہ حجرے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔ گرمی کی حدت کے ساتھ مرض کی شدت بڑھتی گئی۔ اس کے باوجود باریوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپؐ ہر روز پوچھتے ''کل کس کی باری

ہے؟'' آپؐ کی حالت دیکھ کر اور آپؐ کی خواہش کا اندازہ لگا کر، آپؐ کی سب بیویوں نے کہا کہ آپؐ جہاں چاہیں، وہاں رہیں۔ یہ متفقہ ''اجازت'' ملنے کے بعد، جب آپؐ حضرت میمونہؓ کے حجرے سے نکل کر حضرت عائشہؓ کے حجرے کی طرف چلے تو نقاہت اتنی بڑھ چکی تھی کہ ایک طرف سے آپؐ کو آپؐ کے چچازاد بھائی علیؓ اور دوسری طرف سے دوسرے چچازاد بھائی فضل بن عباسؓ نے تھام رکھا تھا۔ آپؐ نے پاؤں گھسیٹتے ہوئے یہ مختصر فاصلہ طے کیا۔ شدتِ درد کی وجہ سے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔[۱۷]

یہ بات[۱۸] پیر کے روز کی ہے۔ آپؐ کی وفات اگلے پیر[۱۹] کو ہوئی۔ یہ پورا ہفتہ حضرت عائشہؓ کے اس حجرے میں گزرا جہاں آپؐ آج بھی آرام فرما ہیں۔ اس ہفتے کے چار روز کے جو غالباً پیر، منگل، جمعہ اور ہفتہ ہیں، واقعات کا صحیح طور سے علم نہیں۔ باقی دنوں یعنی بدھ، جمعرات، اتوار، اگلی پیر اور اگلے منگل کے واقعات، مستند احادیث اور تاریخ کی روشنی میں (جن کے حوالے تفصیل سے دیئے گئے ہیں تاکہ اکیسویں صدی عیسوی کا مسلمان انھیں خود دیکھ سکے) نچلی سطور میں درج ہیں۔

بدھ۔ وفات سے پانچ دن پہلے:

بخار اتنا بڑھ گیا کہ آپؐ بے ہوش ہوگئے۔ ہوش میں آئے تو فرمایا کہ مدینے کے سات مختلف کنوؤں سے مشکیں لبالب بھر کر لاؤ اور مجھ پر ڈالو۔[۲۰] ٹھنڈے پانی کے ذریعے بخار کم کرنے کا یہ فوری طریقہ آج بھی تبدیلی کے ساتھ رائج ہے۔ تانبے یا پتھر کا ایک ٹب، جو حضرت حفصہؓ کے پاس ہوتا تھا،[۲۱] حضرت عائشہؓ کے حجرے میں لایا گیا۔ آپؐ اس میں بیٹھے۔ آپؐ پر اتنا پانی ڈالا گیا کہ آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ اب بس کرو۔[۲۲] مرض الموت میں آپؐ نے فرمایا تھا: ''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنادیا۔'' یہ ایک تنبیہ تھی کہ میری قبر ایسی نہ بنانا کہ اس کی پرستش ہو۔[۲۳]

غسل سے فارغ ہوئے تو ظہر کی نماز کا وقت قریب تھا۔ بخار ہی کی حالت میں،

سر پر پٹی باندھ کر مسجدِ نبوی میں گئے۔ منبر پر بیٹھے اور فرمایا: ''میں نے کسی کی پیٹھ پر کوڑا مارا ہو تو میری پیٹھ حاضر ہے۔ کسی کی ہتک کی ہو تو میری آبرو حاضر ہے۔ وہ مجھ سے بدلہ لے لے۔''[۲۴] آپؐ کے اصرار پر، ایک صحابی اٹھے اور کہا کہ آپؐ کو میرے تین درہم دینے ہیں۔[۲۵] آپؐ نے حضرت فضل بن عباسؓ سے کہا کہ یہ رقم انھیں ادا کردو۔[۲۶] اس کے بعد آپؐ نے ظہر کی نماز کی امامت کی اور دوبارہ منبر پر گئے۔ کسے معلوم تھا کہ اس بار آپؐ آخری بار منبر پر بیٹھ رہے ہیں؟ اس بار آپؐ نے مہاجر صحابہ کو انصاری صحابہ سے حسنِ سلوک کی وصیت، ان الفاظ میں کی:

''لوگو! میں تمھیں انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔ وہ میرے جان وجگر ہیں۔ دوسرے لوگ تعداد میں بڑھتے جائیں گے لیکن انصار کم ہو کر ایسے رہ جائیں گے، جیسے کھانے میں نمک۔ وہ اپنا فرض ادا کر چکے لیکن ان کے حقوق باقی ہیں۔ تم میں سے جسے حکومت ملے اور اسے دوسروں کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کی طاقت ہو، اسے چاہیے کہ انصار میں جو نیکوکار ہوں، انھیں قبول کرے اور جو خطا کار ہوں ان کے قصور سے درگزر کرے۔''[۲۷]

یہ تھی آپؐ کی آخری وصیت جس کے بعد آپؐ کی زبان مبارک سے وہ الفاظ نکلے جو بتاتے ہیں کہ آپؐ کو علم ہو چکا تھا کہ ''رفیقِ اعلیٰ'' سے ملاقات کا وقت آن پہنچا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ دنیا اور اللہ کے پاس جو چیز ہے، ان میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرلے۔ اس بندے نے اسے اختیار کیا جو اللہ کے پاس ہے۔''[۲۸]

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ذی الحج ۱۰ھ (مارچ ۶۳۲ء) میں حجِ الوداع کے موقع پر قیامِ عرفات کے چند روز بعد آپؐ پر سورۃ نصر (نمبر ۱۱۰) نازل ہوئی۔ اس سے چند روز پہلے (قیامِ عرفات کے موقع پر) سورۃ مائدہ (نمبر ۵) کی تیسری آیت کا ایک حصہ[۲۹] بھی نازل ہو چکا تھا جو اگلے صفحات پر درج ہے۔ قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں، سورۃ نصر وہ آخری سورت ہے جو ایک ہی وقت آپؐ پر مکمل نازل ہوئی۔ اس کے نزول سے چند دن پہلے آپؐ نے ۹/ذی الحج

۱۰ھ (۷/مارچ ۶۳۲ء) کو عرفات میں اپنا مشہور عالم خطبہ دیا، جو کسی حج کے موقع پر آپؐ کا پہلا اور آخری خطبہ تھا۔ اس خطبے میں آپؐ کے دنیا سے جلد اٹھ جانے کے واضح اشارے موجود ہیں۔ سورۃ نصر کا رواں ترجمہ یہ ہے:

''جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

اب ہم سلسلۂ کلام مسجد نبوی میں آپؐ کے الفاظ سے جوڑتے ہیں۔ یہ الفاظ سن کر حضرت ابوبکرؓ زار وقطار رونے لگے[۳۰] اور کہا: ''ہم اپنے ماں باپ اور اولاد کے ساتھ آپؐ پر قربان جائیں۔'' بعض صحابہ کو تعجب ہوا کہ رسول کریم ﷺ تو ایک بندے کی بات کر رہے ہیں اور ابوبکرؓ اس پر رو رہے ہیں۔[۳۱] اگر یہ روایت درست ہے تو یہاں بھی ان صحابہ کے تعجب پر حیرت ہوتی ہے۔ رسول کریم ﷺ شدید بیمار ہیں اور اس شدید علالت کی حالت میں یہ کہہ چکے ہیں کہ اگر میں نے کسی کی پیٹھ پر کوڑا مارا ہو تو آج میری پیٹھ حاضر ہے اور اگر میں نے کسی کی ہتک کی ہو تو میری آبرو حاضر ہے، وہ آج بدلہ لے لے۔ یہ الفاظ اسی وقت کہے جاتے ہیں جب انسان موت کے قریب ہو۔ اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے آپؐ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ دنیا اور آخرت میں سے جسے چاہے چن لے، اور اس بندے نے اسے چنا جو اللہ کے پاس ہے۔ اس کے بعد کوئی شک باقی نہیں رہنا چاہیے تھا۔ اگر بالفرض محال کسی کو کوئی شک باقی رہ گیا تھا اور یہ فرض کرنا بہت محال ہے، تو وہ حضرت ابوبکرؓ کے مونہہ سے نکلے ہوئے بے ساختہ الفاظ سے دور ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کے بعد تعجب کرنا باعثِ حیرت ہے۔

مسجدِ نبوی میں اپنا آخری خطبہ ختم کرنے سے پہلے، جس میں آپؐ نے صرف انصار سے خصوصی حسنِ سلوک کی وصیت کی تھی، آپؐ نے صرف ایک صحابی کا نام لے کر ان کے بارے میں ''خصوصی کلمات'' کہے۔ یہ صحابی حضرت ابوبکرؓ تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر میں (اپنے رب کے علاوہ) کسی کو دوست بنا سکتا تو وہ ابوبکر ہوتے۔''[۳۲] اس حدیث کے راوی حضرت عباسؓ

کے بیٹے عبداللہؓ ہیں۔ پھر کہا (اور اس کے راوی بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں) کہ (مسجد نبوی کے صحن کے اندر کھلنے والا) ہر دروازہ بند کردیا جائے سوائے ابوبکر کے (گھر کے) دروازے کے۔[۳۳] حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں ایک اور خصوصی ارشاد اگلے روز جمعرات کو ہوا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ فرق یہ ہے کہ مؤخرالذکر ارشاد حجرے میں ہوا اور اول الذکر ارشادات آخری خطبے میں تمام صحابہ کے سامنے ہوئے۔ یہ ''خصوصی کلمات'' اکیسویں صدی کے مسلمان کو تدبر کی دعوت دیتے ہیں۔

جمعرات۔ وفات سے چار دن پہلے:

اگلے دن مرض کی شدت اچانک بڑھ گئی۔ کئی صحابی حضرت عائشہؓ کے حجرے میں جمع ہوگئے، جن میں حضرت عمرؓ کے علاوہ کسی اور کا نام نہیں لکھا گیا۔ یہاں جو مبینہ گفتگو اور کاروائی ہوئی، اس کے اکلوتے راوی بھی حضرت عباسؓ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ ہیں جو اس وقت تقریباً تیرہ برس کے تھے۔[۳۴] علاوہ ازیں علامہ شبلی نے ''الفاروق'' میں لکھا ہے کہ ''جس وقت کا یہ واقعہ ہے، اس موقع پر عبداللہ بن عباسؓ خود موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے یہ واقعہ کس سے سنا۔''[۳۵] علامہ شبلی نے مزید لکھا ہے کہ ''محدثین نے اس پر بحث کی ہے اور بہ دلائل قطعیہ ثابت کیا ہے کہ وہ موجود نہ تھے۔''[۳۶]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق، گفتگو کا آغاز رسول کریم ﷺ نے فرمایا، اور آپؐ کا فرمودہ، صحیح بخاری میں، دو جگہ، ان الفاظ میں درج ہے:

(۱) **فقال النبی ﷺ هلمو اكتب لكم كتابا لاتضلوا بعده.** — نبی ﷺ نے فرمایا لاؤ میں تمہارے لیے ایک دستاویز لکھ دوں تاکہ تم بعد میں گمراہ نہ ہو۔[۳۷]

(۲) **فقال أئتونی اكتب لكم كتابا لن تضلو بعدهٗ ابدا.** — (آپؐ نے) فرمایا لاؤ میں تمہارے لیے ایک دستاویز لکھ دوں تاکہ تم بعد میں کبھی گمراہ نہ ہو۔[۳۸]

ان دو روایات میں واحد نمایاں فرق یہ ہے کہ دوسری روایت میں لفظ ''ابدا'' استعمال

ہوا ہے جس کے معنی ''ہمیشہ'' ہیں، یعنی یہ مبینہ دستاویز وقتی نہیں تھی بلکہ ہمیشہ کے لیے گمراہی سے بچانے والی تھی۔ ان دونوں روایات میں ایک مشترکہ نمایاں، اور بدیہی، غلطی ''اکتب'' کا لفظ ہے جس کے معنی ''لکھ دوں'' ہوتے ہیں۔ آپؐ لکھنا نہیں جانتے تھے اور اگر جانتے بھی ہوتے تو اس شدید بیماری کی حالت میں کوئی مریض بستر پر لیٹے ہوئے خود دستاویز کبھی نہیں لکھتا بلکہ لکھواتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپؐ جیسا قادرالکلام عرب عربی زبان کا غلط استعمال کرے۔ جواب نفی میں ہے۔ اس صورت میں غلطی یا راوی سے ہوئی یا سلسلۂ روایت میں کسی فرد سے، یا دونوں سے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس غلطی کے علاوہ اس روایت میں کسی اور غلطی کا ہونا خارج از امکان ہے؟ اکیسویں صدی کا باشعور مسلمان یہ سوچے کہ اگر آپؐ اس وقت اپنا جانشین نامزد کرنا چاہتے تو کیا اس کے لیے آپؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے دو بول کافی نہ تھے؟ اگر یہ کہا جائے کہ زبانی حکم کی تو نافرمانی ہوسکتی تھی، تو جواب یہ ہے کہ کیا تحریری حکم کی نافرمانی نہیں ہوسکتی تھی؟ علاوہ ازیں یہ مبینہ دستاویز آپؐ کے اپنے ہاتھ کی تحریر نہ ہوتی۔ آپؐ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کسی دوسرے کے ہاتھ سے قلم بند ہوتے۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آپؐ سے منسوب یہ فقرہ جس کا عربی متن اور اردو ترجمہ اوپر درج کیا گیا ہے، یہ کہاں بتاتا ہے کہ آپؐ اپنا جانشین نامزد کرنا چاہتے تھے؟ اس میں جانشین کا ذکر تو کجا اس کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ہے۔ مبینہ دستاویز کا مقصد ایک جگہ یہ ہے کہ ''تم بعد میں گمراہ نہ ہو'' اور دوسری جگہ یہ ہے کہ ''تم بعد میں کبھی گمراہ نہ ہو'' چنانچہ توجہ کا ارتکاز اور تاویلات کی کوششیں ان الفاظ، ان کے معنی اور ان کے مقصد پر ہونا چاہیے۔ یہاں دو بنیادی سوالات اٹھتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اس مبینہ دستاویز کا مقصد گنتی کے ان چند صحابہ کو ہمیشہ کے لیے گمراہی سے بچانا تھا، جو اس وقت اتفاقی طور پر حجرے میں موجود تھے؟ یا ان تمام صحابہ کو جو مدینے میں موجود تھے؟ یا ان تمام صحابہ کو جو زندہ تھے؟ یا یہ دستاویز آپؐ کی پوری امت کے لیے تھی تاکہ وہ ''بعد میں کبھی گمراہ نہ ہو'' آپؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہونا تھا۔

حدیث کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اگر یہ دستاویز ہوتی تو ایک آفاقی نوعیت کی دستاویز ہوتی جس میں ایک ابدی ہدایت ہوتی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آفاقی نوعیت کی یہ دستاویز پہلے سے موجود نہ تھی؟ اور کیا مندرجہ بالا حدیث کا نفسِ مضمون آپؐ اس سے کہیں زیادہ واضح اور فصیح الفاظ میں، تین ماہ پہلے، ایک حجرے کی چار دیواری کی بجائے ایک وسیع وعریض میدان میں، اور چند صحابہ کی بجائے تقریباً ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ کے سامنے بیان نہیں کر چکے تھے؟ یہ لافانی الفاظ جس میں گمراہی کا بھی ذکر تھا اور اس چیز کا بھی جو گمراہی سے ''ہمیشہ'' کے لیے بچائے گی، یہ تھے:

''وقد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہ ان اعتصتم بہٖ کتاب اللہ''	اور بے شک میں تمہارے درمیان ایک وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، یہ اللہ کی کتاب ہے۔[۳۹]

یہ اس عظیم اور تاریخی خطبے کے ''اہم ترین'' الفاظ ہیں، جو آپؐ نے ۹/ذی الحج ۱۰ھ کو میدانِ عرفات میں دیا تھا۔ پھر آپؐ نے میدانِ عرفات میں موجود ایک لاکھ سے زائد صحابہ سے پوچھا تھا: ''قیامت کے دن جب تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟'' پورے مجمع نے بیک آواز کہا: ''ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ کے احکام ہم تک پہنچا دیئے۔'' یہ سن کر آپؐ نے انگشتِ شہادت اٹھا کر تین بار فرمایا: ''اے اللہ! گواہ رہنا، اے اللہ! گواہ رہنا، اے اللہ! گواہ رہنا۔''[۴۰]

یہ الفاظ تو رسول اللہ ﷺ کے تھے۔ اب دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں اللہ کیا فرماتا ہے؟ صحیح بخاری[۴۱] کے مطابق، اسی جگہ سورۃ مائدہ (سورۃ: ۵) کی تیسری آیت کا مندرجہ ذیل حصہ نازل ہوا:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا	آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا۔

اس سے قطع نظر کہ یہ آیت ۹/ذی الحج ۱۰ھ کے فوراً بعد نازل ہوئی یا اس سے بھی قبل، یہ اس وقت قرآن کا حصہ بن چکی تھی۔

اکیسویں صدی عیسوی کے مسلمان کے لیے غور کرنے والی بات یہ ہے کہ جب اللہ کا رسول ﷺ ایک لاکھ صحابہ کے سامنے یہ واشگاف اعلان کر چکا ہے کہ اس کی امت کو ابد تک گمراہی سے بچانے والی دستاویز ''اللہ کی کتاب'' ہے، اور اللہ اپنی کتاب میں ابد تک کے لیے یہ اعلان کر چکا ہے کہ میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا تو اس کے بعد گمراہی سے بچانے والی وہ کون سی دستاویز باقی رہ گئی ہے، جس کے بارے میں یہ روایت تیرہ سالہ عبداللہ بن عباسؓ سے منسوب کی گئی ہے، جس کے واحد راوی صرف وہی ہیں، اور جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مبینہ وقوعہ کے وقت موقع پر موجود نہ تھے۔ اس سوال کا جواب اکیسویں صدی عیسوی کے باشعور مسلمان پر چھوڑتے ہیں۔

اگر جواب یہ نکلے کہ رسول کریم ﷺ نے دستاویز خود لکھنے (یا لکھوانے) کی بات کی تھی، تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ روایت کا ''بقیہ ضروری'' حصہ درج کر دیا جائے، جسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) رسول کریم ﷺ کی یہ بات سن کر ''بعض'' صحابہ نے کہا کہ اس وقت آپؐ پر مرض کی شدت کا غلبہ ہے۔ ہمارے پاس قرآن موجود ہے اور وہ ہمارے لیے کافی ہے۔[۴۲] واضح رہے کہ یہاں کسی کا نام نہیں۔ بات ایک سے زیادہ صحابہ نے کی۔

(۲) (ایک سے زیادہ اصحاب کی) اس بات پر حجرے میں موجود حاضرین میں اختلافِ رائے ہو گیا۔[۴۳] باہمی تکرار اتنی بڑھی اور حجرے میں اتنا شور مچا کہ آپؐ نے فرمایا: ''یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''[۴۴]

گزشتہ صفحات میں، ہم نے سورۃ مائدہ میں اللہ کے کلام اور حجِ وداع کے موقع پر رسول کریم ﷺ کے کلام کا ذکر کیا تھا۔ اگر یہ بات حضرت عمرؓ نے کی، اور صرف انھوں نے کی، تو حضرت عمرؓ کا جواب ان دونوں کے عین مطابق تھا۔ یہ جواب حضرت عمرؓ کا نہیں بلکہ

رسول کریم ﷺ کا جواب ہونا چاہیے تھا۔ جس طرح آج کل سرکاری ترجمان اپنی حکومت کے موقف کی وضاحت کرتے ہیں، اسی طرح حضرت عمرؓ اللہ اور اللہ کے آخری رسول ﷺ کے موقف کی واضح ترین وضاحت کررہے تھے، جو چودہ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی اتنی ہی برحق ہے، جتنی اس وقت تھی۔ بہرحال ہم اس مفروضے پر بات کررہے ہیں کہ آپؐ نے واقعی وہ کہا جو اس روایت میں آپؐ سے منسوب کیا گیا ہے اور حضرت عمرؓ نے بھی واقعی وہی کہا جو ان سے منسوب کیا گیا ہے۔

اس مفروضے پر یہ خیال آتا ہے کہ اگر دستاویز لکھنے (یا لکھوانے) کی کوئی بات ہوئی ہو، تو کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ تجویز کا آغاز آپؐ کی طرف سے نہ ہوا ہو، بلکہ آپؐ کے کسی عزیز نے آپؐ کی حالت دیکھ کر آپؐ سے کہا ہو کہ ہمارے لیے کوئی وصیت چھوڑ جائیں۔ ۱۴۲۷ھ (۲۰۰۶ء) میں، ایران کے شہر قُم میں قائم شدہ ''مجمع جہانی اہل بیت'' نامی ادارے کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب ''حقائق سقیفہ در بررسی روایت ابومخنف'' کے ترجمے کے صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے کہ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے آپؐ سے پوچھا کہ: ''اگر ولایت وحکومت آپؐ کے چلے جانے کے بعد ''ہمارے'' درمیان باقی رہے گی، تو ''ہمیں'' اس کی بشارت دیجئے۔'' [۴۵] اس اقتباس کا ذکر آگے بھی آئے گا۔ [۱۴۰] یہاں ''ہمارے'' اور ''ہمیں'' کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔

مندرجہ بالا اقتباس کو ڈاکٹر حمیداللہ کی انگریزی زبان میں لکھی ہوئی ایک کتاب کے دو اقتباسات سے ملا کر پڑھا جائے۔ کتاب کا نام ہے: "The Prophet's establishing a state and His Succession"۔ اس کے ترجمے کا نام ہے: ''رسول اللہؐ کی حکمرانی وجانشینی''، صفحات ۱۷۳، ۱۷۴ سے پہلا اقتباس یہ ہے:

''میں طویل تحقیق کے بعد جس نتیجے پر پہنچا ہوں اور جس کے لیے میں نے جگہ جگہ بکھری ہوئی تفصیلات جمع کر کے ایک تصویر مکمل کی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ تھے، جو ایک خاص مقصد سے وہاں تشریف لائے لیکن ان کی بھی جرأت نہ تھی کہ حکمیہ لہجے میں آپ ﷺ سے کہتے کہ ''اپنے خاندان'' میں سے کسی کو اپنا جانشین

نامزد کر کے تحریر لکھ دیں، بلکہ انھوں نے نہایت ملائمت سے ملتجیانہ انداز میں آپ ﷺ سے کہا کہ ''اپنی وصیت تحریر کر جائیں تاکہ ہم آپ ﷺ کے بعد گمراہ نہ ہوں''..... وصیت لکھوانے پر (آپؐ کا) اصرار نہ کرنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ کاغذ لانے کے مطالبات کی شروعات رسول اللہ ﷺ نے ہرگز نہیں کی۔ ان تفصیلات کو بے نقاب کرتے ہوئے جن کی مدد سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا، مجھے تسلیم ہے کہ یہ سب کچھ حرفِ آخر تو نہیں مگر حرفِ اول ضرور ہے، جس سے مزید علم اور اس حوالے سے مزید جستجو کے نئے دروازے کھلیں گے، اور اس طرح وقت کے ساتھ ساتھ اَن گنت مزید چھپے پہلو سامنے آئیں گے۔'' [۴۶] ان الفاظ پر غور کریں: ''اَن گنت مزید چھپے پہلو۔''

جس خاص مقصد سے حضرت عباسؓ آئے تھے، اس کی نشان دہی ڈاکٹر حمیداللہ نے اسی کتاب میں آگے چل کر صفحات ۱۹۰، ۱۹۱ میں، ان الفاظ میں کی ہے، جو اس کتاب سے دوسرا اقتباس ہے:

''ہمارا تاثر یہ ہے کہ حضرت عباسؓ، رسول اللہ ﷺ کے خاندان میں خلافت لانے پر تلے ہوئے تھے اور جب حضرت عباسؓ کی ترغیب پر (حضرت) علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے سے انکار کر دیا تو وہ اکیلے ہی آپؐ کے پاس چلے گئے اور جب رسول اللہ ﷺ پر بیماری کا غلبہ کم ہوا تو حضرت عباسؓ نے کہا: آپ وصیت لکھوا دیں.....اس لیے امکان غالب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ازخود ہی یہ حکم جاری نہیں فرمایا تھا کہ ان کے پاس لکھنے کا سامان لایا جائے بلکہ یہ اپنے چچا حضرت عباسؓ کے زور دینے پر کیا تھا، جن کا آپؐ کے دل میں بڑا احترام اور مقام تھا۔ اگر یہ حکم رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آیا ہوتا تو کوئی بھی شخص اس کی تکمیل اور تعمیل میں رکاوٹ نہ بنتا۔ رسول اللہ ﷺ اپنے مکمل حواس میں تھے اور آپؐ کی قوتِ ارادی پوری طرح بیدار تھی۔'' [۴۷]

ڈاکٹر حمیداللہ کی اس تحقیق کو اگر کوئی ان کی خواہش کے مطابق آگے بڑھانا چاہے تو اس مزید تحقیق کا پہلا سوال تو یہی ہوگا کہ آیا رسول کریم ﷺ نے دستاویز لکھنے، یا لکھوانے، کی

کوئی بات کی بھی تھی؟ جو قارئین یہاں تک پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچے ہوں کہ آپؐ ایسا نہیں کہہ سکتے، ظاہر ہے کہ انھیں اس روایت کے بقیہ حصے پر غور کرنے کی ضرورت نہیں، صرف اس کا پڑھ لینا کافی ہے، بلکہ ضروری ہے۔

تاہم جو قارئین اس نتیجے پر پہنچیں کہ آپؐ نے یہ بات کی تھی، خواہ وہ کسی کے کہنے پر ہی کی ہو، وہ پہلے سورۃ حجرات (۴۹) کی آیت (۲) پر تدبر کریں: ''**لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی الخ**'' جس میں اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اپنی آوازیں نبیؐ کی آواز سے اوپر نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال اکارت جائیں اور تمھیں خبر بھی نہ ہو، اور پھر اس روایت پر درجِ ذیل پسِ منظر میں غور کریں۔

اس تحریر کا قاری خود کو چودہ صدیاں پیچھے لے جائے۔ وہ خالی الذہن ہو کر اس منظر کا تصور کرنے کی کوشش کرے جو اس روایت میں بیان کیا گیا ہے۔ مدینے میں جون کے گرم ترین مہینے کا پہلا ہفتہ ہے۔ ایک چھوٹے سے کچے حجرے کے وسط میں ایک پرانا پلنگ ہے۔ اس پر رسول کریم ﷺ لیٹے ہوئے ہیں۔ آپؐ کے چند صحابی آپؐ کے پلنگ کے گرد کھڑے ہیں۔ یہ صحابہ آپؐ کے قریب ترین رفقا ہوں گے۔ یہ وہ رفقا ہیں جو آپؐ کو اپنے ماں باپ سے زیادہ عزیز کہتے اور سمجھتے ہیں۔ چار برس پہلے، مکّے سے کوئی پندرہ میل دور حدیبیہ کے مقام پر، مشرکینِ مکہ کے ایک وفد نے اس مقام پر ان غیر معمولی افراد کی وہ غیر معمولی محبت دیکھی جو انھیں آپؐ سے تھی۔ یہ وفد مکّے واپس آیا تو آنکھوں دیکھا حال مکّے والوں کو بتایا۔ اس روایت کی ایک آدھ بات سمجھ میں نہیں آتی، مثلاً یہ کہ آپؐ کا لعابِ دہن زمین پر گرنے سے پہلے آپؐ کے صحابہ اسے اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے چہروں پر مل لیتے تھے لیکن اسے باور کرنے میں کسی کو کیا تامل ہوسکتا ہے کہ جب آپؐ بولتے تھے تو آپؐ کے یہ رفقا اپنی آوازیں نیچی کر لیتے تھے۔

یہ منتخب افراد نہ تو صحرائے عرب کے اجڈ بدو تھے اور نہ ہی عرب کے نومسلم شہری۔ یہ آپؐ کے وہ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ جاں نثار تھے جن کے دلوں میں ''ایمان داخل ہو چکا تھا۔'' سورۃ حجرات کی مندرجہ بالا آیت کے نزول سے پہلے ہی، وہ آپؐ کا انتہائی ادب کرتے ہوں

گے اور یہ حکمِ الٰہی ملنے کے بعد تو وہ حد سے زیادہ باادب اور محتاط ہو گئے ہوں گے۔ کیا ماہِ جون کے اس گرم دن یہ افراد سب کچھ یکدم، اور یکسر، بھول کر اپنے عمر بھر کے اعمال برباد کرنے پر تل جائیں گے؟ اس کا فیصلہ قاری خود کر سکتا ہے۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص وہ بات کرے جو اس روایت میں آپؐ سے منسوب کی گئی ہو، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ کی حالت سب کے سامنے تھی۔ ایسی حالت میں تو دشمن بھی غل غپاڑا نہیں کرتا۔ کیا آپؐ کے تربیت یافتہ عزیز ترین صحابہ اس حالت میں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہستی کے ساتھ دشمن سے بھی بدتر سلوک کریں گے؟ قاری خود فیصلہ کرے۔

روایتہً یہ مبیّنہ واقعہ جمعرات کو پیش آیا۔ اس کے بعد آپؐ چار روز زندہ رہے۔ کیا اس واقعے کے بعد آپؐ ایسے بے ادب اور نافرمان افراد کی شکلیں دیکھنا گوارا کرتے؟ کیا آپؐ کے اہلِ بیت، آپؐ کی بیٹی، داماد، چچا، چچیرے بھائی اور آپؐ کے دوسرے چاہنے والے، آپؐ کی وفات کے بعد ان افراد کا فرداً فرداً نام لے کر ان کی سخت ترین الفاظ میں مذمت نہ کرتے، جو آج ہم تاریخ میں پڑھ رہے ہوتے؟ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اس کا ذکر نہج البلاغہ میں ضرور ملتا۔ اس کے بارے میں حضرت فاطمہؓ سے کوئی قول نقل ہوتا۔ اس کے بارے میں امام حسنؓ اور امام حسینؓ نے کچھ بتایا ہوتا۔

تیسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ جس بات پر بات اتنی بڑھی، وہ بات تھی کیا؟ آپؐ تو دوسروں کی بھلائی کے لیے بات کر رہے تھے۔ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان اپنی بھلائی کی بات سن کر یہ غیر فطری ردِعمل دکھائے گا کہ اس طرح شور شرابا شروع کر دے۔ اکیسویں صدی کا قاری غور کرے، اور یہاں بھلائی چاہنے والا انسان کوئی عام انسان نہ تھا، وہ دنیا کا سب سے بڑا انسان تھا۔ یہ وقت بھی کوئی عام وقت نہ تھا، یہ اللہ کے آخری رسولؐ کا آخری وقت تھا۔ اور پھر یہ بحث و تکرار، اس مبینہ روایت کے مطابق اس حد تک پہنچی کہ اس محبوب اور مریض ہستیؐ نے رنج، غصے اور بے چارگی کے عالم میں کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ قاری

اس منظر کا تصور کرے اور خود فیصلہ کرے۔

اتمامِ حجت کے لیے آخری بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے خواہ وہ حضرت عمرؓ ہی کیوں نہ ہوں، واقعی ایسا کیا تو وہ شخص قابلِ مذمت ہے۔ تاہم اگر کسی شخص نے یہ روایت گھڑی ہے اور اسے تیرہ سالہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جوڑ دیا ہے، تو پھر وہ شخص قابلِ مذمت ہے۔ اس روایت کے مطابق اس وقت حجرے میں دوسرے صحابہ بھی موجود تھے، یہ بات صرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کیوں منسوب کی گئی، جو وہاں موجود نہ تھے۔ اس روایت میں جملہ حاضرین میں سے صرف حضرت عمرؓ کا نام کیوں لیا گیا؟ باقی کا نام کیوں نہیں لیا گیا؟ سوچنے والوں کے لیے یہ بھی مقامِ فکر ہے۔

سوچنے والی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس روایت کا ذکر نہ پہلی صدی ہجری[۴۸] کے (واحد) مجموعۂ احادیث میں ملتا ہے، جو بیسویں صدی عیسوی میں ہم تک پہنچا، نہ دوسری صدی ہجری کے اس مجموعۂ حدیث یعنی موطا امام مالکؒ میں، جو ہر دور میں موجود اور مشہور رہا ہے، اور ہم تک پہنچا ہے۔ موطا امام مالکؒ[۴۹] میں رسول کریم ﷺ کے آخری ایام کے فرمودات موجود ہیں لیکن اس روایت کا ذکر نہیں۔ اس روایت کا ذکر نہ دوسری صدی ہجری میں آپؐ کی زندگی اور سیرت پر تفصیل سے لکھی ہوئی دنیا کی پہلی کتاب "**المبتدا والمبعث والمغازی**" میں ملتا ہے، جو ابنِ اسحاق نے لکھی، اور نہ ہی اس صدی میں لکھی ہوئی ابن ہشام کی "**السیرۃ النبویۃ**" میں۔ اب تیسری صدی ہجری پر آتے ہیں۔

تیسری صدی ہجری میں مشہور "صحاح ستہ" کی تالیف یکے بعد دیگرے ہوئی۔ ان میں سب سے پہلے صحیح بخاری مرتب ہوئی اور وہی آج تک ان سب سے زیادہ صحیح کتابوں میں سب سے زیادہ صحیح قرار پائی۔ صحیح بخاری میں پہلی بار اس روایت[۵۰] کا ایک سے زیادہ بار ذکر آتا ہے، لیکن صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ کا نام نہیں، صحابہ کا ذکر ہے۔

پندرھویں صدی ہجری/بیسویں صدی عیسوی میں، پاکستان کے ایک شیعہ عالم اور محقق ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری نے شیعہ مذہب کے "نقطۂ آغاز" اور ابتدائی دور کے موضوع پر

۳۳۲ صفحات پر مشتمل ایک کتاب[۵۱] لکھی جو اکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ۲۰۰۰ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں نہ کہیں اس روایت کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ جب روایت ہی نہیں تو اس روایت میں بیان کردہ حضرت عمرؓ کے بارے میں کوئی ذکر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر (اور ہم اب بھی "اگر" کا لفظ استعمال کر رہے ہیں) حضرت عمرؓ کا نام ان کی کردار کُشی کی غرض سے لیا گیا ہے، تو یہ نہ صرف حضرت عمرؓ پر ظلم ہے بلکہ اس سے زیادہ تاریخ پر ظلم ہے۔ تاریخ کا مقصد حقائق کو من وعن بیان کرنا ہوتا ہے۔ جب حقیقت کی بجائے کچھ اور بیان کیا جائے، تو وہ تاریخ نہیں ہوتی..... کچھ اور ہوگی۔

یہاں ہر انسان کے دماغ میں یہ سوال ابھرے گا کہ آخر حضرت عمرؓ کی کردار کُشی کی وجہ، یا غرض، کیا ہوسکتی ہے؟ آخر اس مبینہ روایت کا تانا بانا بن کر اس کی تان حضرت عمرؓ پر کیوں توڑی گئی؟ جواب یہ ہے کہ تاویل کرنے والوں نے تاویل یہ کی کہ مبینہ روایت میں بیان کردہ دستاویز کو لکھنے (یا لکھوانے) کا مقصد یہ تھا کہ رسول کریم ﷺ اس دستاویز میں حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کرنا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس کا اندازہ لگا لیا اور یہ دستاویز تحریر نہ ہونے دی۔ اس تاویل کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو قُم (ایران) سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہونے والی محولہ بالا کتاب "سقیفہ کے حقائق" کے صفحہ ۸۱ پر نظر ڈالی جائے، جس سے ایک مختصر اقتباس پیش ہے:

> "حضرت عمر اور ان کے ہم فکر افراد کا پیغمبر اسلامؐ کو نوشتہ لکھنے سے روکنا بھی خود حضرت علیؓ کو راستے سے ہٹا کر حکومت حاصل کرنے کی کوششوں کا ایک حصہ ہے اور اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت عمر نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ، حضرت علیؓ کی خلافت کے سلسلے میں کچھ "لکھنا" چاہتے ہیں لہٰذا انھوں نے بھرپور کوشش کی کہ یہ نوشتہ نہ لکھا جائے چاہے اس سلسلے میں پیغمبرؐ پر ہذیان ہی کی تہمت لگانی پڑے۔"[۵۲]

اکیسویں صدی عیسوی کا ہر باشعور مسلمان خود فیصلہ کرے کہ کیا رسول کریم ﷺ کا کوئی تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ صحابی آپؐ پر "تہمت" لگانے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہے؟

اور حضرت عمرؓ تو وہ صحابی ہیں جن کے بارے میں رسول کریم ﷺ کی یہ حدیث صحیح بخاری میں درج ہے: (یہ الگ بات ہے کہ قُم کے مندرجہ بالا اقتباس میں حضرت عمرؓ کے نام کے اوپر ''رضی اللہ عنہ'' نہیں لکھا گیا)۔

لقد کان فیما قبلکم من الامم محدّثون فان یک فی امتی احد فانہٗ عمر.

تم سے پہلی امتوں میں محدّث ہوا کرتے تھے، میری امت میں کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمرؓ ہے۔[۵۳]

محدّث سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کی زبان پر اللہ کے حکم سے فیصلۂ خداوندی جاری ہوجاتا ہے۔ غور کریں ''محدّث'' کے مقام پر! جس عمرؓ کے لیے اللہ کا آخری رسول ﷺ یہ کہہ دے کہ اس کی زبان پر اللہ کے حکم سے فیصلۂ خداوندی جاری ہوجاتا ہے، کیا وہ عمرؓ وہ فیصلۂ خداوندی آپؐ پر تہمت باندھ کر سنائے گا؟ اور وہ تہمت لگانے کی وجہ بھی یہ ہوگی کہ اس ''محدّث'' نے قُم (ایران) سے شائع کردہ کتاب کے الفاظ میں ''اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ، حضرت علیؓ کی خلافت کے سلسلے میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔''[۵۴] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر لگائے ہوئے الزام پر قاری غور کرے۔

حضرت عمرؓ پر لگائے ہوئے اس الزام پر (یہاں بھی ہم لفظ ''الزام'' استعمال کررہے ہیں، لفظ ''تہمت'' نہیں) برہم ہونے کی بجائے، اس پر ٹھنڈے دل و دماغ اور ہر پہلو سے غور کرکے دیکھنا چاہیے کہ کیا ''کسی بھی پہلو'' سے اس کے صحیح ہونے کے امکانات ہوسکتے ہیں، اور یہ بات ہم اس کے باوجود کہہ رہے ہیں کہ اگر آپؐ نے یہ بات کہی بھی ہوتی، تب بھی اس میں صرف گمراہی سے بچنے کا ذکر ہے، خلیفہ کی نامزدگی کا نہیں اور اگر اختلافِ رائے ہوا، تو وہ بھی ایک نہیں، ایک سے زائد صحابہ کی طرف سے ہوا۔

اس ضمن میں پانچ نکات خصوصی طور پر قابلِ غور ہیں:

(۱) پہلا نکتہ یہ ہے کہ ان تاویل کرنے والوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ رسول کریم ﷺ، حضرت علیؓ ''کی خلافت کے سلسلے میں کچھ لکھنا چاہتے'' تھے؟

(۲) دوسرا نکتہ یہ ہے کہ صحیح مسلم[۵۵] کی کتاب ''فضائل الصحابہ'' اور صحیح بخاری[۵۶] کی ''کتاب المرضیٰ'' دونوں میں یہ حدیث ہے کہ اپنے آخری ایام میں، آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے لیے وصیت کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر حمیداللہ کے مطابق مُسند ابنِ حنبلؒ اور انسابِ بلاذری میں بھی یہ حدیث درج ہے۔[۵۷] تفصیل کے لیے ڈاکٹر حمیداللہ کی انگریزی کتاب کے اردو ترجمے ''رسول اللہؐ کی حکمرانی و جانشینی'' کا صفحہ ۱۹۲ دیکھا جاسکتا ہے، جس سے ایک اقتباس، جس میں محولہ بالا احادیث کا رواں اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے، نیچے درج ہے:

''بخاری، مسلم اور کئی دوسرے راوی ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں: ''......اپنی آخری بیماری کے ایام میں ایک روز رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''اپنے باپ اور بھائی کو میرے پاس بھجواؤ تاکہ میں ایک وصیت ''لکھوا'' دوں کیوں کہ مجھے خدشہ ہے کہ کوئی خواہش کا اظہار کردے گا یا کہے گا میں اس سے بہتر ہوں۔'' پھر تھوڑا سا توقف کرکے آپؐ نے فرمایا: ''نہیں رہنے دو، نہ ہی اللہ تعالیٰ اور نہ ہی مسلمان ابوبکر کے سوا کسی اور کو قبول کریں گے۔''[۵۸]

اگر مندرجہ بالا حدیث کا مقابلہ ''دستاویز لکھوانے'' یا ''لکھنے'' (ذکر لکھنے کا ہے، لکھوانے کا نہیں) والی حدیث سے کیا جائے، تو تین نکات نمایاں طور پر ابھرتے ہیں:

(۱) ''دستاویز'' والی مبینہ حدیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منسوب ہے، جو اس وقت تیرہ سال کے تھے، جب کہ مندرجہ بالا حدیث کی راوی حضرت عائشہؓ ہیں، جنھیں اس وقت رسول کریم ﷺ کی زوجیت میں آئے ہوئے آٹھ برس ہوچکے تھے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ اپنی روایت میں بیان کردہ واقعات کے چشم دید گواہ نہیں جب کہ مندرجہ بالا حدیث میں حضرت عائشہؓ نے جو کہا، وہ رسول کریم ﷺ سے براہِ راست سنا۔

(۳) دستاویز والی حدیث میں وصیت لکھوانے کا ذکر نہیں بلکہ گمراہی سے بچانے کا ذکر ہے جب کہ مندرجہ بالا حدیث میں واضح طور پر نہ صرف وصیت ''لکھوانے'' کا ذکر ہے، بلکہ یہ حدیث رسول کریم ﷺ کے ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ''نہ ہی اللہ تعالیٰ اور نہ ہی مسلمان ابوبکر

کے سوا کسی اور کو قبول کریں گے۔''

حدیث کے ان الفاظ کی روشنی میں، ہم صرف یہ تبصرہ کریں گے کہ اگر رسول کریم ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے حق میں وصیت لکھوانا چاہتے، تو آپؐ توقف نہ کرتے بلکہ وصیت لکھوا کر رہتے لیکن آپؐ یہ فیصلہ اپنی امت پر چھوڑنا چاہتے تھے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مطابق، دستاویز والا یہ مبینہ واقعہ جمعرات [۵۹] کے روز ہوا۔ اس سے ایک دن پہلے، بدھ کے روز، آپؐ نے مسجدِ نبوی میں اپنی زندگی کا آخری خطبہ دیا۔ اس خطبے میں آپؐ نے جس واحد صحابی کا نام لے کر اس کی تعریف کی تھی، وہ حضرت ابوبکرؓ تھے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ اگر میں اپنے رب کے علاوہ کسی کو دوست بناتا، تو وہ ابوبکرؓ ہوتے۔ آپؐ نے حکم دیا تھا کہ ابوبکرؓ کے گھر کے دروازے کے علاوہ، مسجدِ نبوی کے صحن کے اندر کھلنے والا ہر دروازہ بند کر دیا جائے۔ یہ تو ایک دن پہلے کی بات ہوئی۔

جمعرات کی رات (جس میں دن کے وقت مبینہ دستاویز کے واقعے کا وقوع پذیر ہونا بیان کیا گیا ہے) آپؐ نے مسجدِ نبوی میں نمازِ عشا کی امامت کے لیے بااصرار، حضرت ابوبکرؓ کو نامزد کیا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی حضرت عائشہؓ نے [۶۰] نے بھی بااصرار اختلاف کیا اور امامت کے لیے حضرت عمرؓ کا نام بھی تجویز کیا، جس کی تائید، حضرت عائشہؓ کے ایما پر، حضرت حفصہؓ نے بھی کی، [۶۱] تو آپؐ نے خفگی کا اظہار کیا [۶۲] اور سختی سے کہا کہ نماز کی امامت ابوبکرؓ ہی کریں گے۔ [۶۳] اس کی تفصیلات اگلے صفحات میں ہیں۔

اگر دستاویز کی تاویل کرنے والوں کے مطابق، جمعرات کو دن کے وقت، آپؐ کے ذہن میں یہ بات ہوتی جس کے لیے قُم (ایران) سے شائع ہونے والی کتاب ''سقیفہ کے حقائق'' میں یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں (ص:۸۱) کہ ''اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ''حضرت عمر'' نے اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ پیغمبر اسلام حضرت علیؑ کی خلافت کے سلسلے میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں''، تو جمعرات ہی کو، رات کے وقت، آپؐ حضرت ابوبکرؓ کی امامت پر اتنا اصرار کیوں کرتے؟ حضرت علیؑ ساتھ والے حجرے میں تھے۔ آپؐ حضرت فاطمہؓ کو کہہ

دیتے کہ میری پیاری بیٹی! علیؑ سے کہو کہ مسجد میں جائیں اور عشا کی نماز کی امامت کریں۔ امامت کے حکم کی جو تاویل آج حضرت ابوبکرؓ کے لیے کی جارہی ہے، وہ آج حضرت علیؑ کے لیے کی جاتی۔ اگر اس امامت کے باوجود انھیں خلافت نہ ملتی تو اعتراض بجا ہوتا۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی زندگی کا آخری خطبہ، اپنے وصال سے پانچ روز پہلے، بدھ کو نمازِ ظہر کے وقت دیا۔ یہ ایک طویل خطبہ تھا جو آپؐ نے نماز سے پہلے، اور بعد، دو اقساط میں، منبر پر بیٹھ کر دیا۔ اگر آپؐ تمام صحابہ کے سامنے مسجدِ نبوی میں کوئی وصیت کرنا چاہتے، تو یہ اس کا آخری موقع تھا۔ آپؐ نے اپنے آخری خطبہ میں صرف ایک وصیت کی۔ وہ وصیت انصار کے بارے میں تھی، [۶۴] نہ حضرت ابوبکرؓ کے لیے اور نہ حضرت علیؑ کے لیے۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ آپؐ کے آخری ایام میں، آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے حضرت علیؑ کو اس پر آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ آپؐ سے معلوم کرلیں کہ آپؐ کا خلیفہ کون ہوگا؟ حضرت علیؑ نے یہ کہہ کر پوچھنے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ اگر آپؐ نے حضرت علیؑ کے حق میں وصیت نہ کی تو بعد میں لوگ انھیں ہمیشہ کے لیے خلافت سے محروم کر دیں گے۔ [۶۵] اکیسویں صدی عیسوی کا قاری اس پر غور کرے۔

پانچواں اور آخری نکتہ یہ ہے آپؐ کے مرض الموت میں آپؐ کی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ آپؐ کے پاس رہیں۔ یہ قربت جسمانی نہیں بلکہ روحانی بھی تھی۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ فاطمہؓ میرے بدن کا ٹکڑا ہے۔ [۶۶] مرض الموت کے دوران، آپؐ نے دوبار حضرت فاطمہؓ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ پہلی بار وہ رو پڑیں اور دوسری بار مسکرائیں۔ [۶۷] اگر آپؐ حضرت فاطمہؓ کے شوہر حضرت علیؑ کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تو دنیا میں کس کی مجال تھی کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کو اپنی بیٹیؓ سے یہ بات علی الاعلان کرنے سے روک سکتا؟

اگر حضرت فاطمہؓ اپنے عظیم باپؐ سے اپنے عظیم شوہرؓ کے لیے یہ وصیت سنتیں، تو کیا یہ ممکن تھا کہ آپؐ کے وصال کے بعد محمد ﷺ کی بہادر بیٹیؓ اپنے بہادر شوہرؓ کے حق میں اپنے عظیم باپؐ کی وصیت کا مرتے دم تک اظہار نہ کرتی؟ اس بارے میں کسی کو رتی بھر شبہ نہیں ہونا چاہیے

کہ وصیت خواہ حضرت علیؓ کے حق میں ہوتی یا حضرت علیؓ کے خلاف، حضرت فاطمہؓ اسے کبھی نہ چھپاتیں۔ جو شخص یہ کہے وہ ایک طرف توہینِ رسالتؐ اور دوسری طرف اہانتِ علیؓ و فاطمہؓ کا مرتکب ہوگا۔ توہینِ رسالتؐ کی سزا دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں تو ہے ہی۔

آپؐ کو حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کے دونوں بیٹوں حسنؓ اور حسینؓ سے جو بے پناہ محبت تھی، وہ آپؐ کے مستند اقوال سے واضح ہے۔ حسنینؓ کے بارے میں، آپؐ نے کہا تھا کہ یہ دونوں دنیا میں میرے دو خوشبودار پھول (نازبو) ہیں۔[۶۸] حضرت فاطمہؓ کے لیے کہا تھا کہ فاطمہؓ میرے بدن کا ٹکڑا ہے۔[۶۶] حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ "**انت منی وانامنک**" یعنی "تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔"[۶۹] اظہارِ محبت کے لیے ان سے بہتر الفاظ کیا ہو سکتے ہیں؟

حضرت علیؓ کے بارے میں، اس مستند، فصیح اور محبت بھرے بول کے علاوہ، ان ہی کے بارے میں آپؐ کا ایک اور قول بھی، تیسری صدی ہجری کے بعد مختلف کتابوں میں نقل ہو رہا ہے۔ وہ قول ہے: "**من کنت مولاہُ فعلیٌ مولاہُ**" یعنی "جس کا میں مولا ہوں، علیؓ بھی اس کے مولا ہیں۔"

اس قول میں بھی محبت اور فصاحت کا، اختصار کے ساتھ وہی امتزاج ہے جو "**انت منی و انامنک**" میں ہے۔ فرق یہ ہے کہ مؤخر الذکر قول کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور اس میں اپنائیت کا اظہار بھی کہیں زیادہ جھلکتا اور چھلکتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپؐ کا کوئی قول خواہ اس کے مستند ہونے کے بارے میں کوئی شبہ ہو یا نہ ہو، امتِ محمدی میں فرق، یا فرقے، پیدا کرنے کے لیے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح آپؐ کے کسی قول کی کوئی تاویل جو آپؐ کی امت کو تقسیم کر دے، نہ رضائے الٰہی ہو سکتی ہے، نہ مرادِ رسولؐ۔ آپؐ کی ذات اور حیات تو بکھرے ہوئے انسانوں کو ایک اللہ کے ایک پرچم تلے متحد کرنے کے لیے وقف تھی، نہ کہ اپنی پہلے سے متحد امت کو تقسیم کرنے کے لیے۔ اگر کوئی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا تو وہ آگے نہ پڑھے کیوں کہ پھر اس کا کسی بات سے متفق ہونا ممکن نہیں۔

"**من کنت مولاہُ فعلیٌ مولاہُ**" میں لفظ "**مولا**" کی وہ تاویل کی گئی، جو اس لفظ کے قرآنی معانی کے مطابق نہیں، اور جس نے امتِ محمدی کو مستقل بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے نے جو ہمیشہ امت کی بھاری اکثریت رہا ہے، اس تاویل کو مضبوط دلائل اور وجوہات کی بنیاد پر کبھی قبول نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ وہ دلائل اور وجوہات کیا ہیں؟ کیا وہ واقعی مضبوط ہیں؟ اکیسویں صدی عیسوی کا تقاضا ہے کہ اس معاملے پر ٹھنڈے دل اور کھلے دماغ سے تدبر کیا جائے۔ مقصد صرف سچ کی تلاش ہونا چاہئے اور یہ مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب سوچنے کا انداز معروضی اور سمجھنے کا انداز غیر جانب دارانہ ہو۔

سب سے پہلے مستند احادیث اور مستند تاریخ کو سامنے رکھ کر یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس قول کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ آغاز پہلی صدی ہجری سے کرتے ہیں کیوں کہ اس سے پہلے آغاز ممکن نہیں۔

۱۔ پہلی صدی ہجری:

دنیا کا قدیم ترین مجموعۂ احادیث کا جو نسخہ آج ہمارے پاس ہے، وہ بیسویں صدی عیسوی میں ڈاکٹر حمید اللہ کے ہاتھوں بازیاب ہوا۔ یہ نسخہ ہمامؒ بن منبہ سے منسوب ہے،[۷۰] جو روایتاً ۱۰۱ھ (۷۱۹ء) میں وفات پا گئے۔ یہ نسخہ پہلی صدی ہجری کا پہلا مجموعۂ حدیث ہے، جو ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے بعد ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں کل ۱۳۸ حدیثیں ہیں، جو حضرت ابو ہریرہؓ کے کانوں نے براہِ راست رسول کریم ﷺ کی زبان سے سنیں، اور حضرت ابو ہریرہؓ سے براہِ راست حضرت ہمامؒ بن منبہ تک پہنچیں۔ درمیان میں کوئی راوی نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا سالِ وصال ۵۸ھ (۶۷۸ء) بتایا جاتا ہے۔ اس مجموعۂ احادیث میں "**من کنت مولاہُ فعلیٌ مولاہُ**" والی حدیث نہیں، اور نہ ہی اس کے پسِ منظر کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔ ہم نے "پسِ منظر" کا ذکر کیوں کیا؟ یہ اگلے صفحات میں واضح ہو جائے گا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ صحیفہ ہمامؒ بن منبہ میں، حضرت ابو ہریرہؓ کی سینکڑوں احادیث میں سے منتخب کردہ

احادیث تھیں۔ یہ انتخاب کلیتہً حضرت ابو ہریرہؓ کا تھا۔ اگر کوئی حدیث اس میں موجود نہیں تو یہ کوئی حجت نہیں۔ اس کے علاوہ پہلی صدی ہجری میں متعدد مجموعہ احادیث تھے جواب موجود نہیں ہیں۔

۲۔ دوسری صدی ہجری:

اب دیکھتے ہیں کہ دوسری صدی ہجری کی چار مشہور ترین کتابوں میں اس قول کے بارے میں کیا درج ہے، پہلی کتاب مجموعۂ حدیث ہے اور بقیہ تین کتابیں تاریخی تصنیفات ہیں:

(۱) موطا: [۷۱]

اس مجموعۂ حدیث کے مرتب امام مالکؒ ہیں، جن کی پوری زندگی مدینے میں گزری۔ ان کا دورِ حیات ۹۳ھ تا ۱۷۹ھ (۷۱۱ء تا ۷۹۵ء) ہے۔ موطا کا زمانۂ تالیف ۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ (۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) بتایا جاتا ہے۔ موطا میں صرف فقہ اور احادیث نہیں بلکہ یہ کسی حد تک اس دور کی تاریخ کا ماخذ بھی ہے اور اس کا عربی متن اور اردو انگریزی تراجم آسانی سے دستیاب ہیں۔ موطا میں نہ "من کنت مولاہُ فعلیٌ مولاہُ" والی حدیث درج ہے اور نہ ہی اس کے پسِ منظر کے بارے میں کوئی روایت ہے۔

(۲) کتاب المبتدا والمبعث والمغازی:

یہ رسول کریم ﷺ کی پہلی مفصل سوانحِ حیات ہے۔ اس کے مصنف محمد بن اسحاق ہیں، جن کا نام محمد تھا لیکن وہ مشہور ہوئے ابنِ اسحاق کے نام سے۔ ان کا دورِ حیات ۸۵ھ تا ۱۵۱ھ (۷۰۴ء تا ۷۸۶ء) ہے۔ وہ مدینے میں پیدا ہوئے اور ۱۱۵ھ تک تقریباً تیس سال یہیں رہے۔ اس دوران میں وہ بہت محنت اور محبت سے رسول کریم ﷺ کے غزوات اور سیرت کے بارے میں، ہر ممکنہ ماخذ سے، مواد جمع کرتے رہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ یہ ضخیم کتاب

انھوں نے مدینہ چھوڑنے سے پہلے، تیس سال کی عمر میں مکمل کر لی تھی لیکن ایسا ہونا مشکل نظر آتا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کا ابتدائی مسودّہ یا اس مسودّے کا ایک بڑا حصہ مدینہ چھوڑنے سے پہلے لکھ لیا ہو۔

۱۱۵ھ میں وہ تیس سال کی عمر میں سکندریہ (مصر) آئے اور اگلے بیس سال مصر کے علاوہ، ایران کے شہر رَے اور عراق کے تین شہروں بغداد، کوفہ اور بصرہ میں گزارے، جہاں انھوں نے مختلف اوقات میں، مختلف شاگردوں کو، جن کی تعداد کم از کم چودہ تھی، اپنی کتاب کا املا کرایا۔ ان شاگردوں میں زیاد بن عبداللہ بکائی کو سب سے ممتاز مقام حاصل ہے۔ ایک قول کے مطابق ''سیرتِ نبویؐ سے بکائی کے عشق اور شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اس کے حصول کے لیے اپنا گھر بار فروخت کر کے ابنِ اسحٰق کے ساتھ ہو لیے اور ان کے ہمراہ گھومتے رہے تا آنکہ ان سے مغازی کی سماعت (مکمل) کر لی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی (سماع کردہ) روایت کو زیادہ سے زیادہ مستند بنانے کے لیے (ابنِ اسحاق سے) دوبارہ اس کی سماعت کی۔ اسی وجہ سے ان (بکائی) کی روایت کو سیرتِ ابنِ اسحٰق کی دوسری روایتوں پر فوقیت حاصل ہے۔''

دوسری صدی ہجری کے وسط میں لکھی ہوئی ابنِ اسحٰق کی کتاب آٹھویں صدی ہجری تک موجود تھی۔ اس دوران میں اس کی کئی شرحیں تیار ہوئیں، خلاصے مرتب ہوئے، حتیٰ کہ اسے منظوم بھی کیا گیا۔ پھر یہ کتاب نظروں سے ایسی اوجھل ہوتی چلی گئی (جس کی وجہ آگے درج کی گئی ہے) کہ آج اس کا کوئی مستند اور مکمل نسخہ موجود نہیں ہے۔

اس کتاب کے نامکمل عربی متن کا ایک حصہ، جو زیاد بکائی کی روایت پر نہیں بلکہ ابنِ اسحٰق کے دو اور شاگردوں کی روایت پر مشتمل ہے، اور عربی زبان میں شائع ہوا ہے، وہ رسول کریم ﷺ کی زندگی کے آخری ایام تک نہیں پہنچتا۔ تاہم ۱۹۵۵ء میں اکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن نے ایک ضخیم کتاب شائع کی، جس کا نام تھا:

"The Life of Muhammad" [۷۲]

"A Translation of Ishaq's SIRAT RASUL ALLAH"

یہ ترجمہ ابنِ اسحاق کی بجائے (جنھوں نے سیرۃ رسول اللہؐ کے نام سے کوئی کتاب نہیں لکھی)، درحقیقت ابنِ ہشام کی "**السیرۃ النبویہؐ**" کا انگریزی ترجمہ ہے، جس پر اگلی سطور میں بات ہوگی۔ بہرحال ابنِ اسحٰق کی کتاب کا جو حصہ شائع ہوگیا ہے، اس میں "**من کنت مولاہُ فعلیٌ مولاہُ**" کا نہ تو ذکر ہے، اور نہ ہی بوجوہ ہوسکتا تھا کیوں کہ وہ آپؐ کی زندگی کے آخری ایام تک نہیں پہنچتا۔

(۳) السیرۃ النبویہؐ:

اس کے مؤلف ابنِ ہشام ہیں جن کا سنہِ پیدائش نامعلوم اور سالِ وصال ۲۱۳ھ بتایا جاتا ہے۔ یہ کتاب ابنِ اسحٰق کی کتاب کے تقریباً نصف صدی بعد شائع ہوئی۔ **السیرۃ النبویہؐ** کے متن کا زیادہ تر انحصار ابنِ اسحٰق کی کتاب کے اس متن پر ہے، جس کی روایت زیاد بکائی نے ابنِ اسحٰق سے دو مرتبہ املا لے کر کی تھی اور جس کی وجہ سے بکائی کی روایت کو سیرتِ ابنِ اسحٰق کی دوسری روایتوں پر فوقیت حاصل ہے۔

ابنِ ہشام نے ابنِ اسحٰق کی کتاب کو بہت محنت سے ایڈٹ کیا اور درجِ ذیل وجوہات کی بنا پر کئی روایات کو خارج کر دیا:

(ا) ان کا رسول کریم ﷺ کی حیات اور سیرت سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔

(ب) ان سے کسی مسئلے کی تشریح نہیں ہوتی تھی۔

(ج) ان کا ذکر لوگوں کی دل آزاری کا سبب بن سکتا تھا۔

(د) ایسے اشعار جو یا تو غیر مستند تھے، یا ہجو اور فحش کلامی پر مبنی تھے۔

اس ایڈیٹنگ اور تلخیص کے بعد، ابنِ ہشام نے ابنِ اسحٰق کے متن کے کئی حصوں پر حواشی اور تعلیقات لکھیں۔ ابنِ اسحٰق کی کتاب کے منظر سے غائب ہونے کی وجہ یہی تھی کہ اب لوگوں کو اس کتاب کا ایک ایڈٹ کیا ہوا، تلخیص شدہ اور اضافہ شدہ اڈیشن دستیاب تھا۔ The Life of Muhammad کے انگریز مترجم نے ابنِ ہشام کی "سیرتِ نبویؐ" کو ابنِ اسحاق

کی "سیرتِ رسول اللہؐ" بنانے کے لیے یہ اہتمام کیا کہ "**السیرۃ النبویہؐ**" میں درج شدہ وہ فقرے جن کا اضافہ ابنِ ہشام نے، ادبی دیانت کا ثبوت دیتے ہوئے، اپنا نام لکھ کر کیا تھا، "**السیرۃ النبویہؐ**" کے متن سے الگ کر کے، اپنے ترجمے کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کر دیئے، جس کے سرِ آغاز لکھ دیا کہ یہ ابنِ ہشام کے کیے ہوئے اضافے ہیں۔ ان کی تعداد/ ۹۲۲ ہے۔ اس کے بعد "**السیرۃ النبویہؐ**" کے متن کا جو حصہ باقی بچا، اسے انگریزی ترجمے میں ابنِ اسحاق کی "سیرتِ رسول اللہؐ" کا نام دیا گیا کیوں کہ اس بقیہ متن کا انحصار اس املا پر تھا، جو زیاد بکائی نے دوبار ابنِ اسحٰق سے لیا تھا، اور یہ "حصہ" ابنِ ہشام نہیں، ابنِ اسحاق کی تخلیق ہے۔

انگریزی ترجمے کے تعارف میں، مترجم نے لکھا ہے کہ اس نے اپنے ترجمے کے لیے جس عربی متن پر انحصار کیا، وہ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۷ء میں قاہرہ سے شائع ہونے والا وہ اڈیشن ہے، جو مصطفٰے السّقا، ابراہیم البیاری اور عبدالحفیظ شامی نے چار جلدوں میں مرتب کیا تھا۔ یہی اڈیشن، ایک جلد میں، ۲۰۰۹ء میں، بیروت سے شائع ہوا۔ اس میں بھی "**من کنت مولاہُ فعلیٌ مولاہُ**" کا ذکر نہیں۔ صرف اس جزوی تاریخی پسِ منظر کو دہرایا گیا ہے، جس کا ذکر اس کے انگریزی [۷۲] اور اردو [۷۳] تراجم کے متون میں آگے درج ہے۔

اس صدی کی چوتھی مشہور تصنیف (اور تیسری مشہور تاریخ) "مغازی" [۷۴] ہے، جس کے مصنف ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی ہیں۔ وہ ۱۳۰ھ/ ۷۴۷ء میں مدینے میں پیدا ہوئے اور ۲۰۷ھ/ ۸۲۲ء میں وفات پائی۔ اس طرح وہ ابنِ ہشام کے ہم عصر میں، جن کا سالِ وفات ۲۱۳ھ/ ۸۲۸ء ہے۔ ابنِ ہشام نے "**السیرۃ النبویہؐ**" میں رسول کریمؐ کی تاریخِ وفات کی کمی دور نہیں کی تھی۔ واقدی نے "مغازی" میں اس کمی کو دور کیا اور اس طرح وہ پہلے مورخ بنے جنھوں نے آپؐ کی تاریخِ وفات لکھی۔ اسی طرح اگر ابنِ ہشام سے "**من کنت مولاہُ فعلیٌ مولاہُ**" کی مشہور و معروف تاریخی روایت لکھنے میں بھول چوک ہوگئی تھی، تو واقدی اس کمی کو "مغازی" میں دور کر سکتے تھے۔ تاہم مغازی میں بھی اس قول کا ذکر نہیں، اگرچہ اس کے تاریخی پسِ منظر کا ذکر ابنِ ہشام سے کہیں زیادہ تفصیل میں ہے، جو آگے درج ہے۔ [۸۹]

۳۔ تیسری صدی ہجری:

اب ہم تیسری صدی ہجری پر آتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ کی وفات ہوئے دو صدیاں بیت چکی ہیں۔ یہ بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ اس صدی میں مندرجہ ذیل نومشہور نام ہمارے سامنے آتے ہیں:

نمبر شمار	نام	جائے پیدائش	سنہ پیدائش اور سالِ وفات
۱۔	محمد بن سعد	بصرہ (عراق)	۱۶۸ھ تا ۲۳۰ھ بمطابق ۷۸۴ء تا ۸۴۵ء
۲۔	امام محمد بن احمد حنبلؒ	بغداد (عراق)	۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ بمطابق ۷۸۰ء تا ۸۵۵ء
۳۔	امام بخاریؒ	بخارا (ازبکستان)	۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ بمطابق ۸۱۰ء تا ۸۷۰ء
۴۔	امام مسلمؒ	نیشاپور (ایران)	۲۰۴ھ تا ۲۶۱ھ بمطابق ۸۲۰ء تا ۸۷۵ء
۵۔	امام ابوداؤدؒ	سجستان (افغانستان)	۲۰۲ھ تا ۲۷۵ھ بمطابق ۸۱۷ء تا ۸۸۹ء
۶۔	امام ترمذیؒ	ترمذ (ازبکستان)	۲۰۹ھ تا ۲۷۹ھ بمطابق ۸۲۴ء تا ۸۹۲ء
۷۔	امام نسائیؒ	نسا (ترکمانستان)	۲۱۵ھ تا ۳۰۳ھ بمطابق ۸۳۰ء تا ۹۱۵ء
۸۔	امام ابن ماجہؒ	قزوین (ایران)	۲۰۹ھ تا ۲۷۳ھ بمطابق ۸۲۴ء تا ۸۸۷ء
۹۔	امام طبری	آمل (صوبہ مازندران) ایران	۲۲۵ھ تا ۳۱۰ھ بمطابق ۸۳۹ء تا ۹۲۳ء

ذکر کا آغاز محمد بن سعد سے ہوتا ہے، جو ابنِ سعد کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی مشہور تاریخ ''طبقاتِ کبیر'' ہے، جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور آج بھی موجود ہے۔ اس ضخیم اور مشہورِ زمانہ تاریخ میں نہ تو ''من کنت مولاہُ فعلیٌ مولاہُ'' کا قول درج ہے، اور نہ ہی اس واقعے کے بارے میں وہ تفصیل جو مثلاً ابنِ اسحاق، ابنِ ہشام اور واقدی کے یہاں درج ہے۔ طبقاتِ کبیر میں اس بارے میں جو مختصر ذکر ہے، وہ اگلے صفحات میں درج کر دیا گیا ہے۔[۹۰] حاصلِ کلام یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری کے آغاز تک اس قول کا ذکر نہیں ملتا۔

اب امام احمد حنبلؒ کی بات ہو جائے اور یہ بات قدرے تفصیل سے ہوگی کیوں کہ ''من کنت مولاہُ فعلیٌ مولاہُ'' کی ابتدا ان کے مجموعۂ احادیث ''مسند امام حنبل''[۷۵] سے ہوتی ہے۔ امام احمد حنبلؒ تدوینِ حدیث کے اس دور کے آخری نمائندے ہیں جب زور

احادیث کو جمع کرنے پر تھا۔ ان کے بعد ''صحاح ستہ'' کا دور آتا ہے جب توجہ کا ارتکاز، کڑے اصولوں کے تحت، جمع شدہ احادیث میں سے ''صحیح'' احادیث کا انتخاب تھا۔ یہ دور تقریباً نصف صدی پر محیط ہے، جو امام بخاریؒ سے شروع ہو کر امام نسائی پر ختم ہوا، جس کے دوران میں چھے مجموعہ ہائے حدیث، جو ''صحاح ستہ'' کہلائے، یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔

امام احمد حنبلؒ کی ''مسند'' میں جو درجن بھر ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، مکررات سے بھرپور تقریباً تیس ہزار احادیث ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ''مسند'' میں احادیث کو مضامین کے اعتبار سے مرتب کرنے کی بجائے، ''سب سے پہلے راوی'' کے عنوان کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ اس طرح بہت سی احادیث جن کا مضمون ایک ہی ہے، ''مسند'' میں مختلف راویوں کی زبانی مختلف مقامات پر درج ہیں۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی (جلد ۲)[۷۶] کے مطابق، ''مسند کے متعلق اب غالب رائے یہ ہے کہ اس میں ''صحیح'' احادیث کے ساتھ ساتھ ''حسن'' اور ''غریب'' احادیث بھی موجود ہیں۔

''غریب'' کا مطلب ''ضعیف'' ہے، اور ''حسن'' حدیث ''صحیح'' اور ''ضعیف'' حدیث کے درمیان ہے، اور ''حسن'' میں ''صحت کے اعتبارات کے ساتھ ضبط کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔''

نچلی سطور میں، مسند امام حنبلؒ کی پانچ ایسی احادیث، مکمل حوالہ جات کے ساتھ، درج ہیں، جن کے مبینہ راوی ایک ہی صحابی ہیں یعنی انصاری صحابی حضرت بریدہ بن الحصیب الاسلمیؓ۔ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو، جب رسول کریم ﷺ کا انتقال ہوا، تو یہی حضرت بریدہؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کا جھنڈا مدینے کے نزدیکی مقام جُرف سے، جہاں سے یہ لشکر کوچ کی تیاری کر رہا تھا، مدینے لے آئے تھے اور اسے حضرت عائشہؓ کے حجرے کے دروازے کے باہر نصب کر دیا تھا۔

اس سے چند ماہ پہلے، ذی قعدہ ۱۰ھ میں، جب رسول کریم ﷺ نے، حج الوداع (ذی الحج ۱۰ھ سے پہلے)، حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت علیؓ کو دو علیحدہ علیحدہ مختصر فوجی دستوں کے ساتھ، زکوٰۃ اور مالِ غنیمت کی وصولی کے لیے یمن بھیجا، تو حضرت بریدہؓ، حضرت خالدؓ بن ولید کے دستے میں تھے۔ ۲۵ سال بعد، جمادی الثانی ۳۶ھ (دسمبر ۶۵۶ء) میں، جب

حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کی افواج کے درمیان بصرہ (عراق) میں وہ جنگ ہوئی، جو جنگِ جمل کے نام سے مشہور ہے، تو وہاں حضرت بریدہؓ، حضرت علیؓ کی فوج میں شامل تھے، اور حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے اللہ سے جا ملے تھے۔[۷۷]

مکتبہ رحمانیہ لاہور سے ۲۰۰۹ء کی طبع شدہ ۱۲ جلدوں پر مشتمل مسندِ امام احمد حنبل کے اردو ترجمے کی دسویں جلد میں ''مسند الانصار'' کے تحت یہ پانچ احادیث درج ہیں:

(۱) حدیث نمبر: ۲۳،۳۳۳ [۷۸] صفحہ نمبر: ۶۶۳

(۲) حدیث نمبر: ۲۳،۳۴۹ صفحہ نمبر: ۶۷۰

(۳) حدیث نمبر: ۲۳،۴۰۰ صفحہ نمبر: ۶۸۸

(۴) حدیث نمبر: ۲۳،۴۱۶ صفحہ نمبر: ۶۹۲

(۵) حدیث نمبر: ۲۳،۴۴۵ صفحہ نمبر: ۷۰۲

ان احادیث کا اردو ترجمہ یہ دیا گیا ہے۔

(۱) حدیث نمبر: ۲۳،۳۳۳ (صفحہ:۶۶۳)

''حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ یمن میں جہاد کے موقع پر، میں حضرت علیؓ کے ساتھ شریک تھا۔ مجھے ان کی طرف سے سختی کا سامنا ہوا، لہٰذا جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو حضرت علیؓ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شان میں کوتاہی کی (نقص نکالے)۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور کا رنگ تبدیل ہو رہا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''اے بریدہ! کیا مجھے مسلمانوں پر ان کی اپنی جانوں سے زیادہ حق نہیں ہے؟'' میں نے کہا: ''یارسول اللہؐ کیوں نہیں؟'' آپؐ نے فرمایا: ''**من کنت مولاہُ فعلیٌ مولاہُ**'' (ہم نے یہاں آخری فقرے کے درج شدہ اردو ترجمے کی بجائے عربی متن درج کر دیا ہے۔)

گو مترجم نے اس فقرے کے عربی متن کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے: ''میں جس کا ''محبوب'' ہوں، تو علی بھی اس کے ''محبوب'' ہونے چاہئیں۔'' لیکن ہم اس عربی متن کا ترجمہ

ان الفاظ میں کریں گے: ''میں جس کا ''مولا'' ہوں، علی بھی اس کے ''مولا'' ہونے چاہئیں۔'' اس طرح قاری یہ جان سکے گا کہ حدیث میں لفظ ''محبوب'' نہیں، بلکہ ''مولا'' استعمال ہوا ہے۔ حضرت بریدہؓ سے مروی پانچوں احادیث میں یہ واحد حدیث ہے جس میں حضرت علیؓ کے لیے لفظ ''مولا'' استعمال ہوا ہے۔ حضرت بریدہؓ سے مروی باقی چاروں احادیث میں ''مولا'' کی بجائے، ''ولی'' کا لفظ (جو مولا کے مختلف معانی میں سے ایک ہے) استعمال ہوا ہے۔ اب ان کا ترجمہ پیش ہے۔ یہاں اس بات کو پھر دہرا دیا جائے کہ یہ سب ایک ہی جلد (دسویں جلد) اور ایک ہی باب ''مسند الانصار'' میں درج ہیں، اور آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں۔

(۲) حدیث نمبر: ۲۳،۳۴۹ (صفحہ:۶۷۰)

اس کا عربی متن مسند امام حنبلؒ کے اردو ترجمے کی دسویں جلد کے صفحہ ۶۷۰ پر پڑھا جا سکتا ہے، جس میں مختصر پسِ منظر بیان کرنے کے بعد، حضرت بریدہؓ کی روایت کردہ حدیث ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے:

عربی متن (صفحہ:۶۷۰)	''درج شدہ'' اردو ترجمہ (صفحہ:۶۷۱)
وھو یقول من کنت ولیہٗ فعلیٌ ولیہٗ	آپؐ نے فرمایا کہ جس کا میں ''محبوب'' ہوں تو علی بھی اس کے ''محبوب'' ہونے چاہئیں۔

ہم پھر اس کا ترجمہ ''محبوب'' کی بجائے ''ولی'' کا لفظ استعمال کر کے یوں کریں گے: ''آپؐ نے فرمایا جس کا میں ولی ہوں، اس کے علی بھی ولی ہیں۔''

(۳) حدیث نمبر: ۲۳،۴۰۰ (صفحہ:۶۸۸)

''حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے یمن کی طرف دو دستے روانہ فرمائے، جن میں سے ایک پر حضرت علیؓ اور دوسرے پر حضرت خالدؓ بن ولید کو امیر مقرر کرتے ہوئے فرمایا: جب تم لوگ اکٹھے ہو، تو علیؓ سب کے امیر ہوں گے، اور جب جدا ہو تو ہر ایک اپنے

دستے کا امیر ہوگا، چنانچہ ہماری ملاقات اہلِ یمن میں سے بنو زید سے ہوئی۔ ہم نے ان سے قتال کیا تو مسلمان مشرکین پر غالب آ گئے۔ ہم نے لڑنے والوں کو قتل اور بچوں کو قید کر لیا، حضرت علیؓ نے ان میں سے ایک قیدی عورت اپنے لیے منتخب کر لی۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے یہ دیکھ کر نبی ﷺ کی خدمت میں ایک خط لکھا، جس میں انھیں اس سے مطلع کیا گیا تھا، اور خط مجھے دے کر بھیج دیا۔ میں بارگاہِ نبوتؐ میں حاضر ہوا، اور خط پیش کیا۔ نبی ﷺ کو وہ خط پڑھ کر سنایا گیا۔ میں نے نبی ﷺ کے روئے انور پر غصے کے آثار دیکھے۔ میں نے عرض کیا: ''یا اللہ کے رسول ﷺ! میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، آپؐ نے مجھے ایک آدمی کے ساتھ بھیجا تھا اور مجھے اس کی اطاعت کا حکم دیا تھا، میں نے اس پیغام (حکم) پر عمل کیا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم علیؓ کے متعلق کسی غلط فہمی میں نہ پڑنا اور پھر آپؐ نے دو بار فرمایا:

عربی متن (صفحہ:۶۸۸)	درج شدہ اردو ترجمہ (صفحہ:۶۸۸)
فانّهٗ منی وانا مِنهٗ وهُو ولیکم بعدی	بے شک وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں، اور میرے بعد وہ تمہارا ''ولی'' ہے۔
وانهٗ منی وانا مِنهٗ وهُو ولیکم بعدی	اور بے شک وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں، اور میرے بعد وہ تمہارا ''ولی'' ہے۔

یہاں بھی مسند کے اردو ترجمے کے مترجم نے ''**ولیکم**'' کا ترجمہ ''تمہارا محبوب'' کیا ہے لیکن ہم نے ترجمے میں عربی متن ''ولی'' برقرار رکھا ہے۔ یہاں ایک ضروری بات یہ درج کرنی ہے کہ اس بارے میں شدید شک پایا جاتا ہے کہ آیا آپؐ نے ''**وهُو ولیکم بعدی**'' کے الفاظ کہے بھی تھے یا نہیں؟ جہاں تک حدیث کے پہلے اور انتہائی محبت بھرے الفاظ ''**فانّهٗ منی وانا مِنهٗ**: بے شک وہ مجھ سے اور میں اس سے ہوں'' کا تعلق ہے تو اس بارے میں کبھی کوئی شک نہیں رہا۔ یہی بات صحیح بخاری کے حوالے سے، پچھلے صفحات میں درج کی جا چکی ہے، جہاں آپؐ نے کسی تیسرے شخص کو مخاطب کرنے کی بجائے، براہِ راست حضرت علیؓ سے کہا تھا: ''**انت منی وانامنک**: بے شک تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔''

(۴) حدیث نمبر: ۲۳,۴۱۶ (صفحہ:۶۹۲)

''حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ وہ کسی ایسی مجلس سے گزرے جہاں لوگ حضرت علیؓ کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ وہ ان کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ ابتدا میں، میرے دل میں حضرت علیؓ کے متعلق بوجھ تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید کی بھی یہی صورت حال تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ مجھے ایک دستے کے ساتھ روانہ کر دیا جس کے امیر حضرت علیؓ تھے۔ (حدیث ۲۳,۴۰۰ اور ۲۳,۴۱۶ میں تضاد کی یہ ایک مثال ہے۔ حدیث نمبر ۲۳,۴۰۰ سے تاثر ملتا ہے کہ حضرت بریدہؓ کے امیر حضرت خالدؓ بن ولید تھے) ہمیں وہاں قیدی ہاتھ لگے۔ حضرت علیؓ نے خُمس میں سے ایک باندی اپنے لیے رکھ لی۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے فرمایا: ٹھہرو۔ پھر جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں پیش آمدہ واقعہ بیان کرنے لگا اور کہا کہ علیؓ نے خُمس میں سے باندی لے لی ہے۔ میں نے اس وقت سر جھکا رکھا تھا۔ اچانک سر اٹھا کر دیکھا تو رسول اللہ ﷺ کا رخِ انور متغیر ہو رہا تھا۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

عربی متن (صفحہ:۶۹۲)	''درج شدہ'' اردو ترجمہ (صفحہ:۶۹۳)
من کنت ولیه فعلیٌ ولیه	جس کا میں محبوب ہوں، علی بھی اس کے محبوب ہونے چاہئیں۔

حسبِ سابق ہم یہاں بھی ''ولی'' کا ترجمہ ''محبوب'' کی بجائے ''ولی'' کریں گے۔ واضح رہے کہ ''**وهُو ولیکم بعدی**'' کے الفاظ یہاں نہیں، حالاں کہ ''ولی'' کے ذکر کے بعد ان مبینہ الفاظ کے کہنے کی فطری جگہ یہ تھی، نہ کہ پچھلی حدیث۔

(۵) حدیث نمبر: ۲۳,۴۴۵ (صفحہ:۷۰۲):

حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عربی متن (صفحہ:۷۰۲)	''درج شدہ'' اردو ترجمہ (صفحہ:۷۰۲)

من کنت ولیهٗ فعلیٌ ولیهٗ جس کا میں محبوب ہوں، علی بھی اس کے محبوب ہونے چاہئیں۔

یہاں بھی ہم ''ولی'' کا ترجمہ ''ولی'' ہی کریں گے، محبوب نہیں۔ واضح رہے کہ یہاں بھی ''**وھو ولیکم بعدی**'' کا ذکر نہیں۔ قاری اس پر تدبر کرے۔

''ولی'' اور اس کی جمع ''اولیا'' کا لفظ متعدد قرآنی آیات میں آیا ہے، جن میں ''ولی'' کے معنی ''دوست، مددگار، ساتھی، حامی، رفیق اور محافظ'' ہیں۔ جب کسی کو اللہ کا ولی یا ولی اللہ کہتے ہیں تو اس سے مراد اللہ کا دوست ہوتا ہے اور اس کا مفہوم اللہ کا محبوب بھی نکلتا ہے، جو مترجم نے اگر مندرجہ بالا تراجم میں متواتر استعمال کیا ہے، تو کوئی ایسا غلط بھی نہیں کیا۔

اکیسویں صدی عیسوی کا مسلمان حضرت بریدہؓ سے منسوب اس واحد حدیث پر غور کرے جس میں ''مولا'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کے بعد حضرت بریدہؓ سے ہی منسوب ان چار مزید احادیث پر غور کرے جن میں ''ولی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہ لفظ ''مولا'' کے معانی پر غور کرے جو کہیں اللہ کے لیے استعمال ہوئے ہیں، کہیں آزاد کردہ غلام کے لیے، اور کہیں ''ولی'' کی طرح دوست، حمایتی یا مددگار کے لیے۔ اگلے صفحات میں قرآن اور حدیث کے حوالے سے لفظ ''مولا'' کی تشریح درج کر دی گئی ہے۔ کیا کسی کو قرآن کی یہ تشریح قابل قبول نہیں؟ کیا وہ اس تشریح کی بجائے اپنی تشریح کو مقدم سمجھتا ہے؟ کیا وہ خدا کی بجائے خود کو ''العالم'' سمجھتا ہے؟

مندرجہ بالا پانچ احادیث تو ایک ہی راوی سے منسوب ہیں، اور ان کے تضادات واضح ہیں۔ مسند امام حنبلؒ میں، اس کے علاوہ، ''مولا'' کے حوالے سے دس مزید احادیث ہیں، جو مختلف راویوں کی زبانی ہیں اور اردو ترجمے کی جلد اول سے جلد دہم تک مختلف مقامات پر بکھری ہوئی ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے، ہم ان دس احادیث کے مکمل متون تو درج نہیں کر سکتے، لیکن چوں کہ تقریباً تیس ہزار احادیث میں سے، ان دس احادیث کو تلاش کرنے میں قاری کو دقت ہوگی، اس لیے ان دس ضخیم جلدوں میں سے، ان دس احادیث کی جلد نمبر، باب نمبر، حدیث نمبر، اور راویوں کے نام نیچے درج کیے جا رہے ہیں۔ اردو ترجمے میں ان دس احادیث کے نمبر

۶۴۱ سے ۲۳,۹۵۹ کے درمیان ہیں، اور چار مختلف جلدوں (اول، دوئم، ہشتم، اور دہم) میں درج ہیں۔ دوسری کتابوں میں جلد، حدیث اور صفحہ نمبر تو مختلف ہو سکتے ہیں، تاہم باب کا عنوان اور راوی کا نام مختلف نہیں ہونے چاہئیں۔

نمبر شمار	جلد نمبر	باب	حدیث نمبر	صفحہ نمبر	راوی
۱	اول	مسند خلفائے راشدین	۶۴۱	۳۳۳	زادان
۲	ایضًا	ایضًا	۹۶۱	۴۴۱	عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ
۳	ایضًا	ایضًا	۱,۳۱۱	۵۳۸	ابومریم
۴	دوئم	مسند عبداللہ بن عباسؓ	۳,۰۶۲	۳۶۴	عمرو بن میمون
۵	ہشتم	مسند الکوفیین	۱۸,۶۷۱	۱۴۱	براء بن عازب
۶	ایضًا	ایضًا	۱۹,۴۹۴	۴۰۴	عطیہ عوفی
۷	ایضًا	ایضًا	۱۹,۵۱۷	۴۱۱	ابوالطفیل
۸	ایضًا	ایضًا	۱۹,۵۴۰	۴۱۷	زید بن ارقم
۹	دہم	مسند الانصار	۲۳,۴۹۵	۷۱۶	سعید بن وہب
۱۰	ایضًا	ایضًا	۲۳,۹۵۹	۸۶۱	ریاح بن حارث

(۱) امام بخاریؒ:

اب امام بخاریؒ اور ان کے بہت محبت اور محنت سے مرتب کردہ ''صحیح بخاری'' کا ذکر ہو جائے۔ رسول کریم ﷺ کی وفات کے تقریباً دو صدی بعد، جب امام بخاریؒ نے شعور کی منزل میں قدم رکھا تو لاکھوں احادیث عالمِ اسلام میں گردش کر رہی تھیں جن میں سے بیشتر غیر مستند یا گھڑی ہوئی تھیں۔ ایک قول کے مطابق مسلمانوں ہی میں نیک دل لوگوں کا ایک طبقہ فضائل کے بارے میں احادیث وضع کرنا نیکی اور عبادت تصور کرتا تھا۔

امام بخاریؒ جب تقریباً چھے لاکھ [۶۰۰,۰۰۰] (تعداد کے اندازے مختلف ہیں، لیکن سب

لاکھوں میں ہیں، کہیں کم، کہیں زیادہ) احادیث جمع کرنے کے بعد، ان میں سے صحیح احادیث کا انتخاب کرنے بیٹھے، تو ایک اندازے کے مطابق کل ساڑھے سات ہزار احادیث قابلِ اعتماد پائیں جن میں سے دو تہائی سے زیادہ مکررات کے زمرے میں آتی تھیں، جنھیں نکال کر صحیح احادیث کی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار رہ جاتی ہے۔[۷۹]

پہلی صدی ہجری کے آغاز ہی میں، جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے احادیث جمع کرنے کی سخت حوصلہ شکنی کی، اور ایک روایت کے مطابق، حضرت ابوبکرؓ نے تو اپنے مرض الموت کے دوران میں، اپنا کمال عقیدت اور احتیاط سے جمع کیا ہوا مجموعۂ حدیث حضرت عائشہؓ کے سامنے جلا ڈالا،[۸۰] تو ان کے پیشِ نظر شاید وہی خطرہ ہو، جو دوسری صدی ہجری میں لاکھوں احادیث کی شکل میں ظاہر ہونے کے باوجود، تیسری صدی ہجری کے اولیں نصف حصے میں بھی جاری رہا۔

تیسری صدی ہجری میں محدثین کا اصل کام حدیثیں ''جمع'' کرنا نہیں بلکہ پہلے سے جمع شدہ احادیث میں سے ''صحیح'' احادیث کا، مسلمہ اصولوں اور اعلیٰ معیار کے تحت، انتخاب کرنا تھا۔ ''صحاح'' کا لفظ اسی وجہ سے سامنے آیا جو آج بھی رائج ہے۔ ''صحاح'' صحیح کی جمع ہے اور ''ستہ'' کے معنی چھے ہیں۔ تقریباً نصف صدی میں صحیح احادیث کے چھے مجموعے مرتب ہوئے، جو ''صحاح ستہ'' کہلائے۔

''صحاح ستہ'' کے یہ چھے مرتبین امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ اور امام ابنِ ماجہؒ ہیں۔ ان کے مختصر کوائف دیئے جا چکے ہیں۔ ان میں سے ایک افغانستان، دو ایران اور تین ترکستان میں پیدا ہوئے۔ ترکستان آج کئی آزاد ریاستوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان کی پیدایش بیس سال کے مختصر دورانیے میں یکے بعد دیگرے ہوئی اور ان کے مرتب کردہ مجموعہ ہائے حدیث نصف صدی کے دوران میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ اب ہر مجموعۂ حدیث کا ذکر ہو جائے۔

۱۔ صحیح بخاری:

۱۹۹۷ء میں دارالسلام ریاض نے اسے نو جلدوں میں شائع کیا، جن میں ۷,۵۶۳ احادیث، انگریزی ترجمے کے ساتھ، درج ہیں۔ صحاح ستہ میں ''صحیح بخاری'' ہر اعتبار سے سرِفہرست ہے۔ اسے ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' یعنی ''اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب'' کا لقب دیا گیا ہے۔[۸۱] امام بخاریؒ کو ''امیر المومنین فی الحدیث'' کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے انگریزی ترجمے کے مترجم مدینہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد محسن خان ہیں، جن کا یہ ترجمہ اس سے پہلے ۱۹۷۶ء۔۱۹۷۹ء میں نو جلدوں میں لاہور سے شائع ہو چکا تھا۔

صحیح بخاری میں نہ ''مولا'' والی حدیث ہے، نہ ہی ''ولی'' والی، البتہ مسند امام حنبلؒ میں حضرت بریدہؓ سے مروی تین احادیث نمبر ۲۳,۳۴۹، ۲۳,۴۰۰ اور ۲۳,۴۱۶ (جن میں ''ولی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے) ان کا نفسِ مضمون حضرت بریدہؓ کی روایت سے ہی صحیح بخاری کی مندرجہ ذیل حدیث میں بھی درج ہے۔ اس حدیث کا عربی متن (جو یکساں الفاظ میں ہے) اور اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ مندرجہ ذیل چار کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے:

(۱) صحیح بخاری شریف (مترجم)، جلد دوئم، مترجم: علامہ وحید الزماں[۸۲]

حدیث نمبر: ۱۴۷۵، صفحہ نمبر: ۷۱۸ (ناشر کا نام اور سالِ اشاعت ''حواشی'' میں درج ہے)

حضرت بریدہؓ بن حصیب نے کہا کہ آں حضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو خالدؓ بن ولید کے پاس بھیجا کہ لوٹ کے مال کا پانچواں حصہ ان سے لے آئیں۔ میں ان لوگوں میں تھا جنھوں نے حضرت علیؓ کو برا سمجھا۔ انھوں نے وہاں غسل کیا۔ میں نے خالدؓ سے کہا: ''تم دیکھتے ہو، علیؓ نے کیا کیا؟'' خیر جب ہم آں حضرت ﷺ کے پاس آئے تو میں نے آپؐ سے یہ قصہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''بریدہ! کیا تو علی سے دشمنی رکھتا ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''جی ہاں!'' آپؐ نے فرمایا: ''علی سے دشمنی (بغض) مت رکھ۔ ان کا خُمس میں اس سے زیادہ حصہ ہے۔'' (ناشر کا نام اور سالِ اشاعت ''حواشی'' میں درج ہے)

(۲) صحیح البخاری (جلد دوئم)، مترجم: ظہور الباری اعظمی [۸۳] حدیث نمبر: ۱۴۷۹، صفحات نمبر: ۷۶۲، ۷۶۳

حضرت بریدہؓ بن حصیب نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے خالدؓ بن ولید کی جگہ علیؓ کو (یمن) بھیجا کہ غنیمت کے خُمس (پانچویں حصے) کو اپنی تحویل میں لے لیں۔ مجھے علی سے بہت بغض تھا اور میں نے انھیں غسل کرتے دیکھا تھا۔ میں نے خالدؓ سے کہا کہ آپ ان صاحب کو نہیں دیکھتے؟ پھر جب ہم حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے آپؐ سے بھی اس کا ذکر کیا۔ آں حضورؐ نے دریافت فرمایا: ''بریدہ! کیا تمھیں علیؓ کی طرف سے کبیدگی ہے؟'' میں نے عرض کی کہ ''جی ہاں'' فرمایا: ''اس کی طرف سے کبیدگی نہ رکھو کیوں کہ خُمس میں اس کا اس سے بھی زیادہ حق ہے۔''

(3) "The Translation of the Meanings of Sahih Al-Bukhari"
Volume-V, Page: 387, Hadith No: 4,350
Translator: Dr. Muhammad Muhsin Khan
Publisher: Darussalam, Riyadh, Saudi Arabia
Year of Publication: 1997

Narrated Buraida: The Prohpet (PBUH) sent Ali to Khalid to bring the Khumus, and I hated Ali, and Ali had taken a bath. I said to Khalid, "Don't you see this?" When we reached the Prophet (PBUH), I mentioned that to him. He said, "O Buraida! Do you hate Ali?" I said, "Yes." He said: "Don't hate him, for he deserves more than that from the Khumus."

(4) "The Translation of the Meanings of Sahih Al-Bukhari"
Volume-V, Page: 447, Hadith No: 637
Translator: Dr. Muhammad Muhsin Khan
Publisher: Kazi Publications, Ganpat Road, Lahore
Year of Publication: 1979
"As above" (مترجم ایک ہی ہیں)

۲۔ صحیح مسلم:

صحیح بخاری کے بعد، امام مسلمؒ کی ''صحیح مسلم'' کا درجہ ہے۔ وہ امام بخاریؒ کے دس سال بعد پیدا ہوئے اور امام بخاریؒ کی وفات کے پانچ سال بعد انتقال کر گئے۔ ۲۰۰۷ء میں، دارالسلام، ریاض نے اسے سات جلدوں میں شائع کیا، جن میں ۷,۵۶۳/ احادیث انگریزی ترجمے کے ساتھ، درج ہیں۔ ''صحیح مسلم'' میں بھی نہ ''مولا'' والی حدیث ہے، نہ ہی ''ولی'' والی، البتہ رسول کریم ﷺ کے ایک خطبے کا ذکر ہے جو آپؐ نے حجِ وداع (۱۰ھ) سے واپسی پر مکے اور مدینے کے درمیان ''خُم'' نامی ایک جگہ پر ایک جوہڑ کے پاس دیا۔ عربی زبان میں ''غدیر'' جوہڑ یا بارانی تالاب کو کہتے ہیں، اس لیے یہ مقام ''خُمِ غدیر'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ خطبے کے راوی حضرت زیدؓ بن ارقم ہیں۔ حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

(1) "English Translation of Sahih Muslim"
Volume: VI, Page:267, Hadith No: 6,225
Translator: Nasiruddin al-Khattab
Publisher: Darussalam, Riyadh
Year of Publication: 2007

(2) "Sahih Muslim", Volume: IV-A, Page: 86
Hadith No: 2,408, Translator: Dr.Mahmood Martaji
Publisher: Darul-Ishaat, Urdu Bazar, Karachi
Year of Publication: 1998

اردو ترجمہ: حضرت زیدؓ بن ارقم نے کہا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ مکے اور مدینے کے درمیان ''خُم'' نامی ایک جگہ کے جوہڑ کے پاس خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''لوگو! میں انسان ہوں۔ ممکن ہے کہ اللہ کا فرشتہ جلد آ جائے اور مجھے قبول کرنا پڑے۔ میں تمہارے درمیان دو بھاری (حدیث میں لفظ ''ثقلین'' ہے) چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ پہلی اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور

ہے۔ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہنا..... پھر کہا کہ اہلِ بیت ہیں۔ میں اہلِ بیت کے بارے میں تمھیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں، میں اہلِ بیت کے بارے میں تمھیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں، میں اہلِ بیت کے بارے میں تمھیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔''

''ثقیل'' کا لفظ اردو میں بھی ''بھاری'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ''بیت'' کے معنی ''گھر'' ہیں۔ اصل میں ''بیت'' اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان رات بسر کرتا ہے یا جو اس کی جائے سکونت ہو۔[۸۴] ''اہل'' کے معنی ''والا'' یا ''والے'' ہیں۔ ''اہلِ بیت'' کے معنی ''گھر والے'' ہوئے، جسے اردو روزمرہ میں ''بیوی بچے'' کہا جاتا ہے، لیکن جب رسول کریم ﷺ اپنے خطبے میں ''اہلِ بیت'' کا خصوصی اور بار بار ذکر کرنے کے بعد، تین بار یہ ہدایت کریں کہ میں ''اہلِ بیت کے بارے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں''، تو آپؐ سے محبت رکھنے والے ہر فرد پر یہ واجب ہوجاتا ہے کہ وہ ''اللہ کی ہدایت اور نور'' سے یہ جاننے کی پُرخلوص سعی کرے کہ ''اہلِ بیت'' سے آپؐ کی مراد کیا تھی؟

مولانا رومی کا مشہور شعر ہے:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

ترجمہ: اس کا کہا اللہ کا کہا تھا، اگرچہ اللہ کے بندے کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔

اس شعر کا اطلاق اللہ کے آخری رسول ﷺ سے زیادہ کس بندہ بشر پر ہوسکتا ہے؟

اب اللہ کے نور کے ذریعے دیکھنا ہے کہ اللہ نے کیا کہا؟

یہ جاننے کے لیے اللہ کی کتاب کھولیں جس میں ہدایت اور نور ہے۔ سورۃ احزاب نکالیں جو قرآن مجید کی ۳۳ویں سورت ہے اور ۲۲ویں پارے میں ہے، اور سورۃ احزاب کی ۳۰ویں آیت سے مطالعہ شروع کردیں، جو ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے: "انساء النبی" یعنی ''اے نبیؐ کی بیویو!''

اب ۳۲ویں آیت پڑھیں، جو پھر ان ہی الفاظ سے شروع ہوتی ہے: ''اے نبیؐ کی

بیویو!''

اب ۳۳ویں آیت پڑھیں جو ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے:

عربی متن (۳۳ویں آیت)	رواں ترجمہ
انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس "اھل البیت" ویطھرلم تطھیرا واذکرن ما یتلیٰ فی "بیوتکن" من آیت اللہ و الحکمۃ ان اللہ کان لطیفا خبیرا	اے ''اہلِ بیت''! اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی دور کردے، اور تمھیں بالکل پاک صاف کردے، اور تمہارے ''گھروں'' میں جو اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں، انھیں یاد رکھو، بے شک اللہ باریک بین اور باخبر ہے۔

قرآن مجید میں مندرجہ بالا آیت، وہ واحد آیت ہے جس میں رسول کریم ﷺ کے اقربا کے لیے ''اہلِ بیت'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ سورۃ احزاب کی آیات کو ۳۰ویں آیت سے ۳۳ویں آیت تک، ایک ساتھ پڑھے بغیر ''اہلِ بیت'' کی اصطلاح کے، جو قرآنی اصطلاح ہے، معنی تک رسائی ممکن نہیں، اور یہ آیات پڑھتے ہی، جن میں ہدایت اور نور ہے، ''اہلِ بیت'' کے معنی ''الضحیٰ'' کی طرح روشن ہوجاتے ہیں۔ آیت نمبر ۳۳ میں پہلے ''اہلِ بیت'' (اے گھر والو) اور پھر ''بیوتکن'' (تمہارے گھروں) کے الفاظ کے ذریعے یہ تشریح بہ تشریح یا وضاحت در وضاحت کردی گئی ہے کہ اللہ اپنے کلام میں جن گھروں کا ذکر کر رہا ہے، وہ اللہ کے رسول ﷺ کی بیویوں کے گھر ہیں۔ ''بیوتکن'' (تمہارے گھروں) کا لفظ آیت نمبر ۳۳ میں دو بار استعمال ہوا ہے۔ پہلی بار یہ لفظ ''اہلِ بیت'' کے الفاظ سے پہلے آتا ہے (جس کا متن اور معنی ہم نے نہیں لکھے) اور دوسری بار ''اہلِ بیت'' کے الفاظ کے بعد (جس کا متن اور معنی ہم نے اوپر درج کیے ہیں)۔ ''بیوت'' لفظ ''بیت'' کی جمع ہے اور ''بیوتکن'' کے معنی ''تمہارے گھروں'' ہیں۔ سورۃ احزاب کی ان ان آیات میں قرآن نے، جس میں ہدایت اور نور ہے، رہتی دنیا تک، واضح ترین الفاظ میں یہ ذہن نشین کرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ اللہ کے کلام میں

اس جگہ ''اہلِ بیت'' کی اصطلاح صرف اللہ کے آخری رسول ﷺ کی بیویوں کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ اس بات کو پھر دہرا دیا جائے کہ قرآن مجید میں اس کے علاوہ کوئی اور آیت نہیں جس میں آپؐ کے اقربا کو ''اہلِ بیت'' کہا گیا ہو۔

قرآن کے یہ الفاظ کس کے ذریعے ہمارے پاس پہنچے؟ یہ الفاظ اللہ نے اپنے رسولؐ کے قلب پر نازل کیے، اور آپؐ نے، نزول کے فوراً بعد، کاتب کو بلا کر یہ الفاظ قلم بند کرائے۔ اگر محمد ﷺ یہ نہ کہتے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، تو انھیں کون قرآن کے الفاظ مانتا؟ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی سب سے بڑی سند ہی یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے کہا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ قرآن اپنے معنی ذہن نشین کرا چکا، اب اکیسویں صدی کا مسلمان ان معنوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر اگلی سطور پڑھے۔

حجِ الوداع سے واپسی پر، آپؐ کی سب بیویاں آپؐ کے ساتھ تھیں۔ اس وقت آپؐ کی نو بیویاں زندہ تھیں، جن میں سے سات، آپؐ سے شادی کرنے سے پہلے بیوہ ہو چکی تھیں اور ایک (حضرت زینبؓ بن جحش) مطلقہ تھیں۔ سورۃ احزاب (آیت نمبر ۶) میں انھیں امت کی ''مائیں'' کہا گیا۔ اسی سورت (آیت نمبر ۵۳) میں مسلمانوں کو خبردار کر دیا گیا کہ انھیں یہ حلال نہیں ہے کہ آپؐ کے بعد، کسی وقت بھی، آپؐ کی بیواؤں سے نکاح کریں۔ ان نو بیویوں کے نان ونفقہ کی ذمے داری آپؐ پر تھی۔ حجِ الوداع کے موقع پر آپؐ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آپؐ جلد اپنے پالن ہار سے ملنے والے ہیں۔ آپؐ نے اپنے پیچھے دینار، درہم، اونٹ اور بکری کچھ نہیں چھوڑے اور نہ کسی چیز کی وصیت کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ رسمِ رخصتی حجِ الوداع کے تقریباً تین ماہ بعد ہوگئی۔ کیا حجِ الوداع کے بعد مکے سے مدینے جاتے ہوئے، جب آپؐ کی سب بیویاں آپؐ کے ساتھ تھیں، آپؐ جیسی خیال رکھنے والی ہستی کو اپنی بیویوں کا خیال نہیں آیا ہوگا؟

قرآن کریم میں ''اہلِ بیت'' کے الفاظ پر تدبر کرنے کے بعد، آپؐ کے اس خطبے کے الفاظ پر غور کریں۔ آپؐ پہلے اپنے صحابہؓ سے کہتے ہیں کہ لوگو! میں انسان ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ میرا بلاوا آجائے۔ یہ بتا کر فرماتے ہیں کہ میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ پہلے آپؐ اللہ کی کتاب کا نام لیتے ہیں کہ اسے مضبوطی سے تھامے رہنا، یہ ہدایت

اور نور ہے۔ یہ اسی پیغام کا اعادہ ہے جو آپؐ صرف نو روز پہلے میدانِ عرفات میں تقریباً ایک لاکھ صحابہ کے سامنے دے چکے تھے۔ وہاں بھی قرآن کے علاوہ، یا قرآن کے ساتھ، کسی چیز کا ذکر نہ تھا، اور یہاں بھی نہیں تھا۔ یہ حقیقت دوبارہ واضح کرنے کے بعد، آپؐ ''اہلِ بیت'' کا نام لیتے ہیں۔ اس بار یہ نہیں کہتے کہ انھیں بھی مضبوطی سے تھامے رہنا، ان میں بھی ہدایت اور نور ہے۔ ''اہلِ خانہ'' کے لیے حکم یہ ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں تمھیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں اور یہ حکم تین بار دہرایا جاتا ہے۔ آپؐ کی خودداری کو یہ گوارا نہیں ہوا کہ یہ کہتے کہ میرے بعد میرے اہلِ خانہ کی خبرگیری کرنا لیکن آپؐ نے اپنے صحابہ کو بتا دیا کہ میرے اہلِ خانہ تمہاری بھاری ذمے داری ہیں۔ ان کے بارے میں تمھیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔

اکیسویں صدی عیسوی کے مسلمان کے ذہن میں یہ سوال اٹھے گا کہ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ''اہلِ بیت'' کیوں کہا جاتا ہے۔ اس کا مختصر، مدلل اور مکمل جواب یہ ہے کہ اگر رسول کریم ﷺ نے کسی موقع، یا مواقع، پر ان چاروں کو ''اہلِ بیت'' کہا، تو آپؐ کے فرمان کے مطابق وہ بھی آپؐ کے اہلِ بیت ہی کہلائیں گے، لیکن قرآن میں ''اہلِ بیت'' سے مراد صرف ''نساء النبیؐ'' تھیں، اس کے علاوہ کوئی اور نہیں۔

۳۔ سننِ ابوداؤد:

۲۰۰۸ء میں، دارالسلام، ریاض نے اسے، انگریزی ترجمے کے ساتھ، پانچ جلدوں میں شائع کیا، جن میں ۵,۲۷۴/ احادیث ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بعد، زمانی اعتبار سے، صحاح ستہ میں ''سننِ ابوداؤد'' تیسرے نمبر پر ہے، اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی طرح اس میں بھی ''مولا'' والی حدیث نہیں ہے۔

۴۔ سُننِ نسائی:

۲۰۰۷ء میں، دارالسلام ریاض/ لاہور نے اسے، انگریزی ترجمے کے ساتھ، چھے

جلدوں میں شائع کیا۔ مترجم کا نام نصیرالدین الخطاب ہے۔ اس میں ۵,۷۶۱/ احادیث درج ہیں۔

سننِ نِسائی صحاح ستہ کا آخری مجموعہ حدیث ہے لیکن اس کا ذکر ''جامعِ ترمذی'' اور ''سننِ ابن ماجہ'' سے پہلے کیا جاتا ہے، جس کی وجہ جامعِ ترمذی اور سننِ ابن ماجہ کے اذکار میں عیاں ہوجائے گی۔ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے جو اردو دائرہِ معارفِ اسلامیہ (جلد۲۲، صفحہ۱۸۷) کے مندرجہ ذیل اقتباس سے پوری ہوجائے گی:

''امام نسائی کی شہرت زیادہ تر ان کی کتاب ''السنن'' کی وجہ سے ہے، جو اس عہد کی اکثر کتبِ حدیث کی تلخیص بیان کی جاتی ہے۔ اولاً امام موصوف نے ایک ضخیم کتاب ''السنن الکبریٰ'' تالیف کی، جس میں صحیح وضعیف ہر قسم کی احادیث درج کی گئی تھیں۔ پھر.....صرف صحیح احادیث پر اکتفا کرنے کی خاطر کتاب ''السنن الکبریٰ'' کا انتخاب واختصار ''کتاب المجتبیٰ'' کی شکل میں خود پیش کیا۔ موجودہ اور مروجہ کتاب ''السنن'' (نسائی) یہی ''المجتبیٰ'' ہے۔''

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سننِ ابوداؤد کی طرح، سننِ نِسائی میں بھی ''مولا'' والی حدیث نہیں ہے، گویا یہ حدیث نہ صحاح ستہ کی سب سے پہلی (اور سب سے مستند) کتاب صحیح بخاری میں ہے اور نہ صحاح ستہ کی سب سے آخری (اور اکثر کتبِ حدیث کی تلخیص) کتاب سنن نسائی میں ہے (اور نہ درمیان کی دو صحاح میں ہے) اب بقیہ دو مجموعہ ہائے احادیث یعنی ''جامعِ ترمذی'' اور ''سننِ ابن ماجہ'' کا ذکر کرکے بات ختم کرتے ہیں۔

۵۔ جامعِ ترمذی یا سننِ ترمذی:

۲۰۰۷ء میں، دارالسلام ریاض/ لاہور نے، انگریزی ترجمے کے ساتھ، اسے چھے جلدوں میں شائع کیا۔ مترجم کا نام ابوخلیل ہے۔ اس میں ۳,۹۵۶/ احادیث درج ہیں۔ اسے سنن ترمذی بھی کہا جاتا ہے۔ جامع/سنن ترمذی کے بارے میں، اردو دائرہِ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی جلد نمبر ۶ (مطبوعہ ۱۹۶۲ء) کے صفحہ ۳۸۰ پر درج ہے:

سنن ترمذی میں، ترمذی کے ملاحظات در بابِ اسناد (صحیح، حسن، غریب، حسن صحیح،

حسن غریب، صحیح غریب) یکساں طور پر درج نہیں ہوئے۔ آپ (امام ترمذی) نے اس بات کی تشریح نہیں کی کہ احادیث کو ایک دوسرے سے اس طرح تمیز کرنا (یعنی کون سی صحیح ہے اور کون سی غریب وغیرہ) کن اصول (اصولوں) پر مبنی ہے۔''

اکیسویں صدی عیسوی کی ایک تصنیف ''سیرت نگاری۔ آغاز وارتقاء'' [۸۵(I)] میں، اس بات کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''امام ترمذی نے اس (جامعِ ترمذی) میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں شامل کی ہیں۔ ہر ضعیف حدیث کے وجہِ ضعف پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور ہر حدیث کے ساتھ اس کا درجہ بھی بیان کرتے ہیں، صحتِ احادیث اور قوتِ سند کے اعتبار سے جامعِ ترمذی کا مرتبہ کتبِ صحاح میں پانچویں درجہ پر ہے۔'' اس کے بعد سنن ابنِ ماجہ رہ جاتی ہے۔

اس طرح سننِ ترمذی، ایک لحاظ سے، امام نسائی کی پہلی تصنیف ''السنن الکبریٰ'' کی طرح ہے (''کتاب المجتبیٰ'' المعروف بہ سنن نِسائی کی طرح نہیں) السنن الکبریٰ میں بھی صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں شامل تھیں، لیکن پھر امام نسائی نے صرف صحیح احادیث پر اکتفا کرنے کی خاطر ''کتاب المجتبیٰ'' پیش کی جو ''صحاح'' کہلانے کی حقدار ٹھہری، اور ''السنن الکبریٰ'' کا شمار بجا طور پر صحاح ستہ میں نہیں ہوا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ضعیف احادیث کے باوجود جامعِ ترمذی کو حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں سے ایک کتاب کا درجہ کیوں دیا گیا، اور اب تک دیا جاتا ہے۔ اکیسویں صدی عیسوی کا مسلمان اس پر تدبر کرے۔

اب جامعِ ترمذی میں درج شدہ اس حدیث کا عربی متن پیش ہے، جس میں ''مولا'' کا لفظ صحاح ستہ کے کسی مجموعے میں پہلی بار استعمال ہوا ہے:

عربی متن: ''**یحدث عن ابی سریحه او زید بن ارقم شک شعبه عن النبی ﷺ قال من کنت مولاه فعلی مولاه.**''

یہ عربی متن انگریزی اور اردو کے ان تراجم میں پڑھا جاسکتا ہے:

(1) English Translation of Jami Al-Tirmidhi (Vol:II)

Page: 387, Chapter: Virtues of Ali Bin Talib,
Hadith No: 3713, Translator: Abu Khaliyl,
Publisher: Darusslam, Riyadh/Lahore,
Year of Publication: 2007

(۲) جامعِ ترمذی (جلد دوئم)، صفحہ: ۵۳۸، باب: مناقبِ علیؓ بن ابی طالب، حدیث نمبر: ۳,۴۸۵، مترجم: فضل احمد، ناشر: دارالاشاعت اردو بازار، کراچی، سالِ اشاعت: نہیں دیا۔

اردو ترجمہ: ''حضرت ابو سریحہؓ یا حضرت زیدؓ بن ارقم کہتے ہیں (شعبہ کو شک ہے) کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس کا میں مولا ہوں، علیؓ بھی اس کا مولا ہے۔'' صفحہ ۵۳۸ پر ہی امام ترمذی کی اپنی رائے ان الفاظ میں درج ہے کہ ''یہ حدیث حسن غریب ہے۔''

(نوٹ: اردو ترجمے میں ''مولا'' کا ترجمہ دونوں مقامات پر ''دوست'' کیا گیا ہے لیکن ہم نے لفظ ''مولا'' برقرار رکھا ہے)۔

۴۔ سننِ ابنِ ماجہ:

۲۰۰۷ء میں دارالسلام ریاض/ لاہور نے، انگریزی ترجمے کے ساتھ، اسے پانچ جلدوں میں شائع کیا۔ اس میں ۴,۳۴۱/ احادیث درج ہیں۔ اس کے بارے میں، پہلے دارالسلام ریاض سے ہی ۲۰۰۴ء میں چھپنے والے ''اٹلس سیرت نبویؐ'' اور اس کے بعد اردو دائرہِ معارفِ اسلامیہ (جلد نمبر ا، صفحہ ۶۷۷، طبع ثانی ۱۹۸۰ء) کے چند اقتباسات پیش ہیں۔

''اٹلس سیرت نبویؐ'' دمشق، شام کے ڈاکٹر شوقی ابوخلیل کی عربی کتاب ''اطلس السیرۃ النبویہؐ'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کے صفحہ نمبر ۴۸۶ پر، ڈاکٹر شوقی ابوخلیل نے ''سننِ ابنِ ماجہ'' کے بارے میں یہ لکھا ہے:

''اس میں کل ۴,۳۴۱/ احادیث ہیں۔ ان میں ۳,۰۰۲ دیگر کتبِ خمسہ (یعنی صحاح ستہ کی باقی پانچ کتابوں) میں موجود ہیں۔ ۱,۳۳۹/ زائد ہیں جن میں ۶۱۳ کی سند میں کمزوری

ہے۔ ۹۹ ناقابلِ اعتبار یا جھوٹ ہیں۔ اس لیے اس سنن (ابنِ ماجہ) سے کوئی حدیث لینے سے پہلے اس (حدیث) کا درجہ جان لینا ضروری ہے۔''

اب سوال یہ ہے کہ اس کے باوجود سننِ ابن ماجہ کا شمار صحاح ستہ یعنی احادیث کے چھے سب سے صحیح مجموعوں میں کیوں کیا جاتا ہے؟ اس بارے میں اردو دائرہِ معارفِ اسلامیہ (جلد نمبر ا، صفحہ ۶۷۷، طبع ثانی: ۱۹۸۰ء) سے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش ہیں، جو اس سوال کا مکمل جواب فراہم نہیں کرتے:

''(سننِ ابنِ ماجہ) میں ۴,۳۴۱/ احادیث ہیں۔ ان میں سے ۳,۰۰۲ حدیثیں تو وہ ہیں جو صحاح کی باقی پانچ کتابوں میں بھی موجود ہیں اور باقی ۱,۳۳۹/ حدیثیں ایسی ہیں جو زوائد ابنِ ماجہ ہیں۔ ابنِ ماجہ کی ''سنن'' عموماً صحاح ستہ میں شمار ہوتی ہے..... لیکن (اور یہاں سات علما بشمول ابن الاثیر کے نام درج ہیں) ایسے علما اسے صحاح ستہ میں شامل نہیں کرتے، بلکہ اس کے بجائے یا تو وہ صحاح خمسہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں، اور یا بعض لوگ امام مالکؒ (وفات ۱۷۹ھ) کی ''موطا'' کو ''صحاح ستہ'' کے زمرے میں شامل کرتے ہیں..... صحت و قوتِ روایات کے لحاظ سے ''موطا'' کو مسلمہ طور پر سننِ ابنِ ماجہ پر بدرجہا فوقیت حاصل ہے۔''

(اگر آخر الذکر بات درست ہے تو فوقیت رکھنے والی موطا صحاح ستہ میں کیوں شمار نہیں ہوتی؟)

''جن لوگوں نے سنن ابنِ ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل نہیں کیا، ان کے نزدیک اس سنن میں بعض احادیث ''ضعیف'' اور ''منکر'' ہیں۔ واضح رہے کہ ''اس کتاب کو پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں صحاح ستہ میں شمار کیا گیا۔'' [۸۵(II)] (کیوں؟)

اکیسویں صدی عیسوی کے علما کو اس سوال کا جواب دینا ہے کہ سننِ ترمذی اور سنن ابن ماجہ کو آج بھی صحاح ستہ کیوں شمار کیا جاتا ہے؟ اور امام مالکؒ کی ''موطا'' یا امام احمد حنبلؒ کی ''مسند'' کو، جو صحاح ستہ سے پہلے مرتب ہوئیں اور جن کے مرتبین اپنے اپنے فقہ کے امام بھی ہیں، صحاح ستہ میں کیوں شامل نہیں کیا گیا؟ یہ جواب صدیوں پہلے آجانا چاہیے تھا۔

اب سننِ ابنِ ماجہ کی دو احادیث پیش ہیں۔ پہلی حدیث (نمبر ۱۱۶) میں حضرت علیؓ

کے لیے ''ولی'' اور دوسری (نمبر۱۲۱) میں ''مولا'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ تفصیلات یہ ہیں:

پہلی حدیث:

(1) English Translation of "Sunan Ibn Majah"
Volume:1, Page:156, Hadith No:116,
Translator: Nasiruddin Al-Khattab,
Publisher: Darussalam, Riyadh/Lahore,
Year of Publication: 2007

(۲) سنن اِبنِ ماجہ (جلد اول)، صفحہ:۷۲، حدیث نمبر:۱۱۶، مترجم: محمد قاسم امین،
ناشر: مکتبہ العلم، اردو بازار، لاہور

اردو ترجمہ: براء بن عازب کہتے ہیں کہ ہم اس حج میں جو رسول اللہ ﷺ نے کیا، ان کے ساتھ آئے۔ آپؐ راستے میں کسی جگہ اترے، نماز کا حکم دیا۔ پھر علیؓ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: ''کیا میں ایمان والوں کے نزدیک ان کی جانوں سے زیادہ محبوب نہیں ہوں؟'' لوگوں نے کہا: ''کیوں نہیں۔'' فرمایا: ''کیا میں ہر مومن کے نزدیک اس کی جان سے زیادہ محبوب نہیں ہوں؟'' لوگوں نے کہا: ''کیوں نہیں.....''

(اب اردو ترجمے سے پہلے، اس کا عربی متن درج کیا جاتا ہے):

عربی متن	اردو ترجمہ
قالو فهذا ولی من انا مولاه	فرمایا یہ (علیؓ) اس کے ''ولی'' ہیں جس کا میں ''مولا'' ہوں۔

دوسری حدیث:

اب دارالسلام ریاض/ لاہور کے مندرجہ بالا انگریزی ترجمے سے ہی دوسری حدیث نمبر۱۲۱ (صفحہ نمبر:۱۵۹) کا خلاصہ اردو میں پیش ہے:

''حضرت سعدؓ بن وقاص راوی ہیں کہ ایک حج کے موقع پر معاویہ نے.....علیؓ پر تنقید

کی۔ سعدؓ بن وقاص ناراض ہوگئے اور کہا: ''تم یہ باتیں ایسے شخص کے بارے میں کر رہے ہو، جس کے لیے میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے.....''

(اب ایک بار پھر ترجمے سے پہلے، اس کا عربی متن درج کیا جاتا ہے):

عربی متن	ترجمہ
من کنت مولاه فعلیً مولاه	جس کا میں ''مولا'' ہوں، علیؓ اس کے ''مولا'' ہیں

پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری تک مختلف کتبِ تاریخ اور مجموعہ ہائے احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ ''**من کنت مولاه فعلیً مولاه**'' کے قول کی ابتدا دوسری صدی ہجری میں ''مسند امام حنبل'' سے ہوئی، جس میں تقریباً تیس ہزار احادیث ہیں، اور جسے ''صحاح ستہ'' میں شامل نہیں کیا گیا۔ ''مسند امام حنبل'' میں، اس موضوع پر حضرت بریدہؓ سے، جو اس واقعہ میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، پانچ احادیث مروی ہیں۔ چار احادیث میں ''**من کنت ولیه فعلیً ولیه**'' کے الفاظ ہیں، جن میں سے ایک حدیث میں ''**فانه منی وانا منه**'' کے الفاظ بھی ہیں۔ صرف ایک حدیث میں ''**من کنت مولاه فعلیً مولاه**'' کے الفاظ ہیں۔ واضح رہے کہ ان پانچوں احادیث کے مبینہ راوی حضرت بریدہؓ ہیں۔

اب صحاح ستہ کا دور آتا ہے۔ سب سے پہلا اور سب سے صحیح مجموعۂ احادیث صحیح بخاری ہے جس میں ''مسند حنبل'' کی تقریباً تیس ہزار احادیث کے مقابلے میں تقریباً ساڑھے سات ہزار احادیث درج ہیں اور ان میں ''مولا'' والی حدیث نہیں ہے۔ صحیح بخاری کے بعد صحیح مسلم کی اشاعت ہوتی ہے جس میں بھی اتنی ہی احادیث درج ہیں اور ان میں بھی ''مولا'' والی حدیث نہیں ہے۔ سند اور مرتبے کے لحاظ سے، اور زمانی اعتبار سے بھی، صحیح مسلم کا دوسرا نمبر ہے۔ اس کے بعد زمانی اعتبار سے ''سننِ ابوداؤد'' آتی ہے جس میں تقریباً سوا پانچ ہزار احادیث درج ہیں۔ ان میں بھی ''مولا'' والی حدیث نظر نہیں آتی۔ سب سے آخر میں ''سننِ نسائی'' مرتب ہوئی۔ امام نسائی کے سامنے امام احمد حنبلؒ کی مسند اور صحاح ستہ کے پہلے پانچ مجموعہ ہائے حدیث موجود تھے لیکن ''سننِ نسائی'' کی تقریباً پونے چھے ہزار احادیث میں بھی

''مولا'' والی حدیث نہیں۔ جامعِ ترمذی میں یہ حدیث درج ہے لیکن جن الفاظ میں درج ہے، وہ قاری پڑھ چکا ہے اور اس حدیث کے بارے میں خود امام ترمذی کی اپنی رائے بھی پڑھ چکا ہے۔ سننِ ابنِ ماجہ میں اس کی دو مختلف روایات ہیں۔ ایک میں، جو ''ضعیف'' قرار دی گئی ہے، حضرت علیؓ کے لیے ''ولی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور دوسری میں جو ''صحیح'' قرار دی گئی ہے، حضرت علیؓ کے لیے ''مولا'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن دونوں روایات میں اس پسِ منظر کا ذکر نہیں جس میں ''ولی'' یا ''مولا'' کہنے کی ضرورت پیش آئی۔

''مولا'' والی حدیث کے بارے میں، پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری کے اوائل تک کی احادیث کا مندرجہ بالا مفصل تجزیہ، صحیح بخاری کی ایک حسین اور اثر انگیز حدیث پر ختم کیا جاتا ہے۔ اس مستند حدیث میں وہ پسِ منظر دیا گیا ہے، جس میں رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے اپنی بے پناہ محبت کے اظہار کے لیے فرمایا تھا: ''انت منی وانامنک'' یعنی ''بے شک تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔'' اس مفہوم کے اس سے ملتے جلتے الفاظ ''مسند امام حنبل'' کی حدیث نمبر ۲۳,۴۰۰ [۸۶] میں بھی درج ہیں لیکن وہاں پسِ منظر بالکل مختلف ہے اور وہ گزشتہ صفحات میں درج کیا جا چکا ہے۔

صحیح بخاری کی اس حدیث، جس کا ذکر اب شروع ہے، سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے، حضرت علیؓ کی موجودگی میں، ''مولا'' کا لفظ ان کے لیے نہیں بلکہ اپنے ایک اور محبّ اور محبوب صحابی کے لیے استعمال کیا۔ ان کا نام زیدؓ بن حارثہ تھا۔ وہ آپؐ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ عربی زبان میں لفظ ''مولا'' کے معنی اگر ایک طرف ''پروردگار'' ہیں (اور اردو زبان میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے) تو دوسری طرف ''آزاد کردہ غلام'' ہیں۔ اس ذُو معنی لفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے، آپؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے اس بے ساختہ فقرے کے عربی الفاظ پر غور کریں، جو فصاحت اور معنویت سے اتنے بھرپور ہیں کہ ہم نے حدیث کے ترجمے کے آخری حصے میں پہلے ان حسین الفاظ کا عربی متن درج کیا ہے اور پھر اس کا اردو ترجمہ۔ اگرچہ زیدؓ بن حارثہ رسول کریم ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے لیکن اس حدیث میں آپؐ زیدؓ کو ''اخونا''

یعنی ''ہمارا بھائی'' کہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت حمزہؓ آپؐ کے چچا تھے، لیکن چوں کہ آپؐ نے اپنے چچا (حضرت حمزہؓ) اور اپنے منہ بولے بیٹے (حضرت زیدؓ) کے درمیان بھائی بھائی کا رشتہ قائم کر دیا تھا، اس لیے اس حدیث میں حضرت زیدؓ، حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو اخوتِ اسلامی کی اسی نسبت سے ''بھائی کی بچی'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ حدیث کے متعلقہ حصے کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"The Translation of the Meanings of Sahih Al-Bukhari"
Vol:III, Page:538, Chapter: Peacemaking (کتاب الصلح),
Hadith No: 863, Year of Publication: 1979,
(Kazi Publications, Lahore).

''(صلح حدیبیہ (۶ھ) کے) اگلے سال آپؐ مکے تشریف لے گئے۔ (مکے میں قیام کی) مدت پوری ہوگئی تو قریش حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا کہ اپنے صاحبؐ سے کہو کہ (آپؐ کے قیام کی) مدت پوری ہوگئی ہے، اب وہ ہمارے یہاں سے چلے جائیں۔ نبی کریم ﷺ مکے سے روانہ ہونے لگے تو حضرت حمزہؓ کی ایک بچی ''چچا چچا'' کرتی ہوئی پیچھے ہو گئیں۔ حضرت علیؓ نے انھیں اپنے ساتھ لے لیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر حضرت فاطمہؓ کے پاس لائے اور کہا کہ اپنے چچا کی بیٹی کو بھی ساتھ لے لو، چناں چہ حضرت فاطمہؓ نے اس بچی کو اپنے ساتھ سوار کر لیا۔ پھر حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ جھگڑنے لگے (کہ اس بچی کی کفالت کون کرے گا) حضرت علیؓ نے کہا کہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے، اس لیے میرا حق فائق ہے۔ حضرت جعفرؓ نے کہا کہ یہ (نہ صرف) میرے چچا کی بیٹی ہے بلکہ اس کی خالہ میری بیوی ہیں۔ (واضح رہے کہ حضرت جعفرؓ، حضرت علیؓ کے سگے بڑے بھائی تھے) حضرت زیدؓ (بن حارثہ) نے کہا کہ یہ میرے ''بھائی کی بچی'' ہے (اس طرح میرا حق سب پر بھاری ہے)

نبی کریم ﷺ نے بچی کی خالہ کے حق میں فیصلہ کیا (جو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی بیوی تھیں) اور فرمایا کہ خالہ ماں کی طرح ہوتی ہے۔ (اس کے بعد پہلے آپؐ کے فرمائے ہوئے الفاظ کا عربی متن اور سامنے اردو ترجمہ درج ہے):

عربی متن	اردو ترجمہ

وقال لعلی انت منی و انامنک وقال لجعفر اشبهت خَلقی و خُلقی وقال لزید انت اخونا و مولانا	اور علیؓ سے کہا کہ میں تجھ سے ہوں اور تو مجھ سے ہے اور جعفرؓ سے کہا کہ تم صورت و سیرت میں مجھ سے مشابہ ہو اور زیدؓ سے کہا کہ تم ہمارے بھائی اور ہمارے مولا ہو۔

عربی متن کو ایک سے زیادہ بار پڑھیں۔ اس کی فصاحت کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ اس پسِ منظر پر غور کریں جس میں حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ: ''میں تجھ سے ہوں اور تو مجھ سے ہے''، اور حارثہ کے بیٹے اور اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زیدؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ تم ''ہمارے'' بھائی بھی ہو اور (یہاں ''مولا'' کے کئی معانی ذہن میں رکھیں) ہمارے مولا بھی۔'' اور ظاہر ہے کہ ''مولا'' والی یہ بات حضرت علیؓ کے سامنے کہی گئی۔

پہلی دوسری اور تیسری صدی ہجری کی احادیث کے بعد، اب دیکھتے ہیں کہ اس دور کی مشہور اور مستند کتبِ تاریخ میں اس بارے میں کیا لکھا ہے۔

(۱)۔ پہلی صدی ہجری

اس صدی میں تاریخ کی جو کتابیں ''مغازی'' کے نام سے لکھی گئیں، وہ آج ناپید ہیں۔ ان کے اقتباسات جہاں جہاں درج ہیں، وہاں ''مولا'' والی بات کا کوئی ذکر نہیں۔

(۲)۔ دوسری صدی ہجری

اس صدی کے تین مشہور مورخین، جن کی کتابیں آج بھی دستیاب ہیں، یہ ہیں:

نمبرشمار	نام	سنین	پیدائش	تدفین
۱	محمد ابنِ اسحاق	(۸۵ھ۔۱۵۱ھ)	مدینہ	بغداد

نمبرشمار	نام	سنین	پیدائش	تدفین
۲	ابنِ ہشام	(نامعلوم۔۲۱۳ھ)	بصرہ	قاہرہ
۳	ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی	(۱۳۰ھ۔۲۰۷ھ)	مدینہ	بغداد

(۳)۔ دوسری صدی ہجری کا اواخر۔ تیسری صدی ہجری کا آغاز

(۴) محمد ابن سعد (۱۶۸ھ۔۲۳۰ھ) پیدائش: بصرہ تدفین: بغداد

(۴)۔ تیسری صدی ہجری

(۵) محمد بن جریر طبری (۲۲۵ھ۔۳۱۰ھ)، پیدائش: امل (صوبہ مازندران) (ایران)، تدفین: بغداد

ذیل میں ان پانچوں مورخین کا مختصر تعارف، اس واقعے کے بارے میں اس تفصیلی ذکر کے ساتھ پیش کیا جائے گا جو ان پانچوں نے اپنی تاریخ کی کتابوں میں قلم بند کیا ہے۔

۱۔ ابنِ اسحاق:

رسول کریم ﷺ کے پہلے باضابطہ اور مفصل سوانح نگار محمد بن اسحٰق اور ان کی کتاب کا ذکر پچھلے صفحات میں خاصی تفصیل سے ہوچکا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں، اس کا جو ترجمہ اکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے لندن سے شائع کیا، اس میں ''مولا'' یا ''ولی'' میں سے کسی قول کا ذکر نہیں، جس کا یہ مطلب نہیں کہ ابنِ اسحاق نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ نہ صرف ابنِ اسحاق بلکہ ان کے بعد آنے والے چاروں ممتاز مورخین نے (جن میں سے واقدی اور طبری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شیعہ تھے) اس واقعے کا جو پسِ منظر اپنی کتابوں میں لکھا ہے، وہ اس روایت سے قطعی مختلف ہے جو مسند امام حنبل کی حدیث نمبر ۲۳،۴۰۰ یا ۲۳،۴۱۶، یا صحیح بخاری میں درج ہے۔ انگریزی ترجمے کے مطابق، ابنِ اسحاق نے یہ لکھا ہے:

"When Ali came from the Yaman to meet the apostle in Mecca, he hurried to him, and left in charge of his army one of his companions who went and covered every man in the force with clothes from the linen Ali had. When the army approached, he (Ali) went out to meet them, and found them dressed in the clothes. When he asked what on earth had happened, the man said that he had dressed the man so that they might appear seemly when they mingled with the people. He (Ali) told him (the man in-charge) to take off the clothes before they came to the apostle, and they did so, and put them back among the spoils. The army showed resentment at their treatment..... When the men complained of Ali, the apostle arose to address them, and he (i-e, the narrator Abu Said al-Khudri) heard him (the apostle) say:

"Do not blame Ali, for he is too scrupulous in the things of God, or in the way of God, to be blamed." [٨٧]

٢۔ ابنِ ہشام:

ابنِ ہشام کا ذکر بھی پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ انھوں نے ابنِ اسحاق کی کتاب کے بہت سے حصے خصوصًا اشعار حذف کیے، اور کتاب کے متن میں ۹۲۲/ اضافے، ترامیم اور تشریحات کر کے اس کتاب کو "السیرۃ النبویۃ" کے نام سے شائع کیا۔ ان کثیر اضافوں وغیرہ کے باوجود، "السیرۃ النبویۃ" میں بھی "مولا" یا "ولی" والے کسی قول کا ذکر نہیں۔ ابنِ ہشام نے جو لکھا ہے (جو ابنِ اِسحٰق کے مطابق ہے)، اب اس کا اردو ترجمہ پیش ہے:

"جب علیؓ یمن سے اس قصد کے ساتھ واپس ہوئے کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ سے جا کر ملیں تو انھوں نے آپؐ کے پاس پہنچنے میں عجلت سے کام لیا، اور جو لشکر ساتھ تھا، اس پر ان ہی لوگوں میں سے ایک کو اپنا قائم مقام بنا دیا۔ قائم مقام نے ہر فرد کو یمن کے بر

(کپڑے) کا ایک ایک حلہ (لباس) پہنا دیا۔ پھر جب علیؓ (واپس ہو کر) اپنے لشکر کے قریب آئے اور لوگوں سے ملنے کے لیے نکلے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ان سب نے حلے پہن رکھے ہیں۔ (علیؓ نے) فرمایا: "تمہارا برا ہو، یہ کیا ہے؟" قائم مقام نے جواب دیا کہ یہ حلہ میں نے پہنایا ہے تا کہ جب یہ لوگ دوسرے لوگوں کے پاس پہنچیں تو نظروں میں جچیں۔ علیؓ نے کہا: "تیرا برا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے سے پہلے یہ لباس اتار دو۔" راوی نے کہا کہ آخر حضرت علیؓ نے ان لوگوں سے یہ لباس اتروا لیا اور ان کپڑوں کو واپس لے کر مالِ غنیمت میں رکھ لیا۔ راوی نے بیان کیا کہ لشکریوں نے اس بات کو اچھا نہ سمجھا اور رسول اللہ ﷺ سے اس کی شکایت کی..... رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں میں کھڑے ہو کر تقریر کی۔ میں (ابوسعید خدری) نے آپؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا:

"اے لوگو! علیؓ کی شکایت مت کرو، کیوں کہ خدا کی قسم وہ اللہ کی ذات کے سلسلے میں، یا اللہ کے راستے میں، اس چیز سے کہیں زیادہ محتاط ہے کہ اس کی شکایت کی جائے۔" [٨٨]

٣۔ واقدی:

ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی مدینے میں پیدا ہوئے۔ ان کی بہت سی تصانیف، جن میں سے ایک کا نام "وفات النبیؐ" ہے، صدیوں سے ناپید ہیں۔ اگر یہ کتاب آج ہوتی تو رسول کریم ﷺ کے آخری ایام کے بارے میں بہت اہم ماخذ ہوتی۔ ان کی واحد (اور ضخیم) کتاب جو حوادثِ زمانہ کی دست برد سے نہ جانے کیسے بچ گئی، "المغازی" ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن نے اس کا ایڈٹ کیا ہوا عربی متن بہت اہتمام سے تین جلدوں میں شائع کیا، جو ۱,۳۶۷/ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۸۴ء میں اسی ایڈٹ کیے ہوئے متن کا (تیسرا) اڈیشن بیروت سے تین جلدوں میں شائع کیا گیا، جو ۱,۱۲۷/ صفحات پر محیط ہے۔

بیروت اڈیشن کے صفحات ۱۰۸۰، ۱۰۸۱/ پر، اس واقعے کا جو پسِ منظر بیان کیا گیا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

''حضرت علیؓ نے جب مالِ غنیمت اکٹھا کرلیا تو اسے پانچ حصوں میں تقسیم کردیا، پھر ان پانچ حصوں کا قرعہ ڈالا گیا اور ایک حصے پر ''اللہ'' لکھ دیا گیا، جو اس مالِ غنیمت کا خُمس تھا۔ جب قرعہ نکلا تو پہلا حصہ خُمس کا نکل آیا۔ اس خُمس میں سے کوئی چیز بھی حاضرینِ مجلس کو نہیں دی گئی، حالاں کہ حضرت علیؓ سے قبل لوگ خُمس میں سے کچھ حصہ حاضرین کو دے دیا کرتے تھے۔ جب اس واقعے کی اطلاع رسول کریم ﷺ کو دی گئی تو آپؐ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اِدھر ان لوگوں نے حضرت علیؓ سے خُمس میں سے کچھ چیزوں کا مطالبہ کیا۔ حضرت علیؓ نے انکار کردیا اور کہا کہ خُمس تو میں رسول کریم ﷺ کے پاس لے کر جاؤں گا اور آپؐ کی رائے معلوم کروں گا۔ وہ وہی فیصلہ کریں گے جو اللہ تعالیٰ ان کے دل میں ڈالے گا اور پھر وہ جو حکم دیں گے وہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔''

''حضرت علیؓ خُمس کا مال لے کر روانہ ہوئے۔ جب (طائف کے قریب) مقام ''فتق'' پر پہنچے تو رسول کریم ﷺ سے ملنے کے اشتیاق میں، ابورافع کو اپنے ساتھیوں اور خُمس پر اپنا نائب مقرر کیا۔ خُمس میں یمن کے کچھ کپڑے تھے، کچھ بندھا ہوا سامان تھا، کچھ مویشی مالِ غنیمت اور کچھ مویشی اموالِ صِقہ میں سے تھے۔''

''حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ اس غزوے میں، میں بھی حضرت علیؓ کے ساتھ تھا۔ حضرت علیؓ ہمیں متواتر اس بات سے منع کررہے تھے کہ ہم صدقے کے اونٹوں پر سواری نہ کریں، حضرت علیؓ کے جانے کے بعد، لشکر والوں نے ابورافع سے کہا کہ وہ انھیں خُمس کے کپڑے پہننے دیں۔ ابورافع نے ہر شخص کو دو دو کپڑے دے دیئے۔''

''جب لشکر ''سدرہ'' پہنچا، جو مکے کے قریب ایک مقام ہے تو حضرت علیؓ لشکر کے استقبال کے لیے آئے تاکہ ان کی مہمان نوازی کریں۔ جب حضرت علیؓ نے لشکر والوں کو خُمس کے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو آپ نے پہچان لیا کہ یہ تو وہی خُمس کے کپڑے ہیں جنھیں پہننے سے انھوں نے منع کیا تھا۔''

''حضرت علیؓ نے ابورافع سے پوچھا کہ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟ ابورافع نے کہا کہ

لشکریوں نے مجھ سے آکر شکایت کی، میں ان کی شکایات سے متاثر ہوا اور انھیں اجازت دے دی۔ میں نے سوچا کہ یہ بات آپ کے حق میں بھی بہتر رہے گی کیوں کہ آپ سے پہلے لوگ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ تم نے میرے منع کرنے کے باوجود ان کو خُمس کے کپڑے کیوں دیئے؟ میں نے تو تمھیں ان پر نگران مقرر کیا تھا۔''

''حضرت علیؓ نے لشکریوں کے جسم سے وہ کپڑے اتروا لیے۔ جب یہ لشکری رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے اس واقعے کی شکایت کی۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے جس پر تمہارے ساتھی شاکی ہیں۔ حضرت علیؓ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! میں ان کی شکایت جائز نہیں سمجھتا۔ میں نے مالِ غنیمت تو ان میں تقسیم کردیا تھا لیکن خُمس ان کو نہیں دیا تھا بلکہ آپؐ کے پاس لایا ہوں تاکہ آپؐ فیصلہ کردیں، حالاں کہ اس سے قبل لشکر کے امیر خُمس کا کچھ حصہ جسے چاہتے، دے دیتے تھے۔ یہ سن کر رسول کریم ﷺ خاموش رہے۔''[۸۹]

(۳) دوسری صدی ہجری کا اواخر، تیسری صدی ہجری کا آغاز

۴۔ ابنِ سعد:

ابنِ سعد کی آٹھ جلدوں پر مشتمل کتاب ''طبقاتِ کبیر'' اسلامی تاریخ کا اہم ماخذ ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ ''مولا'' یا ''ولی'' والے قول کا کوئی ذکر نہیں ملتا، بلکہ اس پسِ منظر کا ذکر بھی نہیں جو پہلے ابنِ اسحاق، پھر ابنِ ہشام، اور اس کے بعد ابنِ سعد کے اپنے استاد واقدی کرچکے تھے۔ واضح رہے کہ ابنِ سعد کو ''کاتبِ واقدی'' کہا جاتا ہے۔ ابنِ سعد نے طبقاتِ کبیر کی پہلی جلد میں، جسے بعض حضرات نے ''کتاب النبیؐ'' کا نام دیا ہے، اس بارے میں جو لکھا ہے، اس سے چند اقتباسات پیش ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے علیؓ کو یمن بھیجا..... علیؓ تین سواروں کے ساتھ روانہ ہوئے.....

علیؓ نے غنائم پر بریدہؓ بن الحصیب الاسلمی کو مقرر کیا تھا۔ لوگوں کو جو کچھ ملا، ان کے پاس جمع کیا..... علیؓ نے تمام غنائم کو..... پانچ حصوں میں تقسیم کیا اور ان میں سے ایک حصے پر لکھ دیا: ''یہ اللہ کے لیے ہے۔'' قرعہ ڈالا تو سب سے پہلا خُمس کا نکلا۔ علیؓ نے بقیہ مالِ غنیمت اپنے ساتھیوں پر تقسیم کر دیا۔ پھر واپس ہوئے اور نبی ﷺ کے پاس مکہ میں آئے۔ آپؐ ۱۰ھ میں حج کے لیے وہاں تشریف لائے تھے۔''[۹۰]

۵۔ طبری:

ابوجعفر محمد بن جریر طبری (۲۲۵ھ-۳۱۰ھ) نے ''تاریخ الرسل والملوک'' کے نام سے کئی جلدوں پر مشتمل ایک شاہکار تاریخ لکھی، جو پہلی اور دوسری صدی ہجری کی اسلامی تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہے۔ قُم (ایران) سے شائع ہونے والی کتاب ''سقیفہ کے حقائق'' میں طبری کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ''اگرچہ طبری سنی مذہب تھے، مگر زندگی کے آخری لمحات میں ان کے تشیع کی طرف مائل ہونے کا احتمال دیا جاسکتا ہے۔''[۹۱] طبری کی وفات ان سب محدثین اور مورخین کے بعد ہوئی، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ طبری کے سامنے نہ صرف اپنے چار پیش رو عظیم مورخین کی کتبِ تاریخ تھیں بلکہ امام مالکؒ سے امام نسائیؒ تک تمام ممتاز مورخین کے مجموعہ ہائے احادیث بھی تھے۔

پنجاب یونیورسٹی کی شائع کردہ اردو دائرہِ معارفِ اسلامیہ کے الفاظ میں، تاریخِ طبری کا ایک اچھوتا وصف یہ ہے کہ ''طبری نے اپنی فراہم کردہ معلومات کو تاریخی واقعات کے مسلسل بیان کی شکل میں مرتب نہیں کیا، بلکہ یہ دیکھا کہ جو مختلف بیانات بھی مل جائیں، خواہ وہ باہم متناقض ہی کیوں نہ ہوں، انھیں اسی شکل میں، جس میں وہ ان تک پہنچتے تھے، لکھ دیا جائے، چنانچہ اسی لیے وہ ان روایات کی صحت کی کوئی ذمے داری لینے سے منکر ہیں، جو انھوں نے جمع کر دی ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اس بے لوث اور غیر مرتب مجموعۂ روایات کی تکرار ہی میں موجودہ زمانے کی تاریخی تحقیق وجستجو کے سلسلے میں اس تصنیف کی اصل قدر و قیمت مضمر ہے،

بالخصوص اس وقت جب اسلام کے ابتدائی زمانے کے واقعات کو ازسرِ نو مرتب کرنے کا سوال درپیش ہو۔''[۹۲]

طبری کے اس اچھوتے وصف کی ایک مثال رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات ہے۔ اس بارے میں طبری تک جو روایات پہنچیں، وہ سب تاریخِ طبری میں درج کر دی گئیں، چنانچہ تاریخِ طبری میں آپؐ کی تاریخِ وفات کے حوالے سے حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابنِ سعد کے استاد واقدی کے حوالے سے روایات درج ہیں۔

طبری کے اس پسِ منظر سے آگاہ ہونے کے بعد، اگر اکیسویں صدی عیسوی کے باشعور مسلمان کو یہ معلوم ہو کہ طبری نے اپنی ضخیم اور جامع تاریخ میں نہ ''مولا'' والی روایت درج کی، اور نہ ''ولی'' والی، بلکہ تقریباً وہی لکھا جو ان کے پیش رو مورخین کی کتابوں میں موجود ہے، تو قاری کیا نتیجہ اخذ کرے گا؟ تاریخِ طبری کا واحد متعلقہ اقتباس یہ ہے، جس کے علاوہ اس میں کچھ اور درج نہیں:

''رسول اللہ ﷺ سے ملنے کے لیے جب حضرت علیؓ یمن سے مکے آئے تو انھوں نے آپؐ سے ملاقات کے لیے بڑی جلدی کی۔ وہ اپنے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو اپنی فوج میں اپنا نائب بنا کر چلے آئے۔ اس شخص نے یہ کیا کہ جو اعلیٰ درجے کے کپڑے جزیے میں وصول ہوئے تھے اور ساتھ تھے، ان سب کو توشہ خانے سے نکلوا کر اپنی فوج کو پہنا دیئے۔ جب یہ فوج مکے کے قریب آئی تو حضرت علیؓ ان کو دیکھنے آئے۔ یہاں آکر انھوں نے دیکھا کہ تمام فوج حلے پہنے ہوئے ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے نائب سے اس کے متعلق جواب طلب کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے حلے اس لیے انھیں پہنا دیئے ہیں کہ جب یہ سب کے سامنے سے گزریں تو بھلے معلوم ہوں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے کہ تم اس حالت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچو، ان حلوں کو اتار دو، چنانچہ انھوں نے وہ تمام حلے فوج سے لے کر پھر سے توشہ خانے میں رکھوا دیئے۔ یہ بات فوج کو ناگوار ہوئی اور انھوں نے اس طرزِ عمل کا شکوہ کیا۔''

''ابوسعید الخدریؓ سے مروی ہے کہ لوگوں نے علیؓ کی شکایت کی۔ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ میں (ابوسعید الخدریؓ) نے آپؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اے لوگو! تم مجھ سے علیؓ کی شکایت نہ کرو۔ بخدا وہ بے شک اللہ کے لیے، یا آپؐ نے فرمایا اللہ کی راہ میں بہت سخت ہے۔'' [۹۳]

مندرجہ بالا تفصیلات پڑھنے کے بعد، احادیث اور تواریخ کے درمیان دو نمایاں فرق نظر آتے ہیں:

(۱) وجۂ شکایت۔ یہ سب سے بڑا فرق ہے۔ یہاں اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا حدیث کو تاریخ پر ترجیح دی جائے یا تاریخ کو حدیث پر؟

(۲) کیا شکایت کنندہ ایک تھا یا ایک سے زائد تھے؟ احادیث کے مطابق شکایت کنندہ صرف حضرت بریدہ الاسلمیؓ تھے۔

تواریخ کے مطابق یہ شکایت حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل ان صحابیوں کو حضرت علیؓ سے ہوئی، جنھیں حضرت علیؓ کے حکم پر خُمس کے حصے سے نکال کر زیب تن کیے ہوئے وہ عمدہ لباس اتارنے پڑے، جو انھوں نے وقتی طور پر صرف اس لیے پہن لیے تھے کہ وہ لوگوں کی نظروں میں جچیں۔ اب اصل بات کی طرف آئیں جس کے لیے یہ تمام تفصیلات بیان کرنی ضروری تھیں۔

شکایت خواہ کچھ ہی ہو، لیکن اگر درست ہوتی تو رسول کریم ﷺ حضرت علیؓ کی حمایت ہرگز نہ کرتے۔ شکایت اتنی غلط تھی، اور اس کے باوجود اتنی پھیل چکی تھی کہ ابتدائی تاریخ کے مطابق، جو بعد میں آنے والے مورخین کا ماخذ بنیں، آپؐ نے مجمعِ عام میں کہا کہ لوگو! علیؓ کی شکایت مت کرو۔ اللہ کی قسم، وہ اللہ کی راہ میں اس چیز سے کہیں زیادہ محتاط ہیں کہ ان کی شکایت کی جائے۔ یہ تو تواریخ کی بات ہوئی۔ احادیث میں اس بارے میں جو کچھ لکھا گیا، اس کے دہرانے سے طوالت کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہم صرف یہ کہیں گے، اور اس کے بعد فیصلہ اکیسویں صدی عیسوی کے باشعور مسلمان پر چھوڑیں گے، کہ خواہ آپؐ نے حضرت علیؓ کے بارے میں وہ کہا جو دوسری اور تیسری صدی ہجری کی تواریخ میں درج ہے، یا وہ کہا جس کا آغاز مسند

امام حنبلؒ سے ہوا اور جو صحاح ستہ کے صرف دو مجموعہ ہائے حدیث میں، بعد میں درج ہوا، رسول کریم ﷺ حضرت علیؓ سے اپنی بے پناہ محبت کا بھرپور اظہار، اس واقعے سے تین سال پہلے، سنہ سات ہجری میں، اس سے کہیں زیادہ فصیح، اور کہیں زیادہ محبت بھرے الفاظ میں یہ کہہ کر کر چکے تھے کہ ''تو (علیؓ) مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔'' حضرت علیؓ کے بارے میں اس لافانی قول کو صحیح تناظر میں سمجھنے کے لیے، یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ آپؐ نے اس کے بعد، اور اپنے مرض الموت کے دوران میں، اپنی زندگی کے آخری ہفتے میں، ایک اور صحابی کے لیے اپنی محبت، اور ان کے رتبے، کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ ''اگر میں (اپنے رب کے علاوہ) کسی کو دوست بنا سکتا، تو وہ ابوبکرؓ ہوتے۔'' [۹۴]

''مولا'' کے لفظ کو دنیاوی جانشین کے معنوں کی زریں خلعت پہنانے کا طویل جائزہ مندرجہ بالا صفحات میں صرف اس لیے لیا گیا ہے تاکہ اکیسویں صدی کے مسلمان کو اس کے ہر پہلو سے آگہی ہو سکے، ورنہ اس تحریر کے آغاز میں صرف اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ اگر آپؐ حضرت علیؓ کو واقعی اپنا جانشین بنانا چاہتے تو اس کے اعلان کی صحیح تاریخ عرفات میں ۹/ذی الحج ۱۰ھ تھی نہ کہ خمِ غدیر پر ۱۸/ذی الحج ۱۰ھ، اور اس کا صحیح مقام میدانِ عرفات تھا نہ کہ خمِ غدیر، اور آپؐ کا یہ فیصلہ، فیصلہ کن الفاظ میں ہوتا، نہ کہ ایسے مبہم الفاظ میں جس سے آپؐ کی امت چودہ سو سال تک تاویلوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھرے۔ اگر آپؐ نے وہی کہا جو روایت بتاتی ہے تو اس کی وجہ کوئی ایسی بات ہے جو ۹/ذی الحج اور ۱۸/ذی الحج ۱۰ھ کے درمیان آپؐ کے علم میں آئی، جس کے بعد یہ ضروری ہو گیا تھا کہ آپؐ حضرت علیؓ سے محبت اور یک جہتی کا بھرپور اظہار کریں۔

اب صرف یہ دیکھنا رہ گیا ہے کہ کیا اللہ کے کلام میں ''مولا'' کا لفظ ہے، اور ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کا کلام ''مولا'' کے ایک معنی بتائے اور اللہ کا رسولؐ اسے کوئی اور معنی پہنائے۔ اکیسویں صدی عیسوی کے مسلمان کے لیے یہ مقامِ فکر ہے کہ جس طرح ''گم راہی سے بچانے والی دستاویز'' کی یہ تاویل گھڑی گئی کہ وہ کبھی نہ لکھی جانے والی دستاویز حضرت علیؓ کی جانشینی کے لیے لکھی، یا لکھوائی، جا رہی تھی لیکن کسی صحابی، یا بعض صحابہ،

نے رسول کریم ﷺ کی رائے سے اختلاف کر کے اسے لکھوانے کا موقع نہیں دیا، بلکہ بقول ''سقیفہ کے حقائق'' (صفحہ:۸۱) ''اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت عمر نے اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ پیغمبر اسلام حضرت علیؑ کی خلافت کے سلسلے میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں''، اسی طرح یہاں لفظ ''مولیٰ'' کو جانشین کے معنی دیئے گئے، اور پھر کہا گیا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی مصنف مزاج اس کی تردید کر سکے۔

ہم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منسوب ''گمراہی سے بچانے والی دستاویز'' کی حدیث کو تین حصوں میں بانٹ کر، ہر حصے کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیا تھا اور فیصلہ اکیسویں صدی عیسوی کے مسلمان پر چھوڑ دیا تھا۔ یہاں بھی ہم قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

''مولیٰ'' کا لفظ قرآن میں بار بار استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی اگر کہیں کارساز ہیں تو کہیں دوست، حمایتی یا مددگار۔ ''مولیٰ'' کا لفظ کہیں بھی خلیفہ یا جانشین کے معنی میں نہیں آیا۔ قرآن کی عربی، قریشِ مکہ کی معیاری عربی زبان تھی اور یہی رسول کریم ﷺ کی زبان بھی تھی۔ قرآن لفظ ''مولیٰ'' کے کیا معنی بتاتا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے دو ایسی آیات کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک آیت میں ''مولیٰ'' کا لفظ دوبار آیا ہے۔

سورۃ انفال (نمبر۸) کی ۴۰ویں آیت کا متعلقہ ٹکڑا جس میں ''مولیٰ'' کا لفظ ''کارساز'' کے معنی میں، دوبار، آیا ہے، یہ ہے:

آیت	ترجمہ
ان اللہ مولیٰکم نعم المولیٰ	بے شک اللہ تمہارا کارساز ہے، وہ بہت اچھا کارساز ہے۔

دوسری مثال سورۃ دخان (نمبر۴۴) کی ۴۱ویں آیت ہے، جس میں ''مولیٰ'' کا لفظ ''دوست'' کے معنی میں، دوبار، اس طرح آیا ہے:

آیت	ترجمہ
یوم لایغنی مولیٰ عن مولیٰ شئیًا	اس دن کوئی دوست کسی دوست کے کام نہ آئے گا۔

یہ تو قرآن کی بات ہوئی۔ اب اگر یہ صرف معلوم نہیں بلکہ ثابت ہو جائے کہ خود حضرت علیؑ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ انھیں رسول کریم ﷺ نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا، اور اس کے باوجود بھی ۲۰۰۶ء میں، قُم (ایران) سے کوئی کہے کہ ''اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت عمر نے اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ پیغمبر اسلام حضرت علیؑ کی خلافت سے سلسلے میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں'' [۹۵] اور ''مولیٰ'' کے معنی ''جانشین'' بتاتے ہوئے، کوئی یہ لکھے، جیسا کہ ''سقیفہ کے حقائق'' کے صفحہ ۵۵ پر (بغیر کوئی قرائن، شواہد اور دلائل دیئے) تمہید میں ہی لکھ دیا گیا ہے کہ:

> ''رسول اکرمؐ کے قول کی صراحت اور بے شمار قرائنِ حالیہ اور مقالیہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ مولا سے مراد ولایت اور جانشینی ہی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی منصف مزاج اور مخلص محقق اس قدر شواہد اور ادلہ کے باوجود اس بات میں ذرا سی بھی تردید رکھتا ہو'' [۹۶]

جب بات یہ کہہ کر کی جائے کہ ''اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں''، اور پھر کوئی صراحت، قرائن، شواہد اور دلائل دیئے بغیر، تمہید ہی اس سے باندھی جائے کہ ''یہ ممکن نہیں ہے'' تو ہم ایک لاحاصل اور لامتناہی بحث میں الجھنے کی بجائے یہ کہیں گے کہ اے مولیٰ! اے ہمارے کارساز! ہم نے تیرے رسولؐ کے کلام کو تیرے کلام کی روشنی میں سمجھنے کی اپنی سی پوری کوشش کی ہے۔ اے مولیٰ! ''**اھدنا الصراط المستقیم، اَلخ**''۔ اگر ہم ''مولیٰ'' کا صحیح مطلب نہیں سمجھ رہے، تو ہمیں سمجھا دے۔ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ تو ہم سب پر چیزوں کی حقیقت اور الفاظ کے معنی کھول دے۔

اب اس کی بات ہو جائے کہ حضرت علیؑ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ رسول کریم ﷺ نے انھیں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اس کا ثبوت ''**نھج البلاغۃ**'' [۹۷] ہے، جس سے بڑا ثبوت پیش کرنا مشکل ہے۔

جنگِ صفین سے پہلے، جو صفر ۳۸ھ/ جولائی ۶۵۸ء میں ہوئی، حضرت علیؑ اور امیر

معاویہ کے درمیان تقریباً ایک سال تک خط وکتابت ہوتی رہی۔[۹۸] اس دوران میں، حضرت علیؓ نے اپنے حقِ خلافت کی تائید میں امیر معاویہ کو جو خطوط لکھے، وہ نہج البلاغۃ میں موجود ہیں۔ کسی خط میں حضرت علیؓ نے یہ نہیں لکھا کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا، حالاں کہ اگر مقرر کیا ہوتا تو خلافت پر اپنا حق تسلیم کرانے کے لیے اس سے زیادہ مضبوط دلیل اور کیا ہوسکتی تھی؟ یہ دلیل نہ کبھی حضرت فاطمہؓ نے پیش کی، نہ امام حسنؓ نے اور نہ امام حسینؓ نے۔ مقامِ حیرت ہے کہ جو بات اللہ کے رسول ﷺ، حضرت علیؓ اور ان کے بیوی بچوں میں سے کسی نے نہیں کی، وہ بات حضرت علیؓ کے بارے میں دوسرے کیوں کر رہے ہیں، اور صدیوں سے کیے جارہے ہیں؟

وہ یہ کیوں کر رہے ہیں؟ یہ وہ بات ہے جس کی طرف ہم نے اس تحریر کے ابتدائی صفحات میں یہ کہہ کر توجہ دلائی تھی کہ اکیسویں صدی عیسوی کے مسلمان کو، کم از کم، ان روایات پر ضرور تدبر کرنا چاہیے، جنھوں نے امتِ محمدی کو تقسیم کر دیا ہے۔ ان روایات پر معروضی انداز، ٹھنڈے دل اور کھلے دماغ سے غور وفکر کرنا اکیسویں صدی عیسوی کی اہم اور اشد ترین ضرورت ہے۔ پہلے ہی بہت دیر ہوچکی ہے۔ اب کتنی صدیاں اور انتظار کیے جائیں؟

اگر اس غور وفکر کے بعد بھی، بعض خواتین وحضرات یہ کہیں کہ گو رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا، لیکن نامزدگی کی ضرورت ہی کیا تھی؟ حضرت علیؓ آپؐ کے سگے چچازاد بھائی تھے، داماد تھے، بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، اس بنیاد پر انھیں خلافت کا منصب وراثت میں مل جانا چاہیے تھا، جس کے لیے وصیت کی ضرورت نہ تھی، تو اس موقف کا بھی دینی، قانونی اور علمی زاویہ ہائے نگاہ سے جائزہ لینا ضروری ہے۔

دینی نقطۂ نظر سے:

(۱) نبوت اللہ کا انتخاب ہوتا ہے اور اللہ کے انتخاب میں وراثت نہیں چلتی۔ رسول کریم ﷺ کے انتقال پر نبوت اور رسالت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ جب سلسلہ

ہی ختم ہوگیا تو وراثت کیسی؟

(۲) اسلام سیاست میں نہیں پڑتا۔ قرآن اور حدیث میں حکمران کی جانشینی سمیت کسی سیاسی نظام کے خدوخال نہیں دیئے گئے۔ قرآن میں شورائیت پر ضرور زور دیا گیا ہے، لیکن یہ ایک آفاقی اصول کے طور پر ہے اور اس کا اطلاق ہر اہم کام پر ہوتا ہے۔

قانونی نقطۂ نظر سے:

(۳) اسلام میں جائیداد کی تقسیم ورثا میں ہوتی ہے۔ حکومت یا ریاست جائیداد نہیں ہوتی۔ یہ نہ کئی ورثا میں بٹتی ہے اور نہ کسی ایک وراث کو ملتی ہے۔

(۴) رسول کریم ﷺ کے انتقال کے وقت، آپؐ کی اولاد میں صرف حضرت فاطمہؓ زندہ تھیں۔ اگر خلافت وراثت کی بنا پر ملتی تو حضرت فاطمہؓ کو ملتی۔

(۵) وارث بیٹا بیٹی تو ہوتے ہیں لیکن بہو یا داماد نہیں۔ اگر قانون کی کسی تشریح کی بنا پر، حضرت فاطمہؓ کو خلافت نہیں مل سکتی تھی، تو پھر آپؐ کے واحد زندہ چچا حضرت عباسؓ وارث بنتے۔ یہاں پھر یہ قانونی وضاحت ضروری ہے کہ چچا یا بھائی تو وارث ہوسکتے ہیں، لیکن چچیرا بھائی نہیں۔

علمی اور تاریخی نقطۂ نظر سے:

(۶) اسلامی تاریخ میں، وراثت کی بنیاد پر خلافت کی روایت امیر معاویہ نے ڈالی، جس کی وجہ سے وہ پچھلی چودہ صدیوں سے، بجا طور پر، تنقید کا نشانہ ہیں۔ اکیسویں صدی عیسوی کا مسلمان سوچے کہ اگر یہ روایت حضرت علیؓ کی جانشینی سے شروع ہوتی، تو تنقید کا ہدف کون بنتا؟ ذرا سوچیے۔

ہم نے اس مسئلے کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ آغاز حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منسوب ''گمراہی سے بچانے والی دستاویز'' کے تجزیے سے کیا تھا۔ اختتام رسول کریم ﷺ کے اس فرمودے سے کریں گے کہ ''حکومت کے لیے سوال نہ کرو۔ اگر بن مانگے ملی تو تمھاری مدد کی جائے گی، اگر مانگنے سے ملی، تو تم اس کے سپرد کر دیئے جاؤ

گے۔‘‘[۹۹] اب پھر جمعرات کے واقعات کی طرف لوٹتے ہیں۔

جمعرات کے واقعات کا آغاز، ہم نے ’’گمراہی سے بچانے والی دستاویز‘‘ سے کیا تھا۔ یہ سمجھنا کہ اس روز آپؐ کی جسمانی طاقت یا قوتِ ارادی انتہائی کمزور ہوگئی تھی، اس بات سے غلط ثابت ہوجاتا ہے کہ اس روز آپؐ نے فجر سے مغرب تک تمام نمازوں کی امامت کی۔[۱۰۰]

عشا کا وقت آیا تو نقاہت اتنی بڑھ گئی کہ حجرے سے چند قدم دور مسجدِ نبوی میں جانے کی سکت نہیں رہی تھی، لیکن آپؐ کی قوتِ ارادی مضبوط تھی، جو اگلی سطور سے واضح ہوجائے گا۔ صحابہ مسجدِ نبوی میں آپؐ کا انتظار کررہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا: ’’کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟‘‘[۱۰۱] کہا گیا کہ آپؐ کا انتظار ہورہا ہے۔ فرمایا: ’’غسل کے لیے پانی رکھو‘‘[۱۰۲] غسل کیا اور باہر نکلنا چاہا تو بے ہوش ہوگئے[۱۰۳] ہوش آیا تو پوچھا: ’’کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟‘‘[۱۰۴] بتایا گیا کہ آپؐ کا انتظار ہورہا ہے۔ دوسری بار غسل کیا اور اٹھنا چاہا تو پھر بے ہوش ہوگئے۔[۱۰۵] ہوش میں آئے تو تیسری بار پوچھا: ’’کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟‘‘[۱۰۶] جواب تھا کہ آپؐ کا انتظار ہورہا ہے۔ تیسری بار غسل کیا تو پھر بے ہوش ہوگئے۔[۱۰۷]

اب واضح ہوگیا تھا کہ جسمانی قوت جواب دے گئی ہے، ہوش آیا تو فرمایا: ’’ابوبکر سے کہو کہ نماز پڑھائیں‘‘[۱۰۸] حضرت عائشہؓ کو خیال آیا کہ آپؐ کے صحابہ، آپؐ کے مصلے پر، آپؐ کے ہوتے ہوئے، کسی دوسرے کو امام دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔[۱۰۹] اگر آپؐ کو کچھ ہوگیا تو یہ باتیں بنیں گیں کہ ابوبکرؓ منحوس تھے۔[۱۱۰] حضرت عائشہؓ نے کہا کہ میرے باپ رقیق القلب ہیں۔ جب وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو ان پر اتنی رقت طاری ہوجاتی ہے کہ ان کی آواز ڈوب جاتی ہے۔ یہ کام کسی اور کو سونپ دیں۔[۱۱۱]

آپؐ نے شدید نقاہت کے عالم میں اپنا فیصلہ دہرایا۔[۱۱۲] حضرت عائشہؓ نے بھی اپنا معروضہ دہرایا[۱۱۳] اور اس بار امامت کے لیے نام بھی تجویز کیا، جو حضرت عمرؓ کا تھا۔[۱۱۴] حضرت عائشہؓ کے کہنے پر، حضرت حفصہؓ نے بھی اس تجویز کی تائید کی۔[۱۱۵] ’’گم راہی سے بچانے والی دستاویز‘‘ کی روایت کے برعکس، آپؐ نے یہ سن کر ’’خفگی اور بے چارگی‘‘ سے یہ نہیں

کہا کہ تم سب یہاں سے چلی جاؤ، اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ یہ کسی عام آدمی کا فیصلہ نہ تھا۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کا فیصلہ تھا۔

آپؐ نے یہ سن کر ’’خفگی مگر سختی‘‘ سے کہا، اور اس کی راوی خود حضرت عائشہؓ ہیں، کہ تم عورتیں یوسفؑ کی ساتھی (هَـوَاحِـبُ یوسفؑ) عورتوں کی طرح ہو۔[۱۱۶] ابوبکر سے کہو کہ نمازِ عشا کی امامت کریں۔[۱۱۷] اس طرح حضرت ابوبکرؓ نے مسجدِ نبوی میں جمعرات کو نمازِ عشا کی امامت اس وقت کی جب رسول کریم ﷺ مدینے میں موجود تھے، اور دو قدم پر موجود تھے۔ اس کے بعد، جمعے، ہفتے اور اتوار کو بھی انھوں نے پانچوں وقت کی نمازوں کی امامت کی اور پیر کے روز نمازِ فجر تک کرتے رہے۔[۱۱۸]

اس طرح جمعرات کا دن گزر گیا۔ جمعے اور ہفتے کے بارے میں ایسی کوئی قابلِ ذکر بات نہیں جو صراحتاً ان دو دنوں سے مخصوص بتائی گئی ہو۔ اس کے بعد اتوار آ گیا۔

اتوار۔ وفات سے ایک دن پہلے:

اتوار (اور بعض روایات کے مطابق ہفتے) کو رسول کریم ﷺ نے دوپہر کے وقت افاقہ محسوس کیا تو نماز کی چاہت نے حسبِ معمول بے چین کردیا۔ مسجدِ نبوی میں نمازِ ظہر[۱۱۹] کی جماعت حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں کھڑی ہوچکی تھی۔ آپؐ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کا سہارا لیے ہوئے مسجدِ نبوی میں داخل ہوئے۔[۱۲۰] حجرے کا دروازہ جماعت کی پہلی صف کے بالمقابل تھا۔ آپؐ کی آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگے۔[۱۲۱] آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا کہ امامت کرتے رہو، اور حضرت ابوبکرؓ کے بائیں جانب جا کر بیٹھ گئے۔[۱۲۲] اگر دائیں طرف سے جاتے تو جماعت کے آگے سے گزرنا ہوتا۔ اب نماز اس طرح پڑھی گئی کہ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کو دیکھ کر نماز کے ارکان ادا کرتے، اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر باقی صحابہ نماز پڑھتے جاتے تھے۔[۱۲۳] آپؐ نے بیٹھے ہوئے اور حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہوکر نمازِ ظہر پڑھی۔

نمازِ ظہر کی ادائیگی کے بعد، آپؐ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں واپس آئے تو مرض

نے شدت پکڑلی۔ حجرے میں حضرت عباسؓ اور آپؐ کی بیویوں میں سے کم از کم تین یعنی حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ موجود تھیں۔[۱۲۴] اس کے علاوہ حضرت اسماؓ بنت عمیس تھیں،[۱۲۵] جن کا تعارف کرانا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ وہ وہاں کیسے آ گئیں۔

حضرت اسماؓ اور حضرت میمونہؓ ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ تین برس پہلے تک، حضرت اسماؓ آپؐ کے سگے چچازاد بھائی حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی بیوی تھیں۔ رسول کریم ﷺ کی وفات سے تین سال پہلے، حضرت جعفرؓ جنگِ موتہ میں شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد، حضرت اسماؓ کی کفالت کے لیے، حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسماؓ سے شادی کر لی۔ اس شادی سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام محمد رکھا گیا، اور جو تاریخ میں محمد بن ابوبکر کے نام سے مشہور ہے۔ محمد بن ابوبکر نے ۲۳ برس بعد، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے دن جو شرمناک کردار ادا کیا، اس کا ذکر تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ شہادتِ عثمانؓ کے کچھ عرصے بعد، نوجوان محمد بن ابوبکر کو مصر میں عبرت ناک طریقے سے ہلاک کر دیا گیا۔ رسول کریم ﷺ کے وصال کے سوا دو سال بعد، حضرت ابوبکرؓ وفات پا گئے۔ اب حضرت اسماؓ کی کفالت کے لیے ان کے سابق دیور حضرت علیؓ نے ان سے شادی کر لی۔ حضرت جعفرؓ، حضرت علیؓ سے کوئی دس سال بڑے تھے، اور ان چند صحابہ میں تھے جنھوں نے ہجرتِ مدینہ سے کئی سال پہلے، حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی، وہ مزید چھے سال حبشہ میں رہے اور حضرت اسماؓ بنت عمیس بھی اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ میں رہیں۔

حضرت اسماؓ بنت عمیس نے حبشہ (موجودہ ایتھوپیا) میں، اپنے طویل قیام کے دوران میں ایک دوا بنانے کی ترکیب سیکھ لی تھی۔ یہ دوا موجود تھی۔ سب کی رائے ہوئی کہ آپؐ کو یہ دوا پلائی جائے۔ دوا دینے لگے تو آپؐ نے اشارے سے منع کر دیا۔[۱۲۶] اس کے بعد آپؐ بے ہوش ہو گئے۔ تیمارداروں نے فیصلہ کیا کہ اب یہ دوا پلانے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ آپؐ کے منع کرنے کے باوجود، آپؐ کے مونہہ میں دوا کون ڈالے گا؟

حضرت عباسؓ نے حامی بھر لی۔ آپؐ کے دانت بھچے ہوئے تھے۔ حضرت عباسؓ نے

دانتوں کے کناروں کے بیچ میں سے دوا انڈیل دی۔[۱۲۷] لگتا ہے کہ دوا نے اثر دکھایا۔ آپؐ کو ہوش آ گیا۔ مونہہ کا ذائقہ بدلا ہوا پایا تو پوچھا: ''میرے ساتھ یہ کس نے کیا ہے؟'' بتایا گیا کہ آپؐ کے چچا عباسؓ نے۔ آپؐ نے حضرت عباسؓ سے پوچھا: ''تم نے یہ کیوں کیا؟'' انھوں نے ایک بیماری کا نام لے کر کہا: ''یارسول اللہؐ! ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں آپؐ کو یہ بیماری نہ ہو؟ یہ دوا اس بیماری کی تھی۔'' آپؐ نے فرمایا کہ اللہ مجھے اس بیماری میں ضائع نہ کرے گا۔ پھر آپؐ نے خفگی کے عالم میں حکم دیا کہ حضرت عباسؓ کے علاوہ ہر فرد جو حجرے میں موجود ہے، یہ دوا پیئے۔[۱۲۸] حکم کی تعمیل ہوئی۔ حضرت عباسؓ کی سالی، حضرت اسما بنت عمیس کی بہن، اور آپؐ کی زوجہ حضرت میمونہؓ نے نفلی روزہ رکھا ہوا تھا۔ حضرت میمونہؓ کو بھی یہ دوا پینی پڑی۔[۱۲۹] آپؐ نے، خفگی کے عالم میں، یہ نہیں کہا کہ تم سب میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ سخت نقاہت کے باوجود، آپؐ کی قوتِ ارادی برقرار تھی۔ جب آپؐ کوئی حکم دیتے، خواہ وہ حضرت ابوبکرؓ کی امامت کے بارے میں ہو، یا اپنے تیمارداروں کو اپنی مرضی کے خلاف دوا پلانے کے بارے میں، تو اس کی تعمیل ہوتی تھی۔ یہاں ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس روایت میں حجرے میں موجود پانچ افراد کے نام لیے گئے ہیں، جب کہ ''دستاویز'' والی روایت میں، حجرے میں موجود افراد میں سے صرف ایک نام حضرت عمرؓ کا لیا گیا ہے۔ نہ جانے کیوں؟

بیماری کے ان ایام میں، آپؐ کے منہ بولے بیٹے زیدؓ کے نوجوان بیٹے اسامہؓ آپ کی خیریت معلوم کرنے آئے۔ اسامہؓ، ام ایمنؓ کے بطن سے تھے۔ وہ ایک حبشی کنیز تھیں، جو آپؐ کے والد حضرت عبداللہ نے ترکے میں چھوڑی تھیں۔ انھوں نے آپؐ کو دودھ پلایا تھا۔ حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد، آپؐ نے ام ایمنؓ کو آزاد کر کے، ان کی شادی اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ بن حارثہ سے کر دی تھی۔

تقریباً تین برس پہلے، جمادی الاولیٰ ۸ھ (ستمبر ۶۲۹ء) میں، زیدؓ بن حارثہ رومیوں سے عرب اور شام کی سرحد پر جنگ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ صفر ۱۱ھ (اپریل ۶۳۲ء)

میں، اپنی وفات سے مہینے بھر پہلے، رسول کریم ﷺ نے نوجوان اسامہؓ کی قیادت میں ایک فوج تیار کی جس میں حضرت عمرؓ جیسے جید صحابی شامل تھے۔ بعض صحابہ اسامہؓ کی عمر اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کے انتخاب پر معترض تھے۔ جب آپؐ نے مسجدِ نبوی میں ظہر کے وقت اپنی زندگی کا آخری خطبہ دیا تھا تو آپؐ نے اسامہؓ پر ہونے والے اعتراض کو مسترد کر دیا تھا۔

جب اسامہؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ کی نقاہت اتنی بڑھ چکی تھی کہ آپؐ کے مونہہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ آپؐ لیٹے لیٹے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے اور اسامہؓ پر رکھ دیتے۔[۱۳۰] اتوار کو آپؐ نے اپنے تمام غلاموں کو آزاد کر دیا۔[۱۳۱] بعض روایات میں ان کی تعداد چالیس بتائی گئی ہے،[۱۳۲] جو درست معلوم نہیں ہوتی۔ پھر آپؐ کو یاد آیا کہ کچھ عرصے پہلے، آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے پاس چند دینار رکھوائے تھے۔ پوچھا: ''عائشہ! وہ دینار کہاں ہیں؟ کیا محمدؐ اپنے رب سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ ان کو ابھی خرچ کر دو۔'' حکم کی تعمیل ہوئی۔ ان کی تعداد پانچ سے نو کے درمیان تھی۔[۱۳۳] اللہ کے آخری رسولؐ کی زندگی کی آخری رات اس شاہانہ شان سے گزری کہ کچی مٹی، کھجوروں کی ٹہنیوں اور پتوں سے بنے ہوئے اس ۱۶ فٹ لمبے اور ۱۲ فٹ چوڑے حجرے میں دیے کے لیے تیل تک نہ تھا۔ حضرت عائشہؓ نے پڑوسن سے تیل ادھار لیا۔[۱۳۴] رات بھر یہ ننھا سا دیا ٹمٹماتا رہا اور پھر ماہ ربیع الاوّل میں پیر کی صبح آ گئی۔ ایسی پیر جو نہ اس سے پہلے کبھی آئی اور نہ اس کے بعد کبھی آئی۔

پیر۔ یومِ وفات:

دس برس پہلے، ربیع الاوّل ۱۱ھ (ستمبر ۶۲۲ء) کے مہینے میں، رسول کریم ﷺ اپنا جدی پشتی شہر مکہ چھوڑ کر یثرب کے جنوب میں ایک نواحی نخلستان میں پہنچے تھے جس کا نام ''قبا'' بقا پا چکا ہے۔ روایات کے مطابق، آپؐ نے یکم ربیع الاوّل ۱ھ، جو ۱۳ر ستمبر ۶۲۲ء بروز پیر تھا، کو غارِ ثور سے نکل کر مدینے کی طرف اونٹنی پر سفر کا آغاز کیا تھا اور تقریباً ۳۰۰ میل (۴۵۰ کلومیٹر) کا فاصلہ گیارہ دن میں طے کیا تھا۔ دس برس پہلے، ربیع الاوّل ماہ ستمبر میں تھا اور موسم بہتر تھا، ربیع

الاوّل ۱۱ھ جون کے آغاز میں آیا تھا اور گرمی اپنے عروج پر تھی۔

پیر[۱۳۵] کو نمازِ فجر کا وقت تھا۔ آپؐ کے صحابہ حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں دوگانہ فرض ادا کر رہے تھے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے حجرے کے دروازے پر لٹکا ہوا پردہ ہٹایا، اور حجرے کے دروازے میں کھڑے ہو گئے، جو مسجدِ نبویؐ کی پہلی صف کے سامنے کھلتا تھا۔ آپؐ کچھ دیر کھڑے رہے اور صحابہ کو صف باندھے نماز پڑھتے دیکھتے رہے۔ آپؐ کے بیمار چہرے پر ملکوتی تبسم پھیل گیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور صحابہ کی نظر آپؐ پر پڑی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کا دھیان آپؐ کی طرف لگا ہوا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ سمجھے کہ آپؐ، ایک بار پھر، نماز میں شامل ہونے کے لیے آ رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے الٹے پاؤں پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک دیا اور حجرے کے اندر تشریف لے گئے۔ دروازے پر پردہ ڈال دیا۔[۱۳۵]

صبح صبح آپؐ کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر، صحابہ کو بجا طور پر خیال ہوا کہ آپؐ کی طبیعت سنبھل گئی ہے۔ ان کا خیال ان کی خواہش کا عکاس تھا۔ بھلا کسے یہ خواہش نہ ہوتی؟ ہر طرف اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ نماز کے بعد حضرت ابوبکرؓ حجرے میں گئے اور کہا کہ میں کئی روز سے یہیں ہوں، اجازت دیں تو اپنی بیوی[۱۳۶] سے ملنے چلا جاؤں، جو سنح[۱۳۷] کے گاؤں میں مدینے سے تین میل پرے کوہِ احد[۱۳۷] کے پاس رہتی تھیں۔ آپؐ نے بخوشی اجازت دی۔ اس کا ذکر نہیں ملتا کہ اجازت دیتے وقت، آپؐ نے پیر کو نمازِ ظہر اور اس کے بعد کی نمازوں کی امامت کے لیے کسے نامزد کیا۔ اسی طرح یہ ذکر بھی نہیں ملتا کہ پیر کو نمازِ ظہر کی امامت کس نے کی؟ اور عصر، مغرب اور عشا کی نمازوں کی امامت کس نے کی؟

نمازِ ظہر کے بارے میں ذکر نہ ملنے کی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت آپؐ وفات پا چکے ہوں (زاغت الشّمس نمازِ ظہر کا وقت ہوتا ہے) اور سب کی ساری توجہ اس اندوہناک واقعے پر مرکوز ہو۔ سوال یہ ہے کہ عصر، مغرب اور عشا کی نمازوں کا ذکر کیوں نہیں ملتا؟ یہ سوال بدستور ایک سوال ہے کہ مسجدِ نبوی میں ان تین نمازوں کی امامت کس نے کی؟ اور کیا وہاں باجماعت

نمازیں پڑھی گئیں؟

پیر کی صبح، حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ کے حجرے کے اندر گئے، باہر آئے تو صحابہ نے آپؐ کی طبیعت کے بارے میں پوچھا، جواب دیا: ''الحمدللہ! پہلے سے بہتر ہیں۔''[۱۳۸] تاریخ کا ایک باب یہاں ختم ہوتا ہے۔

یہاں سے تاریخ ایک ناخوشگوار موڑ لیتی ہے۔ یہ سن کر، عباسؓ بن عبدالمطلب نے علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ تم تین دن کے بعد محکومانہ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ مجھے تو ایسے آثار نظر آ رہے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اس مرض سے جاں بر نہیں ہو سکیں گے۔ مجھے موت کے وقت عبدالمطلب کے خاندان کے چہروں کی خوب شناخت ہے۔ ''ہمیں'' ابھی رسول کریم ﷺ کے پاس چلنا چاہیے، اور آپؐ سے پوچھ لینا چاہیے کہ آپؐ کے بعد خلافت کسے ملے گی؟ اگر اس کے مستحق ''ہم'' ہیں تو ''ہمیں'' معلوم ہو جائے گا۔ اگر کوئی دوسرا ہے تو وہ بھی ابھی معلوم ہو جائے گا، اور ممکن ہے کہ آپؐ ہمارے متعلق اپنے خلیفہ کو کچھ وصیتیں کر دیں۔ حضرت علیؓ نے کہا: ''اگر ہم نے اس وقت آپؐ سے اس بارے میں کچھ پوچھا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو پھر لوگ ہمیں ہمیشہ کے لیے اس سے محروم کر دیں گے۔ میں تو آپؐ سے ہرگز اس کے متعلق نہیں پوچھوں گا۔''[۱۳۹] جیسا کہ قُم (ایران) سے شائع ہونے والی کتاب کے حوالے سے پچھلے صفحات میں لکھا گیا ہے،[۴۵] آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے مرض الموت کے دوران میں آپؐ سے پوچھا تھا کہ اگر آپؐ کے بعد حکومت ''ہمارے'' پاس رہے گی، تو ''ہمیں'' اس کی بشارت دیجیے۔ کتاب سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت عباسؓ نے یہ بات کب پوچھی، حضرت علیؓ سے اپنی گفتگو سے پہلے، یا حضرت علیؓ کا جواب سننے کے بعد؟[۱۴۰] تاہم اس کتاب میں لکھا ہے کہ پیغمبر نے جواب میں فرمایا کہ ''تم لوگ میرے بعد ''مستضعفین'' میں سے ہو گے۔''[۱۴۱] جس کا مطلب بے بس، عاجز یا ناتواں ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں حوالوں سے، اب اس بارے میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ بنو ہاشم کو رسول کریم ﷺ کے مرض الموت کے دوران اس بات کی فکر لاحق تھی کہ آپؐ کے بعد آپؐ کا

خلیفہ کون ہوگا۔ شاید حضرت عباسؓ خود اس کے امیدوار نہ تھے۔ وہ حضرت علیؓ کو خلیفہ دیکھنا چاہتے تھے۔ معلوم ہوا کہ خلافت کا مسئلہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد نہیں، بلکہ وفات سے پہلے اٹھ چکا تھا، اور یہ مسئلہ انصار نے نہیں بلکہ بنو ہاشم نے اٹھایا تھا۔

جہاں تک ''مستضعفین'' والی روایت کا تعلق ہے تو اسے مختصراً دو زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلا زاویۂ نظر تو یہ ہے کہ اس روایت کے باوجود حضرت علیؓ خلیفہ چہارم بنے اور خلیفہ کو ''مستضعفین'' میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح اس زاویۂ نظر سے خود روایت کا ضعف ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرا زاویۂ نظر یہ ہے کہ اگر خلیفہ بننے کے باوجود یہ کہا جائے کہ روایت میں کوئی ضعف نہیں ہے تو پھر تو خلافت نہ ملنے پر کسی شکوے یا تنازعے کی گنجائش نہیں رہتی کیوں کہ رسول کریم ﷺ، اللہ کے ایما پر، یہ بات بتا کر ہی اللہ سے جا ملے تھے اور جو کچھ ہوا وہ اللہ کی مرضی سے ہوا۔ حضرت علیؓ کا آپؐ سے خلافت کے بارے میں پوچھنے سے انکار کر دینا حضرت علیؓ کا دانش مندانہ فیصلہ تھا۔

رسول کریم ﷺ کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے جو محبت تھی، اس بارے میں صحیح بخاری کی حدیثوں کا حوالہ دے کر پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔ تاہم اللہ کے رسول ﷺ کے دل میں کسی کے لیے بے پناہ محبت ہونا، اور حکمِ الٰہی کے تحت اسے اپنا ''فوری'' جانشین نامزد کرنا دو بالکل علیحدہ باتیں ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے امتیوں کے دل میں بھی آپؐ کے کسی خاص صحابی کے لیے خصوصی محبت ہو سکتی ہے، لیکن اگر ان امتیوں کو اپنے رسول ﷺ سے انؐ کے کسی صحابی کے مقابلے میں زیادہ محبت ہے تو انھیں سمجھنا چاہیے کہ آپؐ نے اپنی محبت کو وصیت میں تبدیل نہیں کیا۔ آپؐ کو حضرت ابوبکرؓ سے بھی بہت محبت تھی لیکن آپؐ نے ان کے لیے بھی خلافت کی وصیت نہیں کی۔ آپؐ کے فیصلے اللہ کے فیصلے ہوتے تھے۔ اللہ کا فیصلہ تھا کہ کسی کے لیے وصیت نہیں ہوگی۔

موت کی گھڑیاں قریب آ رہی تھیں۔ دن چڑھا تو آپؐ نے اپنی عزیز از جان بیٹی کو خصوصی طور پر نزدیک آنے کو کہا۔ ان کے کان میں کچھ کہا۔ وہ سنتے ہی رو پڑیں۔ آپؐ نے پھر

نزدیک بلایا اور دوبارہ کان میں کچھ کہا تو حضرت فاطمہؓ مسکرا دیں۔ حضرت عائشہؓ دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے حضرت فاطمہؓ سے پوچھا۔ حضرت فاطمہؓ نے کچھ نہیں بتایا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ بعد میں حضرت فاطمہؓ نے بتایا کہ میں روئی یوں تھی کہ پہلی بار آپؐ نے کہا تھا کہ آپؐ اس مرض سے جاں بر نہیں ہوں گے، مسکرائی یوں تھی کہ دوسری بار آپؐ نے بتایا کہ میرے خاندان (''اھل'') سے تم سب سے پہلے مجھ سے ملوگی۔''[۱۴۲]

تھوڑی دیر بعد، مرض الموت کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ ٹھنڈے پانی کی ایک چھاگل یا پیالہ پاس رکھا تھا۔ آپؐ بار بار اس میں ہاتھ ڈالتے، چہرہ مبارک پر پھیرتے اور فرماتے: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، موت کے لیے سختیاں ہیں۔''[۱۴۳] پیاری بیٹی جانتی تھی کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ بہت دیر سے ضبط کیے بیٹھی تھی۔ اب ضبط کا یارا نہ رہا۔ زبان سے بے ساختہ نکلا: ''آہ! میرے باپؐ کا کرب!''[۱۴۴] آپؐ نے اپنی لمبی لمبی پلکیں اٹھا کر اپنی بڑی بڑی بوجھل آنکھوں سے اپنی لاڈلی اور حساس بیٹی پر بھرپور نظر ڈالی اور بھاری[۱۴۵] آواز میں فرمایا: ''میری جان! آج کے بعد تیرے باپ کو کوئی کرب نہیں ہوگا۔''[۱۴۶] یہ ایک عظیم باپ اور ایک عظیم بیٹی کے درمیان ہونے والی آخری گفتگو تھی، جو تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ کرلی۔ پھر آپؐ نے اپنے دونوں ننھے منے معصوم نواسوں کو بلایا، اور آخری بار انھیں بار بار اپنے خشک ہونٹوں سے چوما[۱۴۷] اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ حضرت حسنؓ کی عمر اس وقت ساڑھے سات سال، اور حضرت حسینؓ کی عمر ساڑھے چھے سال تھی۔ اس عمر کے اثر انگیز واقعات ذہین اور حساس طبع بچوں کو یاد رہتے ہیں لیکن احادیث میں حسنینؓ کی اپنے نانا سے آخری ملاقات کے بارے میں کوئی حدیث درج نہیں۔ پھر آپؐ نے اپنی بیویوں کو بلایا اور انھیں آخری نصیحت کی۔[۱۴۸]

آسمان پر آفتاب کا سرخ چہرہ تمتما رہا تھا اور زمین پر شمس العالمین کا سرخی مائل سفید چہرہ کبھی سرخ اور کبھی زرد ہو رہا تھا۔[۱۴۹] یہ نزع کا عالم تھا۔ بعض روایات کے مطابق، اس وقت آپؐ کا سر حضرت عائشہؓ کی ران پر تھا،[۱۵۰] اکثر روایات کے مطابق سر مبارک حضرت

عائشہؓ کے سینے پر تھا،[۱۵۱] جن میں سے چند روایات میں صراحتاً یہ ذکر ہے کہ آپؐ کا سر حضرت عائشہؓ کی ٹھوڑی اور[۱۵۲] ہنسلی کے درمیان تھا۔ یہ سب روایات حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک ہی درست ہوسکتی ہے۔ اسی دوران میں، حضرت عائشہؓ کے سگے بڑے بھائی عبدالرحمٰنؓ کھجور کے درخت کی ایک تازہ مسواک لیے ہوئے حجرے میں داخل ہوئے۔ آپؐ نے مسواک کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔[۱۵۳] یہ اس خواہش کا خاموش، لیکن کھلا، اظہار تھا کہ زندگی کے آخری چند منٹوں میں بھی آپؐ اپنی عمر بھر کی عادت ترک کرنے پر تیار نہ تھے۔ آپؐ کی خواہش تھی کہ آپؐ کا ایک ایک دانت صاف اور دہن مبارک کسی قسم کی بو سے پاک ہو۔ طہارت کی یہ خواہش اور نفاست کا یہ معیار اکیسویں صدی عیسوی کے کتنے انسان برقرار رکھ سکتے ہیں؟ کتنے انسان اپنے مرنے سے صرف چند منٹ پہلے اپنے دانتوں کو برش کرتے ہیں؟ آپؐ کی ہر بات ہر انسان کو بہت کچھ سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ سنتِ رسولؐ صرف نماز کی مخصوص سنتیں پڑھ لینے کا نام نہیں۔ یہ اکیسویں صدی کے انسان کو تدبر کی دعوت دیتی ہے۔

حضرت عائشہؓ نے پوچھا: ''آپؐ کے لیے مسواک لے لوں؟'' آپؐ نے اشارے سے رضامندی ظاہر کی۔[۱۵۴] حضرت عائشہؓ نے مسواک اپنے دانتوں سے چبا کر، نرم کرنے کے بعد، آپؐ کو دے دی۔ آپؐ نے اتنی اچھی طرح مسواک کی جیسے صحت مندی کے دنوں میں بھی شاید نہ کی ہو۔[۱۵۵]

مسواک سے فارغ ہونے کے بعد، آپؐ نے اپنی انگشتِ مبارک، یا دستِ مبارک، کو اوپر اٹھایا۔[۱۵۶] نگاہِ رسالتؐ پکے حجرے کی کھجور کی ٹہنیوں والی چھت پر جم گئی۔[۱۵۷] آپؐ کی زبان سے آخری الفاظ یہ سنے گئے: ''**اللھم الرفیق الاعلیٰ**''[۱۵۸] ''اے اللہ! مجھے اعلیٰ ترین رفیق کے ساتھ رکھنا۔'' یہ الفاظ تین بار مونہہ سے نکلے۔[۱۵۹] مسواک ہاتھ سے چھوٹ کر کچی زمین پر گرگئی۔[۱۶۰] ہاتھ نیچے ڈھلک گیا۔[۱۶۱] پتلیاں اوپر چڑھ گئیں۔[۱۶۲] آپؐ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے تھے۔[۱۶۳] آپؐ رفیقِ اعلیٰ سے جدا ہی کب

ہوئے تھے؟ آج محبّ اور محبوب گلے مل رہے تھے۔ کون محبّ تھا؟ اور کون محبوب؟ یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ وہی سب کچھ جانتا ہے۔

حضرت فاطمہؓ کے مونہہ سے بے ساختہ نکلا: ''میرے پیارے باپؐ نے دعوتِ حق قبول کرلی اور فردوسِ بریں میں پہنچ گئے۔[۱۶۴] یاالٰہی! فاطمہ کو محمدؐ کے پاس پہنچا دے۔'' [۱۶۵] بعض روایات کے مطابق تین ماہ بعد، اور بعض روایات کے مطابق چھے ماہ بعد، فاطمہؓ محمدؐ کے پاس پہنچ گئیں۔ آپؐ نے فرمایا تھا: ''فاطمہ میرے بدن کا ٹکڑا ہے۔''[۶۶] بدن کا ٹکڑا بھلا بدن سے کیسے جدا رہتا؟''

رسولِ کریم ﷺ کی آنکھیں بند ہوتے ہی آپؐ کی تعلیمات کی خلاف ورزی کا آغاز ہوگیا، اور عرب کے قدیم قبائلی رسم ورواج، فوری طور پر آپؐ کی تعلیمات پر حاوی ہوگئے۔ اس کا اظہار میت پر بین کرنے کی ممانعت کی خلاف ورزی سے ہوا۔ اس کا اظہار قبائلی تفوق کی بنا پر سرداری حاصل کرنے پر ہوا۔ اس کا اظہار زکوٰۃ کی ادائیگی سے معذرت، یا انکار، پر ہوا۔ اس کا اظہار کہیں مرتد ہونے کا ارادہ کرنے اور کہیں مرتد ہوجانے پر ہوا۔ یہ اظہار مدینے میں بھی ہوا، مدینے کے گردونواح میں بھی، مکے میں بھی ہوا، نجد اور یمن میں بھی۔ یہ اظہار پورے عرب میں ہوا۔

عربوں میں رواج تھا، جو پاکستان سمیت بہت سے ممالک میں آج بھی رائج ہے، کہ موت پر عورتیں بین کرتی، بال نوچتی، گریبان پھاڑتی، سینہ پیٹتی اور گالوں پر تھپڑ مارتی تھیں۔ آپؐ زندگی بھر اس کی سختی سے ممانعت کرتے رہے۔ صحیح بخاری کی ''کتاب الجنائز'' کی تین متواتر احادیث میں لکھا ہے کہ جو کوئی گالوں پر تھپڑ مارے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی رسوم پر چلے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔[۱۶۶] اسی کتاب میں، حضرت عمرؓ کی مبینہ روایت کے مطابق، آپؐ نے یہاں تک کہہ دیا کہ گھر والوں کے رونے سے مردے پر عذاب ہوتا ہے،[۱۶۷] گو جب حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد، یہ حدیث حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کی گئی تو انھوں نے کہا: ''اللہ عمرؓ پر رحم کرے۔ اللہ کی قسم! آپؐ نے یہ نہیں کہا تھا اور پھر قرآن کی یہ

آیت پڑھی کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔[۱۶۸] یہ تمام احادیث صحیح بخاری میں آگے پیچھے موجود ہیں۔ اکیسویں صدی عیسوی میں مندرجہ بالا سطور کے ہر پہلو پر تدبر کی ضرورت ہے۔ آپؐ کی وفات کے فوراً بعد، آپؐ کے پلنگ کے گرد خواتین نے سینہ کوبی اور گالوں پر تھپڑ مارنے شروع کردیئے۔[۱۶۹] قبائلی رواج آپؐ کی تعلیم پر حاوی ہوگیا۔

یہی عمل خلافت کے بارے میں ہوا۔ آپؐ کی وفات کے ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر مدینے میں جو کچھ ہوا، وہ سمجھ میں نہیں آتا اور اگر سمجھ میں آجائے تو اس پر یقین نہیں آتا۔ سمجھنے کا آغاز اس سے کرتے ہیں کہ اس وقت، بعد میں ہونے والے چاروں خلفائے راشدین میں سے کون کہاں تھا؟

حضرت ابوبکرؓ مدینے سے تین میل دور ''سخ'' نامی ایک گاؤں میں تھے جہاں وہ پیر کے روز صبح صبح تھوڑی دیر پہلے پہنچے تھے۔ حضرت عمرؓ مدینے میں تھے۔ حضرت عثمانؓ بھی مدینے میں تھے لیکن پیر کے روز ہونے والے کسی واقعے میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ یاد رہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کی دو بیٹیوں کے شوہر رہ چکے تھے۔ بنوامیہ کے صحابہ میں ان کا حق اولیٰ ترین تھا۔ رسول کریم ﷺ نے حضرت عثمانؓ کی زندگی میں ہی انھیں جنت کی بشارت دی تھی۔[۱۷۰] عشرہ مبشرہ کی روایت کے بارے میں اختلاف ہے لیکن حضرت عثمانؓ کو دی جانے والی بشارت کے بارے میں اختلاف نہیں۔ یہ بات قابلِ غور وفکر ہے کہ وہ اس روز کہاں رہے؟ حضرت علیؓ پہلے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں رہے، اور بعد میں حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کے ساتھ اپنے حجرے میں آگئے جو حضرت عائشہؓ کے حجرے کے بالکل ساتھ تھا۔

رسول کریم ﷺ کے دور کا مدینہ چھوٹی چھوٹی بکھری ہوئی بستیوں پر مشتمل تھا۔ اس کا مجموعی رقبہ آج کی مسجدِ نبویؐ کے رقبے کے برابر سمجھیے۔ مسجدِ نبوی حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ کے جڑے ہوئے حجروں سے اس طرح ملی ہوئی تھی جیسے صحن گھر سے متصل ہوتا ہے۔ جب پیر کی دوپہر کو حضرت عائشہؓ کے حجرے سے بین کی دل خراش آواز اٹھی تو مسجدِ نبوی میں موجود صحابہ کو فوری طور، پر اور مدینے میں رہنے والے ہر صحابی کو چند منٹوں میں معلوم ہوگیا کہ کیا قیامت

گزر گئی ہے۔

حضرت عمرؓ بھاگم بھاگ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں پہنچے۔ رسول کریم ﷺ کا جسدِ مطہر (سیاہ) دھاری دار[۱۷۱] یمنی چادر سے ڈھنپا ہوا، آپؐ کے بستر پر دراز تھا۔[۱۷۲] اس چادر نے آپؐ کا چہرہ بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے چاند سے مکھڑے سے سیاہ چادر اٹھائی۔

نظروں کے سامنے قرآن مجسم تھا۔ ہلکی گولائی لیا ہوا چہرہ، بڑا سر، ہلکے خم دار لمبے لمبے سیاہ بال، بلند پیشانی، ایک دوسرے سے جڑی ہوئی سیاہ بھویں، بڑی بڑی سیاہ سرگیں آنکھیں، جنھیں پپوٹوں نے ڈھانپ رکھا تھا، لمبی لمبی پلکیں، درازی مائل خم دار ناک، کشادہ دہانہ، کھڑا کھڑا چہرہ جس پر زیادہ گوشت نہ تھا، گھنی سیاہ ڈاڑھی جس میں اِکا دُکا سفید بال جھلک رہے تھے۔[۱۷۳]

نہ یہ لگتا تھا کہ آپؐ کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی ہے، نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ یہ وہی چہرہ تھا جس کے بارے میں ایک عاشقِ رسولؐ حضرت براءؓ نے کہا تھا کہ میں نے کسی لمبے بالوں والے شخص کو، سرخ جوڑے میں، آپؐ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا۔ آپؐ کا چہرہ چاند کی طرح تھا،[۱۷۴] اور دوسرے عاشقِ رسولؐ حضرت علیؓ نے کہا تھا کہ میں نے آپؐ سے پہلے اور آپؐ کے بعد، آپؐ جیسا کوئی نہیں دیکھا۔[۱۷۵]

آج چاند کی طرح روشن حسین یہ چہرہ جس کا قدرتی رنگ سرخ و سفید[۱۷۶] تھا، پیلا پڑ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ایک لمبے سفر کے بعد، آپؐ چادر اوڑھے، ایک گہری نیند میں ہیں۔ **اِناللّٰہ وانا الیہِ راجعون۔**

حضرت عمرؓ اپنے غصے، صاف گوئی اور قوتِ ارادی کے لیے مشہور ہیں۔ یہ سیاہ دھاری دار چادر اٹھانے کے بعد، آج ایک بالکل مختلف عمرؓ تاریخ کے سٹیج پر کھڑا تھا۔ فولاد موم بن چکا تھا اور قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ عشق مکمل طور پر عقل پر غالب آ چکا تھا۔ یہ عشقِ محمدیؐ تھا۔ آج جذباتی عمرؓ نہ شدتِ جذبات سے دھاڑیں مار کر روئے، نہ ہی سخت گیر عمرؓ نے آج خواتین کو بین کرنے سے روکا۔ ان کے مونہہ سے بے ساختہ صرف یہ نکلا: ''ہائے عشی! ہائے عشی!

رسول اللہ ﷺ پر کیسی سخت غشی طاری ہے!''[۱۷۷] حجرے کے دروازے سے نکلنے لگے تو ایک صحابی مغیرہؓ بن شعبہ نے کہا: ''عمر! خدا کی قسم، رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں''[۱۷۸] عمرؓ گرجے: ''مغیرہ! تم جھوٹ بول رہے ہو، تم جھوٹ بول رہے ہو، رسول اللہ ﷺ نے وفات نہیں پائی۔''[۱۷۹] یہ گھن گرج اس بے کراں درد کو چھپانے کی ناکام کوشش تھی جس نے ایک چادر اٹھتے ہی عمرؓ کے چہرے سے ان کی سختی کا پردہ اٹھا دیا تھا۔

حجرے سے قدم باہر رکھتے ہی مسجدِ نبوی تھی جہاں زیادہ تر مہاجر صحابہ جمع تھے اور سکتے کے عالم میں حجرے سے اٹھتی ہوئی دردناک بین کی آواز مسلسل سن رہے تھے۔ حضرت عمرؓ ان کے درمیان کھڑے ہو گئے اور اپنی گونجتی ہوئی آواز میں کہا کہ کچھ منافق یہ افواہ اڑا رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ آپؐ حضرت موسیٰؑ کی طرح اللہ سے ملاقات کرنے گئے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ چالیس دن بعد بنی اسرائیل میں واپس آئے تھے جس کے دوران میں بنی اسرائیل نے بھی مشہور کر دیا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کا انتقال ہو گیا ہے۔ رسول کریم ﷺ بھی واپس آئیں گے اور آنے کے بعد ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں قلم کر دیں گے جنھوں نے آج آپؐ کی وفات کی خبر اڑائی ہے۔[۱۸۰] ایک روایت کے مطابق، حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ اللہ نے چوں کہ رسول کریم ﷺ کو اپنی امت پر گواہ بنایا ہے، اس لیے آپؐ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اپنی امت کے آخری فرد کی موت کے بعد اس کے اعمال پر گواہی نہ دے دیں۔[۱۸۱]

جب حضرت عمرؓ یہ کہہ رہے تھے تو حجرے سے بین کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ اس بیّن شہادت کے باوجود، مسجدِ نبوی میں موجود کسی صحابی نے حضرت عمرؓ کو نہیں ٹوکا۔ وہ بین کی آواز کے ساتھ حضرت عمرؓ کے الفاظ سنتے رہے۔ صحابہ کا رویہ ان کی اس دلی آرزو کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے کان وہی کچھ سننا چاہتے تھے جو حضرت عمرؓ مسلسل دہرائے جا رہے تھے۔ صحابہ سب جاننے کے باوجود یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ ان کا جان سے زیادہ عزیز رسولؐ جس کا محبت بھرا مسکراتا چہرہ انھوں نے آج صبح فجر کے وقت دیکھا تھا، اب دنیا میں نہیں رہا۔

اِدھر مسجدِ نبوی کے اندر یہ دل گیر سماں تھا، اُدھر مسجدِ نبوی سے چار فرلانگ کے فاصلے پر، ایک چھپر کے نیچے ایک ایسا انتہائی سنگین واقعہ جنم لے رہا تھا جو بیک وقت نا قابلِ فہم اور نا قابلِ یقین ہے۔ یہ واقعہ سقیفہ بنوساعدہ میں ہو رہا تھا۔ سقیفہ چھت دار چبوترے کو کہتے ہیں۔ یہ بنوخزرج کے ذیلی قبیلے بنوساعدہ کا ڈیرہ یا چوپال تھا جو حضرت عائشہؓ کے حجرے کے شمال مغرب میں کوئی چار فرلانگ پرے تھا۔ اب یہاں سعودی حکومت نے ایک پبلک پارک بنا دیا ہے جو تین چار ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ پارک کے باہر، دو مختلف سمتوں پر، دو بورڈ لگے ہیں، جن پر جگہ کا نام اور مختصر تاریخی کوائف، عربی اور انگریزی زبانوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ جنوب مغرب میں، دو فرلانگ پر، شاہ عبدالعزیز لائبریری، اور شمال مشرق میں، دو فرلانگ پرے، (ایمان) انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل واقع ہیں۔ پارک کے اندر چاروں طرف جوگنگ کے لیے، اور وسطی حصے میں چہل قدمی کے لیے راہداریاں ہیں، جنھیں راقمِ حروف نے ۱۱ر ربیع الاوّل ۱۴۳۴ھ (بمطابق ۲۳ر جنوری ۲۰۱۳ء) کو استعمال کیا اور ۱۲ر ربیع الاوّل ۱۴۳۴ھ کو مسجدِ نبوی میں نمازِ ظہر پڑھنے کے فوراً بعد دوبارہ اس کا بغور مشاہدہ کیا اور پھر مکے کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہاں تک پہنچتے ہوئے دس منٹ لگے۔ اس تاریخ ساز تاریخ کو، اس مشاہدے کے دوران، چشمِ تصور نے چودہ سو سالہ تاریخ کو اپنے اوراق پلٹتے دیکھا۔ اور تاریخ کے قدموں کی آواز سنی۔ اس جگہ سے رسول کریم ﷺ کی یادیں وابستہ ہیں۔ آپؐ نے یہاں نماز پڑھی تھی۔ آج آپؐ کی وفات کے ایک گھنٹے کے اندر انصارِ مدینہ یہاں جمع تھے جب کہ آپؐ کا جسدِ مطہر، چار فرلانگ پرے، حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تھا۔

بیسویں صدی عیسوی کے بعض نامور اردو سیرت نگاروں نے سقیفہ بنی ساعدہ کا نام لینے سے بھی اجتناب کیا ہے۔ مثلاً علامہ شبلی (اور سید سلیمان ندوی) نے سات جلدوں پر مشتمل سیرت النبیؐ لکھی لیکن علامہ شبلی کی تحریر کردہ سیرت کی دوسری جلد میں جہاں آپؐ کی وفات کا تفصیلی ذکر ہے، وہاں سقیفہ بنوساعدہ کا مختصر ذکر تو کیا، اس کا نام تک نہیں لکھا۔ اسی طرح قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے تین جلدوں میں ''رحمۃ للعالمینؐ'' لکھی جس میں آپؐ کی

وفات کے بعد کے واقعات بیان کرتے ہوئے سقیفہ بنوساعدہ کا نام نہیں لیا۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اپنی کتاب ''نبی رحمتؐ'' میں سقیفہ بنوساعدہ کا نام تو لے لیا لیکن واقعے کا بالکل ذکر نہیں کیا، البتہ صرف ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اسے ''انتہائی سنگین'' واقعہ قرار دیا ہے۔[۱۸۲]

ناول اور تاریخ میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ناول نگار کردار اور واقعات ''تخلیق'' کرتا ہے جب کہ مؤرخ واقعات ''تحریر'' کرتا ہے۔ مؤرخ کا یہ استحقاق نہیں بنتا کہ وہ تاریخ کا ایک سنگین، اہم ترین اور تاریخ ساز باب صرف اس لیے حذف کر دے کہ مؤرخ کی نظر میں اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں۔ یہاں ذاتی پسند اور ناپسند نہیں چلتی۔ مکمل حقائق من وعن بیان کر دینے چاہئیں، ہاں اگر کوئی تاریخی روایت غلط لگتی ہے تو یہاں مؤرخ کا حق بھی بنتا ہے اور فرض بھی کہ وہ محقق بن کر، شواہد اور دلائل کے ساتھ غلط روایت کی، بلا رورعایت، نشان دہی کرے اور حقیقت کو سامنے لائے۔

اگر ایک مشہور ترین واقعے کا ذکر صدیوں سے لکھی جانے والی حدیث اور تاریخ کی سیکڑوں مشہور کتابوں میں ہو، اور بیسویں صدی عیسوی میں لکھی جانے والی دو تین مشہور کتابوں میں نہ ہو، تو قدرتی طور پر یہ سوال اٹھے گا کہ ان دو تین کتابوں میں، وجہ بتائے بغیر، ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟ اگر اس مشہور واقعے کا تعلق ایسی مشہور ترین ہستی سے ہو جس سے اربوں انسانوں کو صدیوں سے بے پناہ محبت رہی ہو تو اس واقعے کا ذکر تاریخ کی کسی مشہور، معتبر اور مستند کتاب میں نہ پا کر اکیسویں صدی عیسوی کے قاری کے دل میں نہ صرف سوالات اٹھیں گے بلکہ شبہات جنم لیں گے۔ تجسّس بڑھے گا۔ حقیقت چھپانے سے حقائق چھپتے نہیں، ابھرتے ہیں، لیکن اس سے پہلے کہ حقائق ابھریں، اس خلا کو طرح طرح کی غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں پُر کرتی ہیں۔

سقیفہ بنوساعدہ کے واقعے کے بارے میں یہی بات صادق آتی ہے۔ اس پر کھل کر بات کرنے سے اجتناب کیا گیا، مبادا کہ اظہارِ حقیقت سے کسی کی بے ادبی یا دل شکنی ہو جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اظہارِ حقیقت نہ ہونے سے ان ہستیوں کی بے ادبی کی گئی جو اس سراسر بے موقع اجتماع میں صرف دفعِ شر کے لیے پہنچ گئی تھیں۔ ان کی فراست، دیانت اور عظمت کو خراجِ

عقیدت پیش کرنے کی بجائے، ان کے بارے میں وہ کہا اور لکھا گیا، جو نہ کہا جاسکتا ہے اور نہ لکھا جاسکتا ہے۔ افسوس کہ یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ کیا اسے جاری رہنا چاہیے؟

آیئے آج ہم سب مل کر کھلے دل اور دماغ سے اس چودہ سو سالہ قدیم وقوعے کے حقائق جاننے کی اپنی سی سعی کریں۔ کسی صدیوں پرانے واقعے پر معروضی انداز میں غور وفکر کا نقطۂ آغاز یہ ہوتا ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ سب سے قریب العہد مستند اور مشہور تاریخ کیا بتاتی ہے۔ اگر اس صدیوں پرانے واقعے کا تعلق رسول کریم ﷺ کی ذات سے ہو تو معروضی تاریخی تجزیہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ بھی معلوم کیا جائے کہ آیا اس واقعے کے بارے میں کوئی مستند حدیث موجود ہے کیوں کہ حدیث تاریخ کا ماخذ بھی ہے اور ریکارڈ بھی۔ مستند حدیث کے لیے، صحیح بخاری سے زیادہ صحیح کتاب، اور مستند اور قریب العہد مشہور تاریخ کے لیے ابنِ اسحاق اور ابنِ ہشام کی تاریخ سے بہتر کتاب نہیں مل سکتی۔ اگر صدیوں سے اس تاریخی روایت کو، لفظ بہ لفظ، سیکڑوں مورخین لکھ رہے ہوں، تو کیا کوئی معقول شخص بلاوجہ تاریخ کی اس مسلسل شہادت کو رد کرنا چاہے گا؟ اگر ایک شیعہ عالم، مؤرخ اور محقق بھی وہی کہے جو اہلِ سنت والجماعت کا ایک عالم، مؤرخ اور محقق کہہ رہا ہے، اور یہ دونوں وہ کہہ رہے ہیں جو صدیوں سے سیکڑوں عالم، مؤرخ اور محقق کہتے چلے آرہے ہیں، تو کیا کسی کو یہ خدائی استحقاق حاصل ہے کہ وہ تاریخ کو حکم دے کہ وہ ایسے راوی تلاش کرے جو اس سے مختلف اور متضاد بیانات جاری کریں۔ اپنے قاری کے لیے ہم بعض باتیں دہرائیں گے۔

ابنِ ہشام کی تاریخ کا نام ''السیرۃ النبویہؐ'' ہے۔ اس کا بہت محنت سے کیا ہوا انگریزی ترجمہ ۱۹۵۵ء میں لندن سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کا نام ہے: The Life of Muhammad۔ اس کے عربی متن کے اردو تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے ایک ترجمہ ۱۹۷۹ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا نام ہے: ''سیرت النبیؐ کامل'' اور یہ دو جلدوں میں شائع ہوا۔ اس طرح آج کے قاری کے مطالعے کے لیے اس کتاب کا اصل عربی متن اور اس کا کامل اردو ترجمہ دونوں موجود ہیں۔

قدیم تاریخ کا ماخذ و منبع قدیم روایات ہوتی ہیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے انتہائی سنگین وقوعے کی سب قدیم اور سب سے مشہور روایت حضرت عمرؓ کا وہ تاریخی خطبہ ہے جو انھوں نے اپنی وفات سے تقریباً ایک ہفتے قبل، ۲۲/ذی الحج ۲۳ھ بروز جمعہ، نمازِ جمعہ سے پہلے، مسجدِ نبوی میں دیا۔ اس خطبے کو رسول کریم ﷺ اور حضرت علیؓ کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بہت غور اور توجہ سے سنا، جس کی وجہ اگلی سطور میں بیان کی گئی ہے، اور پھر اس روایت کو آگے بڑھایا۔ جن بزرگ حضرات نے اسے مزید آگے بڑھایا، وہ سب ثقہ راوی ہیں۔

حضرت عمرؓ کا یہ آخری خطاب مندرجہ بالا تین کتابوں کے ان صفحات پر پڑھا جاسکتا ہے:

(۱) **السیرۃ النبویہؐ**: صفحات ۸۹۹، ۹۰۰ (ناشر: دارالکتب العلمیۃ، بیروت، سالِ اشاعت: ۲۰۰۹ء)

(۲) انگریزی ترجمہ: The Life of Muhammad، صفحات ۶۸۵، ۶۸۶

(۳) اردو ترجمہ: سیرت النبیؐ کامل (جلد دوئم): صفحات: ۸۰۸ تا ۸۱۰

حضرت عمرؓ بن خطّاب کے اس خطاب کو پڑھنے سے پہلے، مندرجہ ذیل پانچ نکات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے:

(۱) اولاً حضرت عمرؓ جن کی صدق گوئی اور صاف گوئی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، اس وقوعہ کے نہ صرف چشم دید گواہ تھے بلکہ اس کے پسِ منظر اور پیش منظر سے بخوبی آگاہ تھے۔ ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری نے اپنی کتاب [۵۱] کے صفحہ ۲۹ پر لکھا ہے کہ ''حضرت عمرؓ کا یہ خطاب ابنِ اسحاق کے بعد میں آنے والے مورخین کی اکثریت نے تقریباً یکساں الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔'' اسی صفحے پر وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''سقیفہ بنی ساعدہ کے بارے میں حضرت عمرؓ کے مونہہ سے نکلے ہوئے الفاظ پر کتبِ تاریخ میں جو اتفاق پایا جاتا ہے، وہ عظیم ترین تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔'' چودہ سال پہلے حضرت عمرؓ کے مونہہ سے نکلے ہوئے الفاظ کا اکثریت کی کتابوں میں یکساں الفاظ میں قلم بند ہونا، اور کتبِ تاریخ میں اس پر اتفاق پایا جانا تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے، اور اس وقوعہ کو متنازعہ بنانے والوں کے لیے چشم کشا ہے۔

ثانیًا قرونِ اولیٰ کے اس نڈر معاشرے میں، اگر کسی کے مونہہ سے، غلطی سے بھی، کوئی غلط بات نکل جاتی تو اس کی فوری پکڑ ہوتی۔ تاریخ کا وہ مشہور واقعہ کون بھول سکتا ہے جب حضرت عمرؓ مسجدِ نبوی میں خطاب کرنے والے تھے کہ ایک شخص نے یہ کہہ کر انہیں بولنے سے روک دیا کہ ''اے عمرؓ! پہلے یہ بتائیں کہ آپ کے درازقد کے لیے اس لمبے کرتے کا زائد کپڑا کہاں سے آیا؟'' حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، انھوں نے کہا: ''یہ زائد کپڑا میرے حصے کا تھا جو میں نے اپنے عظیم باپ کو ہدیہ کر دیا تھا کیوں کہ باپ کے حصے میں جو کپڑا آیا تھا، اس سے ان کا کرتہ نہیں بن سکتا تھا۔'' معترض پھر اٹھا اور کہا: ''عمر! اب ہم تمہاری بات ضرور سنیں گے۔'' یہی وہ معاشرہ تھا اور یہی وہ مسجدِ نبوی تھی، جہاں ۲۲ر ذی الحج ۲۳ھ کو یہ کھرا صحابیِ رسولؐ آج پھر خطاب کر رہا تھا۔ اگر ان کے مونہہ سے غلطی سے کوئی غلط بات نکل جاتی تو نومبر ۶۴۴ء کی اس خوش گوار دوپہر کو، کوئی صحابیِ رسولؐ انھیں بولنے سے پھر روک دیتا اور کہتا کہ عمرؓ! پہلے اپنی غلطی کی اصلاح کرو، پھر ہم تمہاری بات ضرور سنیں گے۔ ان صحابہ میں حضرت علیؓ، امام حسنؓ، امام حسینؓ، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت بلالؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت عمارؓ بن یاسر غرضیکہ کوئی بھی صحابی ہوسکتا تھا، یا یہ سب صحابہ ہوسکتے تھے۔ چودہ سو سال کی تاریخ بتا رہی ہے کہ کسی نے اعتراض نہیں کیا بلکہ کسی لفظ پر کسی نے حرف گیری نہیں کی۔ کتبِ تاریخ میں نہ صرف خطبے پر ''اتفاق پایا جاتا'' ہے بلکہ ''مورخین کی اکثریت نے اسے تقریبًا یکساں الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔'' یاد رہے کہ بہت سی احادیث ایسی ہیں جن کے معانی اور مطلب میں اتفاق پایا جاتا ہے لیکن وہ یکساں الفاظ میں نہیں۔ یہاں عمرؓ کے اس خطبے کے الفاظ یکساں ہیں۔

ثالثًا یہ بات ذہن میں رہے کہ ہر مسلمان نمازِ جمعہ مسجد میں ادا کرتا ہے اور حضرت عمرؓ نے اپنے اس خطبے کے لیے جمعے کا انتخاب کیا، اور اپنے آخری حج سے مدینہ واپسی کے فورًا بعد پہلے جمعے کی نماز سے پہلے یہ خطبہ دیا، جو ان کا آخری خطبہ ثابت ہوا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس روز رسول کریم ﷺ کا کوئی جلیل القدر صحابی مدینے میں موجود ہو اور مسجدِ نبوی میں نمازِ جمعہ کے

لیے حاضر نہ ہو؟ حضرت عمرؓ نے اپنے تاریخی خطبے کا آغاز ان الفاظ سے کیا (جو فوٹو گرافک یادداشت رکھنے والے صحابہ کرام اور تابعین نے اپنے دماغ کے کیمرے میں محفوظ کر لیا):

''آج میں تمہارے سامنے وہ باتیں کہنے والا ہوں جس کے لیے اللہ نے لکھ دیا ہے کہ آج تم سے کروں۔ میں نہیں جانتا کہ شاید میرا تم سے یہ آخری کلام ہو (جو وہ تھا)۔ جو شخص میری آج کی باتیں سمجھ سکے اور انھیں یاد بھی رکھ سکے، اسے چاہیے کہ وہ انھیں وہاں تک پہنچا دے جہاں تک اس کی سواری اسے لے جا سکے لیکن جسے یہ اندیشہ ہو کہ وہ انھیں یاد نہیں رکھ سکے گا تو اسے جائز نہیں کہ وہ جھوٹ بولے (اور غلط فہمیاں پھیلائے)۔''

یہ الفاظ جو حشو و زوائد سے پاک ہیں، پکار پکار کر بتا رہے ہیں کہ عمرؓ ابن خطّاب صرف چند سو یا چند ہزار سامعین سے نہیں بلکہ تاریخ سے مخاطب تھے۔ ان کی فراست نے جہاں یہ بھانپ لیا تھا کہ ان کا آخری وقت آن پہنچا ہے، وہیں یہ بھی بھانپ لیا تھا کہ ان کی آنکھیں بند ہونے کے بعد، لوگ جھوٹ بولیں گے اور اس واقعے کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کریں گے۔ اس زمانے میں دور تک پیغام پہنچانے کا ذریعہ اونٹ یا گھوڑے کی سواری تھی۔ حضرت عمرؓ نے امتِ محمدیؐ کو وصیت کی کہ ہر باشعور سامع ان کا یہ خطاب وہاں تک پہنچا دے جہاں تک اس کی سواری اسے لے جا سکتی ہو۔ آج سواری کی جگہ انٹرنیٹ، ٹی وی اور اخبارات و جرائد نے لے لی ہے۔ جو لوگ آج اس تحریر میں، حضرت عمرؓ کی تقریر کا مستند ترجمہ پڑھیں گے اور جو محمد رسول اللہؐ کا کلمہ پڑھتے ہیں، وہ خود فیصلہ کریں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے؟

رابعًا صحیح حدیث کے لیے غیر منقطع سلسلۂ اسناد ضروری ہے جب کہ تاریخ میں صرف واقعہ درج کیا جاتا ہے، راوی کا نام نہیں، اور اگر کسی راوی کا نام درج ہو، تب بھی سلسلۂ اسناد کو سب سے پہلے راوی سے شروع کر کے مورخ پر ختم نہیں کیا جاتا۔ تاریخ نویسی ایسے نہیں ہوتی، تاہم حضرت عمرؓ کے خطبہ کی روایت میں، تاریخ میں یہ اہتمام کیا گیا کہ وہ پہلے راوی (حضرت عبداللہ بن عباسؓ) سے شروع ہو کر مؤرخ (ابنِ اسحاق) تک صرف چار معتبر، امین اور ثقہ افراد

کے غیر منقطع سلسلہِ اسناد پر مشتمل ہے۔ قاری تاریخ کی عربی، انگریزی اور اردو کتابوں سے اس کی تصدیق کرسکتا ہے، جن کے نام اور کتاب کے متعلقہ صفحات اس مضمون میں، اور جن کے کوائف ''حواشی وحوالہ جات'' میں تفصیل سے درج ہیں۔ ضمناً یہ بھی ذکر ہوجائے کہ تصدیق در تصدیق کے لیے سید حسین محمد جعفری کی کتاب کا صفحہ ۳۰[۵۱] دیکھا جاسکتا ہے، جس سے ایک اقتباس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے:

''ابنِ اسحاق (کی کتاب) میں اس روایت کی اسناد کا سلسلہ غیر منقطع اور مختصر ہے، اور روایت مدینے کے صرف چار رواۃ پر مشتمل ہے۔ ہر راوی کے متعلق ''حدثنا'': ''اس نے مجھ سے کہا'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن سے ایک تو (روایت کی) قطعیت ثابت ہوتی ہے اور دوسرے (کہنے اور سننے والے کے درمیان) ذاتی رابطے کا کھلا عندیہ ملتا ہے۔''

ان چار رواۃ کے نام ہیں: (۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ جنھوں نے (۲) حضرت عبیداللہ بن عبداللہؓ کو بتلایا، جنھوں نے (۳) علامہ ابن شہاب الزہری کو بتلایا، جنھوں نے (۴) عبداللہ بن ابوبکر کو بتایا.....اور انھوں نے مؤرخ ابنِ اسحاق کو بتایا۔

خامساً خطبے کے پہلے راوی حضرت علیؓ کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ ہیں جو حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں ان کے مشیرِ خاص رہے۔ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں حضرت علیؓ کی فوج میں شامل رہے اور جنگِ صفین کے بعد حضرت علیؓ کی خواہش تھی کہ مسئلہِ تحکیم میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی بجائے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ، حضرت علیؓ کے نمائندے ہوں۔ ۲۲/ جمادی الاوّل ۲۳ھ کو نہ صرف انھوں نے ''ا'' سے ''ی'' تک حضرت عمرؓ کا پورا خطبہ سنا بلکہ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کو یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت عمرؓ آج ایک تاریخی خطبہ دیں گے جس میں وہ، دس سال بعد، سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کریں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ انھیں یہ کیسے پہلے سے معلوم تھا؟ اس کا ایک تاریخی پسِ منظر ہے۔ سنہ ۲۳ ہجری کے آخری ماہ ذی الحج میں، حضرت عمرؓ آخری حج پر گئے۔ مکے میں ان کے

کانوں میں بھنک پڑی کہ چند لوگ (جن میں حضرت علیؓ، امام حسنؓ اور امام حسینؓ شامل نہیں تھے) سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ کی بطور خلیفہ نامزدگی پر باتیں بنا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ مکے کے قیام کے آخری دنوں میں حقائق کھول کر بیان کردیں لیکن ایک جید صحابی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے مشورے پر فیصلہ کیا کہ وہ یہ باتیں مدینے کے ایک بڑے اجتماع میں بتائیں گے جہاں رسول کریم ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ اور فہمِ دین رکھنے والوں کی اکثریت ہے۔

حضرت عمرؓ ۱۲/ ذی الحج ۲۳ھ تک تو بہرحال منیٰ میں تھے۔ اس تاریخ کے بعد ذی الحج ۲۳ھ میں جمعے کا روز صرف تین تاریخوں پر پڑتا ہے: ۱۵/ ذی الحج، ۲۲/ ذی الحج اور ۲۹/ ذی الحج۔ حضرت عمرؓ ۱۲/ ذی الحج کو منیٰ سے چل کر ۱۵/ ذی الحج کو مدینے نہیں پہنچ سکتے تھے کیوں کہ یہ کم ازکم ایک ہفتے کا سفر ہوا کرتا تھا۔ ۲۹/ ذی الحج کو وہ بسترِ مرگ پر تھے کیوں کہ ۲۷/ ذی الحج ۲۳ھ کو ان پر مسجدِ نبوی میں نمازِ فجر کے وقت قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس طرح صرف ۲۲/ ذی الحج باقی بچتا ہے۔

محمد حسین ہیکل اپنی کتاب ''عمر فاروق اعظم'' [۲۶۰] میں لکھتے ہیں کہ ذی الحج ۲۳ھ میں جب حضرت عمرؓ منیٰ سے پلٹے تو ''ابطح'' کے مقام پر اپنا اونٹ بٹھایا، سنگریزے جمع کرکے ایک چبوترہ سا بنایا، اس پر اپنی چادر کا کنارہ ڈالا، چت لیٹ گئے اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا:

''یااللہ! میری عمر اب زیادہ ہوگئی ہے۔ ہڈیاں نرم پڑگئی ہیں۔ قوت جواب دے رہی ہے۔ رعایا پھیل گئی ہے۔ اب تو مجھے اپنے پاس بلالے۔''

یہ دعا ذی الحج میں مانگی گئی اور دو ہفتے بعد ذی الحج میں پوری ہوگئی۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی زندگی کا آخری جمعہ اس خصوصی کام کے لیے مختص کیا گیا تھا تاکہ وہ سقیفہ بنی ساعدہ کے حقائق کو، اپنے انتقال سے چند روز پہلے، رہتی دنیا تک، دنیا والوں پر آشکارا کردیں۔

۲۲/ ذی الحج ۲۳ھ بروز جمعہ، ''عین زاغت الشّمس'' پر، مسجدِ نبوی صحابہ اور تابعین

سے کھچا کھچ بھری تھی۔ یہ نومبر کا خوشگوار مہینا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس، حضرت عمرؓ کا متوقع تاریخی خطبہ سننے کے لیے، منبرِ رسولؐ کے قریب آ کر بیٹھ گئے، اور اپنے نزدیک بیٹھے ہوئے صحابی سے کہا: ''آج عمرؓ وہ کہیں گے جو انھوں نے اپنے دس سالہ دورِ خلافت میں اب تک نہیں کہا۔''

اتنے میں امیرالمومنین تشریف لے آئے۔ منبر رسولؐ پر بیٹھے۔ خطّاب کے بیٹے نے اپنے خِطاب کا آغاز اللہ کی حمد وثنا سے کیا، ہر طرف سکوت طاری تھا۔ فضا میں صرف اس شخص کی پاٹ دار آواز گونج رہی تھی، جس کے لیے عمرؓ کے آقا محمد ﷺ نے کہا تھا کہ ''تم سے پہلی امتوں میں محدّث ہوا کرتے تھے، میری امت میں کوئی ایک ایسا شخص ہے، تو وہ عمر ہے۔''[۵۳] محدّث سے یہاں مراد نہ علمِ حدیث جاننے والے کی ہے، نہ نئی بات نکالنے والی کی۔ محدّث سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جس کی زبان پر اللہ کے حکم سے اللہ کا فیصلہ جاری ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ''**گفتهٔ أو گفته الله بود**''

سقیفہ بنی ساعدہ کے تاریخی خطبے کی اہمیت کے پیشِ نظر، ہم اپنے ہر مصروف قاری پر یہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے کہ وہ اسے لازمًا عربی، اردو اور انگریزی کی کتابوں کے ان صفحات میں ڈھونڈھے، جن کی نشان دہی اس تحریر کے پچھلے صفحات میں کی جا چکی ہے۔

ذیل میں، ایک مختصر تعارفی نوٹ کے بعد، جو ابنِ اسحاق نے لکھا اور ابنِ ہشام نے برقرار رکھا، حضرت عمرؓ کے خطبے کے اس حصے کا جو سقیفہ بنو ساعدہ سے متعلق ہے، انگریزی اور اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ انگریزی ترجمے کے بارے میں ایک مزید احتیاط یہ برتی گئی ہے کہ The Life of Muhammad کے صفحات ۶۸۵، ۶۸۶ پر درج شدہ ترجمہ نقل کرنے کی بجائے، ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری کی کتاب The origin and early development of Shi'a Islam[۵۱] کے صفحات ۴۵ تا ۴۷ سے حضرت عمرؓ کے خطبے کا انگریزی ترجمہ پیش کیا گیا ہے، جو The Life of Muhammad کے اس انگریزی ترجمے سے مطابقت رکھتا ہے، جو اس کے صفحات ۶۸۵، ۶۸۶ پر ہے، لیکن اس سے زیادہ واضح ہے۔

ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری نے پہلے صفحہ ۴۲ پر ابنِ اسحاق کا وہ مختصر تعارفی نوٹ پیش کیا

ہے جو The Life of Muhammad میں صفحہ ۶۸۳ پر ہے، اور پھر صفحہ ۴۵ تا ۴۷ پر حضرت عمرؓ کے خطاب کا ترجمہ۔

Page 42:

"When the Apostle died, this clan of the Ansar gathered round Saad b.Ubada in the hall of Banu Sa'ida and Ali and az-Zubayar b.al-Awwan and Talha b.Ubayd-Allah separated themselves in Fatima's house while the rest of the Muhajirun gathered round Abu Bakr accompanied by Usayd b.Hudayr with the Banu Abdul-Ashhal. Then someone came to Abu Bakr and Umar telling them that the clan of the Ansar had gathered round Saad in the hall (Saqifa) of Banu Sa'ida: "If you want to have command of the people, then take it before their action becomes serious." Now [the dead body of the] the Apostle was still in his house, the burial arrangemensts not having been completed, and his family had locked the door of the house. Umar said, 'I said to Abu Bakr, "Let us go to these our brothers of the Ansar to see what they are doing."

Pages 45, 46, 47:

"I told Abu Bakr that we should go to our brothers the Ansar, so we went off to go to them when two honest fellows [Uwaym b.Saida and Ma'n b.Adi] met us and told us of the conclusion the people had come to. They asked us where we were going, and when we told them they said that there was no need for us to approach them and we must make our own decisions. I said, By God, we will go to them. And [when we arrived] we found them [the Ansar] in the hall of Banu Saqifa. In their midst was a man wrapped up. In answer to my inquiries, they said that he was Sa'ad

b.Ubada and that he was sick."

"When we sat down there, a speaker pronounced the "Shada" and praised God as was fitting and then continued: We are God's helpers and the squadron of Islam. You, O Muhajarun, are a family of ours and a company of your people have come to settle down [among us.]."

"I (at this point Umar interrupted and) said: "And look, they were trying to cut us off from our origin and wrest authority from us." When the Ansars' speaker finished, I wanted to speak, for I had prepared a speech in my mind, which pleased me much. I wanted to produce it before Abu Bakr, and to repulse the roughness and asperity of the speaker of the Ansar."

"But Abu Bakr said, "Gently, Umar! I did not like to anger him, and so he spoke. He was a man with more knowledge and dignity than I, and by God, he did not omit a single word which I had thought of, and he uttered it in his inimitiable way, better than I could have done."

"Abu Bakr said: "All the good that you have said about yourselves you duly deserve. But the Arabs will not recognise authority except in this tribe [lit, Clan] of Quraysh. They are the best and the noblest of the Arabs in descent, blood and country [i-e, settled in the centre]. So, I offer you one of the two men; accept whichever you please."

"Thus saying he took hold of my hand, and that of Abu Ubayda b.al-Jarrah who was sitting betwenn us. Nothing he ever said displeased me more than that. By God, I would rather have come forward and have had my head struck off--- if that were no sin--- than rule over a people of whom Abu Bakr was one."

"One of the Ansar said, "I am the rubbing post and

the fruitful propped-up palm (i-e a man who can cure people's ills and is held in high esteem because of his great experience]. Let us have one ruler from among ourselves, and another ruler from yourselves, O Quraysh."

"Altercations waxed hotter and voices were raised until, when a complete breach was to be feared, I said, Stretch forth your hand, Abu Bakr. He did so and I paid him homage; the Muhajirun followed, and then the Ansar. [In doing so] we jumped on Saad b.Ubada and someone said that we had killed him. I said, "God kill him."

Page 47:

"Here ends Umar's historic speech accepted by almost all of those who wrote on the Saqifah."

صفحہ ۴۷ کے مندرجہ بالا آخری فقرے کا ترجمہ یہ ہے کہ ''یہاں (حضرت) عمرؓ کا وہ تاریخی خطبہ ختم ہوتا ہے جسے تقریبًا ان سب افراد نے درست مانا ہے، جنھوں نے سقیفہ بنوساعدہ پر لکھا ہے۔''

اب ہم پہلے ابنِ اسحاق/ ابنِ ہشام کے افتتاحی نوٹ اور پھر حضرت عمرؓ کے خطبے کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ افتتاحی نوٹ کا ترجمہ مولانا غلام رسول مہر اور عبدالجلیل کے ''السیرۃ النبویۃ'' کے اردو ترجمے بعنوان ''سیرۃ النبیؐ'' [۹] کے صفحہ ۸۰۶ پر ہے، اور حضرت عمرؓ کے خطاب کا اردو ترجمہ صفحات ۸۰۸ تا ۸۱۰ پر ہے۔

ابنِ اسحاق/ ابنِ ہشام کا افتتاحی نوٹ:

''رسول اللہ ﷺ کی روح قبض ہوتے ہی، ایک طرف انصار کا گروہ جو سعدؓ بن عبادہ سے متعلق تھا، سقیفہ بنوساعدہ میں اکٹھا ہوا۔ دوسری طرف علیؓ بن ابی طالب، زبیرؓ بن عوام اور طلحہؓ بن عبیداللہ، فاطمہؓ کے گھر میں جمع ہوئے۔ تیسری طرف مہاجرین ابوبکرؓ کے پاس مجتمع

ہوگئے اور ان کے ساتھ بنوعبدالاشہل کو لے کر اسیدؓ بن حضیر بھی شامل ہوگئے۔ پھر ابوبکرؓ اور عمرؓ کے پاس کوئی شخص آیا اور اس نے کہا کہ انصار کا یہ گروہ سعدؓ بن عبادہ کی سرکردگی میں سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہوگیا ہے۔ پس اگر آپ کوئی ضرورت سمجھتے ہیں تو اس سے پہلے کہ معاملہ آگے بڑھ جائے، مل کر بات کرلیں۔ ابھی رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں پڑے ہیں۔ ان کے معاملے سے فراغت نہیں ہوئی۔ آپؐ کے اہلِ خانہ نے دروازہ بند کرلیا ہے۔ عمرؓ نے ابوبکرؓ سے کہا کہ ہمیں ان انصاری بھائیوں کے پاس لے چلو۔ دیکھیں وہ کیا چاہتے ہیں۔''

حضرت عمرؓ کے تاریخی خطبے کا متعلقہ حصہ:

''اور میں نے اس وقت ابوبکرؓ سے کہا کہ ہمیں ہمارے ان انصاری بھائیوں کے پاس لے چلو۔ آخر کار ہم لوگ ان کا قصد کرکے جارہے تھے کہ ہمیں انصار میں سے ان کے دو صالح آدمی ملے۔ ان دونوں نے ہمیں بتایا کہ انصار کسی معاملے پر متفق ہوگئے ہیں۔ ان دونوں نے کہا کہ اے گروہِ مہاجرین! کدھر کا ارادہ ہے؟ ہم نے انھیں بتایا کہ انصاری بھائیوں سے ملنے کے ارادے سے نکلے ہیں۔ انھوں نے کہا: نہیں، نہیں۔ اے گروہِ مہاجرین! تم انصار کے پاس نہ جاؤ۔ اپنے معاملات کا خود فیصلہ کرلو۔ میں نے کہا: ''خدا کی قسم ہم ان سے ضرور ملیں گے۔''

''بہرحال ہم لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں جاکر ان سے ملے۔ وہاں دیکھا کہ ان کے درمیان ایک شخص چادر میں لپٹا ہوا بیٹھا ہے۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا: ''یہ سعدؓ بن عبادہ ہیں۔'' میں نے پوچھا: ''انھیں کیا ہوا؟'' لوگوں نے کہا: ''وہ بیمار ہیں۔'' پھر جب ہم لوگ بیٹھ گئے تو ان کے خطیب نے..... کہا: ''ہم اللہ کے انصار اور اسلام کے لشکر ہیں، اور اے گروہِ مہاجرین! تم ہمیں میں سے ایک گروہ ہو۔ تمہاری قوم کی ایک جماعت چل کر ہمارے پاس آئی [اگلے فقرے کا اردو ترجمہ مکمل طور پر درست نہیں ہے] لیکن دیکھتے کیا ہیں، اب ان کا ارادہ یہ ہے کہ ہماری اصل سے کٹ کر الگ ہوجائیں اور ہم سے امارت چھین لیں۔ [اس فقرے کے صحیح ترجمے کے لیے انگریزی ترجمہ دیکھیں]

''پھر جب ان کا خطیب خاموش ہوگیا تو میں نے چاہا کہ جواب دوں۔ میں نے اپنے دل میں ایک ایسی تقریر تیار کرلی تھی جو مجھے خود پسند آرہی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ یہ تقریر ابوبکرؓ کے سامنے پیش کروں اور ابوبکرؓ کے معاملے میں اپنی تیزی کو کم کرکے ان کی مدارات کیا کرتا تھا۔'' [آخری فقرے کے صحیح ترجمے کے لیے پھر انگریزی ترجمہ دیکھیں]

ابوبکرؓ نے کہا: ''عمرؓ! سہولت سے کام لو۔'' میں نے یہ پسند نہ کیا کہ ان سے اپنی ناراضی ظاہر کروں۔ ابوبکرؓ مجھ سے زیادہ باعلم اور باوقار آدمی تھے۔ انھوں نے تقریر شروع کی اور خدا کی قسم! کوئی ایسا کلمہ نہ چھوڑا، جو میں نے اپنے دل میں خوب سنوار کر تیار کیا ہو اور جو مجھے پسند آیا ہو، اور جسے انھوں نے اسی کلمے جیسا، یا اس سے بھی زیادہ افضل کلمہ فی البدیہہ نہ کہا ہو۔''

''ابوبکرؓ نے کہا: تم (انصار) نے اپنے اندر جس خیر و فلاح کا ذکر کیا ہے، تم واقعی اس کے اہل ہو مگر عرب کسی طرح بجز قریش کے اس خاندان کے کسی بھی فرد کو امارت و خلافت کے لائق نہیں مان سکتے۔ قریش اپنے نسب اور اپنے شہر (مکہ) کے لحاظ سے عربوں میں سب سے زیادہ اشرف و اعلیٰ ہیں۔ میں تم لوگوں کے مفاد میں ان دو آدمیوں میں سے کسی ایک کے لیے راضی ہوں۔ ان میں سے جس سے بھی چاہو، بیعت کرلو۔''

''ابوعبیدہؓ بن جراح ہمارے درمیان بیٹھے تھے۔ ابوبکرؓ نے میرا اور ابوعبیدہؓ بن جراح کا ہاتھ پکڑا۔ مجھے ابوبکرؓ کی کہی ہوئی کوئی بات ناگوار نہیں ہوئی بجز ان کی اس بات کے (کہ انھوں نے اپنے ہوتے ہوئے میرا نام امارت کے لیے پیش کیا) خدا کی قسم! یہ چیز کہ میں آگے بڑھوں اور میری گردن تلوار سے مار دی جائے، جو مجھے گناہ سے قریب نہ کرے، مجھے اس سے زیادہ پسند تھی کہ میں اس قوم کا امیر بنوں جس میں ابوبکرؓ موجود ہوں۔''

''عمرؓ نے بیان کیا کہ ایک کہنے والے انصاری نے کہا: میں انصار کا وہ تسکین بخش سہارا ہوں، جس کی رائے پر انھیں تشفی، اور جس کی موجودگی سے انھیں راحت ہوتی ہے۔ میں اس کا وہ پھل دار درخت ہوں جسے یہ لوگ ٹیک دیتے ہیں۔ اے قریش! ایک امیر ہم میں سے، اور ایک امیر تم میں سے ہونا چاہیے۔''

''عمرؓ فرماتے ہیں کہ پھر تو وہ تو تو، میں میں اور شور وغل ہوا کہ مجھے جھگڑے کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ میں نے کہا: ابوبکرؓ! اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔ ابوبکرؓ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا تو (سب سے پہلے) میں نے ان سے بیعت کی، پھر مہاجرین نے بیعت کی، پھر انصار نے بیعت کی اور ہم سب سعدؓ بن عبادہ پر اچھل پڑے اور انھیں روند ڈالا۔ کسی نے کہا: ''تم نے سعدؓ بن عبادہ کو قتل کر دیا'' اس پر میں نے کہا: سعدؓ بن عبادہ کو اللہ قتل کرے۔''

یہ تو ہوئی اسلام کی اولیں، سب سے قریب العہد اور مستند کتبِ تاریخ کی بات۔ اب صحیح بخاری کی حدیث پیش ہے جس کے لیے ہم نے وحیدالزماں صاحب کے اس پرانے ترجمے کا انتخاب کیا ہے، جس کا نام ''صحیح بخاری مترجم'' ہے۔ اس کی جلد دوئم [۸۲] کے صفحات ۴۳۰، ۴۳۱ پر، سقیفہ بنی ساعدہ کے بارے میں ''کتاب المناقب'' سے حدیث ۸۶۶ کے متعلقہ اقتباس کا عربی متن، اور اس کے بالمقابل وحیدالزماں صاحب کا عربی سے اردو میں ترجمہ پیش ہے:

صحیح بخاری کا عربی متن	وحیدالزماں صاحب کا اردو ترجمہ
واجتمعت الانصار الی سعد بن عبادة فی سقیفه بنی ساعدة فقالو منا امیر ومنکم امیر فذهب الیهم ابوبکر الصدیقؓ وعمر بن خطابؓ وابوعبیدهؓ بن الجراح.	اور سب انصار سعد بن عبادہ کے گھر میں اکٹھے ہوئے بنی ساعدہ کے ڈیرے میں اور (مہاجرین سے) کہنے لگے: اب ایسا کرو کہ ایک امیر ہماری قوم کا رہے، ایک امیر تمہاری قوم کا، دونوں مل کر حکومت کریں، یہ خبر سن کر ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہؓ بن جراح وہاں پہنچے۔
فذهب عمرؓ یتکلم	حضرت عمرؓ نے بات کرنا چاہی۔
فاسکته ابوبکرؓ	لیکن ابوبکرؓ نے فرمایا: ذرا خاموش رہو۔
وکان عمرؓ یقول:	اور عمر کہا کرتے تھے:

واللّٰه ماارادت بذلک الاانی قدبّیات کلاما	میں نے جو اس وقت (ابوبکرؓ سے پہلے) بات کرنا چاہی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ایک عمدہ تقریر سوچ رکھی تھی،
قداعجبنی خشیت ان لایبلغه ابوبکرؓ.	میں ڈرتا تھا کہ کہیں ابوبکرؓ اسے بیان نہ کرسکیں۔
ثم تکلم ابوبکرؓ فتکلم ابلغ الناس	لیکن ابوبکرؓ نے باتیں شروع کیں تو نہایت ہی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ
فقال فی کلامه: نحن الامراء وانتم الوزراء.	انھوں نے (انصار سے) یہ کہا کہ امیر تو ہم ہی (یعنی قریش کے لوگ) رہیں گے، تم لوگ وزیر اور مشیر ہو سکتے ہو۔
فقال حباب بن المنذر: لاوللّٰه لانفعل.	حبابؓ بن منذر کہنے لگے: ہرگز نہیں، خدا کی قسم یہ نہیں ہوسکتا۔
منا امیر ومنکم امیر.	ایک امیر ہم میں سے رہے گا اور ایک امیر تم میں سے۔
فقال ابوبکر: لا ولکنا الامراء وانتم الوزراء.	ابوبکرؓ نے کہا: یہ نہیں ہوسکتا، ہم امیر رہیں گے تم وزیر رہو۔
هم اوسط العرب داراو اعربهم احسابا.	وجہ یہ کہ قریش کے لوگ سارے عرب میں شریف خاندان، اور ان کا ملک (یعنی مکہ) عرب کے بیچ میں ہے۔
فیابعو عمر بن الخطاب او ابا عبیده بن الجراح.	تم کو اختیار ہے یا تو عمرؓ بن خطاب سے بیعت کرلو یا ابوعبیدہؓ بن جراح سے۔

فقال عمر: بل نبایعک انت.	عمرؓ نے یہ سن کر کہا کہ تمہارے (ابوبکرؓ) کے ہوتے ساتھے ہم تم سے ہی بیعت کریں گے۔
فانت سیدنا وخیرنا واحبنا الی رسول اللّٰہ ﷺ.	تم ہمارے سردار ہو، اور ہم سب میں بہتر ہو، اور رسول اللہ ﷺ کو ہم سب سے زیادہ تم سے محبت تھی۔
فاخذ عمر بیدہ فبایعه ویابعه الناس	عمرؓ نے ابوبکرؓ کا ہاتھ تھاما، ان سے بیعت کی اور دوسرے لوگوں نے بھی بیعت کر لی۔
فقال قائل: قتلتم سعد بن عبادة.	ایک شخص کہنے لگا کہ تم نے سعدؓ بن عبادہ کو مار ڈالا۔
فقال عمر: قتله اللّٰہ	حضرت عمرؓ نے کہا: اللہ ان کو تباہ کرے۔

مندرجہ بالا حدیث، اسلامک یونیورسٹی مدینہ کے ڈاکٹر محمد محسن خان کے انگریزی ترجمے کی جلد ۵ [۲۰] (سالِ اشاعت: ۱۹۷۹ء) کے صفحہ ۱۴ پر بھی ان ہی عربی الفاظ میں درج ہے، اور اس کا انگریزی ترجمہ اس صفحے پر دیکھا جا سکتا ہے، حدیث کا نمبر: ۱۹ ہے اور یہ ''کتاب المناقب'' میں ہے۔ ''باب'' کے ''عنوان'' کا ترجمہ انگریزی زبان میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"Chapter. The virtues of the companions of the Prophet (PBUH) and any Muslim who enjoyed the company of the Prophet (PBUH) or saw him, is regarded as one of his companions."

عربی میں باب کا عنوان: ''**باب فضائل اصحاب النبی ﷺ، ومن صحب النبی ﷺ او رآه من المسلمین فهو من اصحابه.**''

پچھلے صفحات کے سرسری مطالعے سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ مستند تاریخ اور صحیح حدیث دونوں میں بات کا آغاز انصار سے ہوتا ہے۔ اگر انصار وہ نہ کرتے جو انھیں نہ کرنا

چاہیے تھا، تو ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں میں فرقہ بندی نہ ہوتی لیکن اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اتنی جلدی نہ ہوتی اور اس کا نقطۂ آغاز سقیفہ بنی ساعدہ نہ ہوتا۔ زیادہ حیرت اور دکھ اس پر ہوتا ہے کہ جس انتہائی سنگین واقعہ (یعنی سقیفہ بنی ساعدہ میں انتہائی عجلت اور بے حسی سے خلیفہ کے انتخاب کے لیے اجلاس بلائے جانے) کی کھل کر مذمت ہونی چاہیے تھی، اس کا تو بعض لوگوں نے ذکر تو کجا جگہ کا نام لینے سے بھی گریز کیا، اور جن بزرگوں نے کسی ایک مسلمان کے خون کا ایک قطرہ ٹپکے بغیر، اپنی فراست سے، اس انتہائی سنگین واقعے کو سنگین تر بننے سے روکا، اور انصار کو وہ غیر دانش مندانہ اور عاجلانہ فیصلہ کرنے سے باز رکھا، جس پر انصار عین رسول کریم ﷺ کے یومِ وفات پر تلے ہوئے تھے، ان کا نام لے لے کر بعض لوگ اسلام کے ان محسنوں کی مذمت کرتے ہیں، اور کردار کشی کرتے ہیں، اور یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔

رسول کریم ﷺ کو انصار سے جو محبت تھی، صحیح احادیث کے مجموعے ان سے پُر ہیں۔ آپؐ کو انصار کا اتنا خیال تھا کہ وفات سے صرف چار دن پہلے، بدھ کے روز، مسجدِ نبوی میں دیئے گئے اپنے آخری خطبے میں، آپؐ نے انصار کے بارے میں فرمایا تھا:

''انصار اپنا فرض ادا کر چکے۔ اب مہاجرین کو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ انصار کے نیکوکاروں کو قبول کرنا اور ان کے خطا کاروں کو معاف کرنا۔'' [۲۷]

یہ الفاظ اپنے پیارے نبی ﷺ کی زبان مبارک سے سننے کے بعد، کیا معمولی عقل و فہم کا مالک کوئی انسان رسول کریم ﷺ کے انصاری صحابہ سے یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہ آپؐ کی وفات کی خبر سنتے ہی اس جگہ پہنچنے کی بجائے جہاں آپؐ کا جسدِ مطہر رکھا تھا، اس جگہ (سقیفہ بنو ساعدہ) پہنچ جائیں گے جو آپؐ کے جسدِ مطہر سے چار فرلانگ دور ہو؟ اگر یہ توقع نہیں کی جا سکتی، اور اس کے باوجود ایسا ہوا، تو کیوں ہوا؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے جس پر وہ توجہ نہیں دی گئی جس کا یہ سوال مستحق تھا۔ اس کے حقائق اور پسِ منظر کو سمجھنے کے لیے، ہم نے روایتی بیانیہ انداز کی بجائے ''سوال اور جواب'' کا انداز اختیار کیا ہے۔ انھیں پڑھنے کے بعد، اکیسویں صدی عیسوی کا مسلمان، ان پر غور و فکر کے بعد، اپنی رائے خود قائم کرے۔ تاریخ ایک بھول بھلیاں

ہے اور اس کی پُر پیچ راہ دریوں میں بھٹکتے ہوئے، کبھی کبھی حقیقت کا انکشاف ایک الہامی کیفیت کی طرح ہو جاتا ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا انصاری صحابہ از خود سقیفہ بنو ساعدہ پہنچ گئے، یا کسی نے انھیں وہاں فوراً جمع ہو جانے کا پیغام بھیجا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی نے پیغام بھیجا تو کب بھیجا؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ پیغام کس کی طرف سے تھا، اور پیغام بھیجنے والے کا اپنا پسِ منظر کیا تھا؟

چوتھے سوال کے دو حصے ہیں۔ اولاً جو لوگ وہاں جمع ہوئے وہ کون تھے اور ثانیاً ان لوگوں کا اپنا پسِ منظر کیا تھا؟

پانچواں سوال یہ ہے کہ اس نازک موقع پر اس بے موقع اجتماع کا کیا مقصد تھا؟

چھٹا اور آخری سوال سب سے اہم ہے۔ سوال یہ ہے کہ اجتماع کا مقصد کچھ ہی ہو، وہ کیا وجہ تھی کہ آپؐ پر جان نثار کرنے والے ان قابلِ احترام صحابہ نے آپؐ کی جائے وفات پر حاضر ہونے کی بجائے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا اور چار فرلانگ پرے ایک چوپال میں جمع ہو گئے؟

ان سوالات کا مختصر اور (ایک) ممکنہ جواب درج ذیل ہے۔ اس کے علاوہ مزید کیا جوابات ہو سکتے ہیں؟ اس پر آپ خود غور کریں۔

پہلے سوال کا ممکنہ جواب یہ ہے کہ یہ کسی طور قابلِ فہم نہیں کہ اتنے سارے لوگ از خود سقیفہ بنی ساعدہ پہنچ گئے ہوں۔ کسی نے یقیناً اجتماع کے مقام کی نشان دہی کی ہوگی اور کہا ہوگا کہ سب وہاں پہنچیں اور فوراً پہنچیں۔

دوسرے سوال کا ممکنہ جواب یہ ہے کہ پیغام آپؐ کی وفات کے فوراً بعد بھیجا گیا اور اس پیغام کو ملتے ہی اس پر فوراً عمل کیا گیا، ورنہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر انصارِ مدینہ کا سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو جانا ممکن نہ تھا۔

تیسرے سوال کا ممکنہ جواب یہ ہے کہ یہ پیغام قبیلہ بنو خزرج کے ذیلی قبیلے بنو ساعدہ

کے سردار حضرت سعدؓ بن عبادہ کی طرف سے ہی ہو سکتا ہے، جو اس وقت پورے قبیلے بنو خزرج کے سردار بن چکے تھے۔ ان کا پسِ منظر بے داغ ہے۔ ہجرتِ نبویؐ سے پہلے، وہ وادیٔ مکہ میں عقبہ کے مقام پر، تقریباً ستر انصاری صحابہ کے ساتھ اس فیصلہ کن اور تاریخ ساز دوسری بیعت میں شریک تھے، جو ذی الحج ۱۳ نبوی (جون ۶۲۲ء) میں منعقد ہوئی اور جس میں یہ طے پایا تھا کہ اب رسول ﷺ مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کر جائیں۔ ڈھائی ماہ بعد آپؐ ہجرت کر گئے۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ آپؐ کے ان بارہ مقرر کردہ نقیبوں میں سے ایک تھے، جو آپؐ نے دوسری بیعتِ عقبہ کے موقع پر اوس اور خزرج قبائل میں سے ان قبائل میں اسلام کی تعلیم کے لیے چنے تھے۔ اگلی سطور میں، حضرت اسیدؓ بن حضیر کا ذکر آئے گا، جن کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ وہ بھی ان بارہ نقیبوں میں سے ایک تھے جنھیں آپؐ نے ان کے ذیلی قبیلے بنی عبدالاشہل کے لیے نقیب مقرر کیا تھا۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ تقریباً سب غزوات میں شریک رہے۔ ان غزوات میں انصار کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ وہ سخاوت میں مشہور تھے۔ رسول کریم ﷺ ہمیشہ حضرت سعدؓ بن عبادہ سے خوش رہے۔

چوتھے سوال کے پہلے حصے کا جواب یہ ہے کہ اس اجتماع میں اکثریت مدینے کے سب سے بڑے قبیلے بنو خزرج کی تھی اور اس کے بعد مدینے کے دوسرے بڑے قبیلے اوس سے تعلق رکھنے والے صحابہ بھی وہاں موجود تھے لیکن نہ تو اوس کا ذیلی قبیلہ بنی عبدالاشہل اور نہ اس کے سردار حضرت اسیدؓ بن حضیر یہاں موجود تھے۔ وہ مسجدِ نبوی میں تھے۔

چوتھے سوال کے دوسرے حصے کا جواب یہ ہے کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ سمیت، سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو جانے والے کسی انصاری صحابی کے بارے میں کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ وہ منافق تھا۔ یہ نہیں کہ مدینے میں منافقین موجود نہ تھے۔ اس کی شہادت تو قرآن میں موجود ہے۔ بات صرف سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہونے والے انصاری صحابہ کی ہو رہی ہے کہ ان پر منافقت کا الزام نہ اس وقت لگا اور نہ بعد میں لگایا گیا، اور یہ بات اس کے باوجود ہوئی کہ یہ سب صحابہ رسول کریم ﷺ کے انتقال کی خبر ملتے ہی، آپؐ کے جسدِ مطہر کے پاس ہونے کے

بجائے، سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوگئے تھے۔ یہ سیرت نگاری کا ایک معمہ ہے کہ انصاری صحابہ کے اس اقدام کی ان الفاظ میں کھل کر مذمت کیوں نہیں کی گئی، جن الفاظ میں اس کی مذمت سیرتِ نبویؐ کی ہر کتاب میں ہونی چاہیے تھی۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں بتایا گیا ہے، بیسویں صدی عیسوی کے بعض مشہور ترین اردو سیرت نگاروں نے تو سقیفہ بنی ساعدہ کا نام لینے سے بھی احتراز کیا ہے، اور اس کی وجہ بھی نہیں بتائی۔

پانچویں سوال کا ممکنہ جواب یہ ہے کہ مقصد حضرت سعدؓ بن عبادہ کو فوری طور پر خلیفہ منتخب کرنا تھا۔

چھٹا سوال سب سے اہم ہے۔ اس کا جواب براہِ راست شہادت میں نہیں ملتا بلکہ واقعاتی شہادت میں ملتا ہے جسے خدا جانے کیوں، آج تک تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ان غیر معمولی حالات میں، اس غیر معمولی اجتماع کی وجہ بادی النظر میں یہ ہے کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ کو یہ زبردست خوف تھا، جس میں ان کے قبیلے کے افراد بھی شامل ہوں گے، کہ اگر انھوں نے آپؐ کی وفات کے فوراً بعد، انصاری خلیفہ کے انتخاب اور اس کے اعلان میں ذرا سی بھی تاخیر کی تو یہ منصب ان کے ہاتھ سے نکل کر کسی مہاجر صحابی کو مل جائے گا، اور اگر پہلی بار ایسا ہوگیا تو آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا (اور ایسا ہی ہوا)۔

یہ مہاجر صحابی کون ہوسکتا تھا؟ حضرت ابوبکرؓ؟ حضرت عمرؓ؟ حضرت عثمانؓ؟ حضرت علیؓ؟ اس پر مختصر تبصرہ پیش ہے۔

اگر سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہونے والے صحابہ کو یہ خوف حضرت ابوبکرؓ سے ہوتا، تو وہ اسی روز انھیں ہی خلیفہ کیوں منتخب کرتے؟ تاریخ کی اس گواہی کے بعد، حضرت ابوبکرؓ کا نام اس فہرست سے نکل جاتا ہے۔ مفصل تبصرہ اگلے صفحات میں ہے۔

حضرت عمرؓ اپنی سختی اور غصیلی طبیعت کی وجہ سے مہاجر اور انصاری صحابہ دونوں کے لیے یکساں طور پر ناقابلِ قبول تھے۔ اس ضمن میں، پہلے سقیفہ بنی ساعدہ اور انصار کی بات ہوجائے، جو موضوعِ زیر بحث ہے۔ جب سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کا

نام تجویز کیا تو انصار نے اسے قبول نہیں کیا، اور اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ یا کسی مہاجر (یا انصاری) صحابی نے اس پر اصرار بھی نہیں کیا اور حضرت عمرؓ پہلے خلیفہ نہ بنے۔ اس واقعے کے سَوا دو سال بعد، جب حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مرض الموت کے دوران میں دوبارہ ان کا نام تجویز کیا، تو اس بار مدینے میں مقیم بعض مہاجر صحابہ نے اس کی کھلم کھلا مخالفت کی، اور حضرت طلحہؓ کی قیادت میں صحابہ کے ایک وفد نے حضرت ابوبکرؓ سے ملاقات کی اور کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ عمرؓ بن خطّاب کو اپنا جانشین مقرر کررہے ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو جب اللہ آپ سے عمرؓ کو خلیفہ بنانے کے متعلق باز پرس کرے گا، تو آپ اللہ کو کیا جواب دیں گے؟ آپ کی موجودگی میں، وہ لوگوں سے جس طرح پیش آتے ہیں، اس کا حال آپ پر عیاں ہے، مگر آپ کے بعد تو ان کے ظلم وستم کی کوئی حد نہ ہوگی۔[۱۸۳] اس کی مزید تفصیلات اگلے صفحات میں درج ہیں۔ تاریخ کی اس گواہی کے بعد حضرت عمرؓ کا نام بھی فہرست سے نکل جاتا ہے۔

رہ گئے حضرت عثمانؓ تو کسی وجہ سے جو تاریخ کے صفحات پر نظر نہیں آتی، وہ دعوئے خلافت تو کُجا، دیگر امور میں بھی اس روز منظر نامے سے غائب نظر آتے ہیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہونے والے صحابیوں کو حضرت عثمانؓ سے خائف ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تاریخ کی اس گواہی کے بعد حضرت عثمانؓ کا نام بھی فہرست سے نکل جاتا ہے۔ مفصل تبصرہ اگلے صفحات میں ہے۔

اب حضرت علیؓ رہ جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ ہم نے اگلے صفحات میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس وقت یہ دیکھتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے وقت، جو جون کی شدید گرمی میں دوپہر کے وقت ہوئی، مدینے کا منظر نامہ کیا تھا؟

منظر نامہ یہ تھا کہ آپؐ کی بیویاں اور صحابیات آپؐ کے حجرے میں گریاں تھیں اور آپؐ کے صحابہ اور رشتے دار تین مختلف مقامات پر مجتمع تھے۔

مدینے میں مقیم مہاجرینِ مکہ کی اکثریت، کئی انصاری صحابہ کے ساتھ، مسجدِ نبوی میں حاضر تھی۔ ان انصاری صحابہ میں سے قبیلہ اوس کے ایک ذیلی قبیلے بنوعبدالاشہل اور اس کے

سردار حضرت اسیدؓ بن حضیر کا نام تو ابنِ اسحاق اور ابنِ ہشام دونوں کی سیرت کی کتابوں میں درج ہے۔[۱۸۴] اگر اس کے علاوہ انصاری صحابہ ہوں، تو اس کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے نام تاریخ میں درج نہیں۔ تیرہ سو سال پہلے لکھی ہوئی تاریخ میں اگر بنو عبدالاشہل کا نام درج ہو گیا تو یہ بھی بڑی بات ہے۔ بنو خزرج کے سردار حضرت سعدؓ بن عبادہ کی طرح، حضرت اسیدؓ بن حضیر ان تقریباً ستر انصاری صحابہ میں شامل تھے، جنھوں نے ہجرتِ نبوی سے ڈھائی ماہ قبل دوسری بیعتِ عقبہ میں شرکت کی تھی۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ کی طرح، وہ بھی انصار کے بارہ نقیبوں میں سے ایک تھے۔ رسول کریم ﷺ نے انھیں اپنے ذیلی قبیلے بنو عبدالاشہل کو اسلام کی تعلیم دینے کے لیے نقیب مقرر کیا تھا۔

انصار کی اکثریت جس میں زیادہ تر افراد بنو خزرج کے تھے، لیکن جس میں اوس کے افراد بھی شامل تھے، مسجدِ نبوی سے چار فرلانگ دور سقیفہ بنی ساعدہ میں بیٹھے تھے۔ اتنے قریب اور اتنی دور!

مہاجرینِ مکہ کی اقلیت جس میں بنو ہاشم، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ شامل تھے، حضرت فاطمہؓ کے حجرے میں بیٹھے تھے (اور اس کے بالکل متصل مسجدِ نبوی تھی جہاں مہاجر صحابہ کی اکثریت بیٹھی تھی)

یہ قیاس کرنا درست ہوگا کہ نہ حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ کی وفات کی اطلاع پہنچانے میں تاخیر کی گئی ہوگی، اور نہ انھوں نے مدینے کے لیے روانگی میں دیر کی ہوگی۔ مدینے اور احد میں تین میل کا فاصلہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ گھوڑے[۱۸۵] پر سوار ہو کر ایک گھنٹے یا اس سے کم وقت میں مسجدِ نبوی پہنچ گئے ہوں گے۔

جب حضرت ابوبکرؓ مسجدِ نبوی پہنچے تو وہاں حضرت عمرؓ کی گرج دار آواز گونج رہی تھی۔ وہ چند فقروں کی، جذب کے عالم میں، تکرار کیے جا رہے تھے اور مہاجر اور انصار صحابہ سکتے کے عالم میں ان کی تکرار سنے جا رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو سنا ضرور، لیکن نہ انھیں کچھ کہا اور نہ کسی اور صحابی سے بات کی۔ وہ سیدھے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں پہنچے اور

رسول کریم ﷺ کے چہرے پر پڑی ہوئی دھاری دار یمنی چادر ہٹائی۔[۱۸۶]

یہ چادر ہٹانے کے بعد سخت مزاج عمرؓ تو اپنے حواس کھو بیٹھے تھے لیکن رقیق القلب ابوبکرؓ نے اپنے ہوش وحواس قائم رکھے۔ انھوں نے جھک کر آپؐ کی بلند اور ٹھنڈی پیشانی کا ادب اور محبت سے بوسہ لیا[۱۸۷] لیا اور زبان سے بے ساختہ یہ فقرے نکلے:

''میرے ماں باپ آپؐ پر نثار ہو جائیں۔ وہ موت آپؐ پر آ چکی جو آپؐ کے لیے لکھ دی گئی تھی۔ اللہ آپؐ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا۔''[۱۸۸]

یہ کہا اور آپؐ کے پُرسکون حسین چہرے کو اسی چادر سے ڈھانپ دیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے[۱۸۹] حجرے سے نکلے اور مسجدِ نبوی میں آ گئے۔ آج ایک مختلف ابوبکرؓ تاریخ کے سٹیج پر کھڑا تھا۔ موم فولاد بن چکا تھا۔ اللہ کو ابوبکرؓ سے بہت بڑا کام لینا تھا۔

مسجدِ نبوی میں وہی سماں طاری تھا جسے دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ حجرے میں گئے تھے۔ سب چپ تھے اور ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور نرمی سے کہا: ''عمر! اب بیٹھ جاؤ۔'' حضرت عمرؓ نے سنی ان سنی کر دی۔[۱۹۰] حضرت ابوبکرؓ پرے چلے گئے اور صحابہ کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

صحابہ کے دلوں میں حضرت ابوبکرؓ کی عزت، اور ان کے رتبے کی حرمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے ایک اشارے پر صحابہ حضرت عمرؓ کو اکیلا چھوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کے گرد جمع ہو گئے۔

جب کوئی ایسا واقعہ ہوتا ہے۔ جو بیک وقت غیر متوقع بھی ہو اور غیر معمولی بھی، تو اس وقت قائد کے انتخاب کے لیے نہ الیکشن ہوتا ہے اور نہ قائد کا کوئی تجویز کنندہ اور تائید کنندہ ہوتا ہے۔ قائد خود بخود سامنے آ جاتا ہے اور لوگ اسے اپنا قائد تسلیم کر لیتے ہیں۔ مدینے میں ربیع الاول ۱۱ھ کے مہینے میں پیر کی دوپہر بھی یہی ہوا، اور ہوتا چلا گیا۔ جو ہوا، وہ ایک فطری عمل تھا اور ہر فطری عمل قدرت کی منشا کے عین مطابق ہوتا ہے اور نظامِ کائنات کی قوتِ محرکہ ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے نہ صرف اس موقع پر، بلکہ اس کے بعد ہر موقع پر جو کچھ کہا یا کیا،

وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت میں کتنی گہرائی، بلندی اور مضبوطی تھی۔ ہر موقع پر انھوں نے مختصر کلام کیا لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ کلام ان پر نازل ہوتا تھا۔ اس اندوہناک ترین موقع پر بھی انھوں نے اپنے گرد جمع ہونے والے صحابہ سے صرف دو فقرے کہے اور ان دو جملوں میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا، جو وقت کا تقاضا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا:

''تم میں سے جو شخص محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا، وہ آج جان لے کہ محمد ﷺ دنیا سے جا چکے ہیں، لیکن جو شخص اللہ کی پرستش کرتا ہے، تو بلاشبہ اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، اسے کبھی موت نہیں۔'' [۱۹۱]

یہ ابتدا تھی، جو حضرت ابوبکرؓ نے اپنے الفاظ سے کی۔ اس کا اختتام انھوں نے اللہ کے کلام سے کیا۔ انھوں نے سورۃ آل عمران (سورۃ:۳) کی ۱۴۴ ویں آیت پڑھی، [۱۹۲] جس کا رواں ترجمہ یہ ہے:

''محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کردیئے جائیں، تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، اور عنقریب اللہ شکر کرنے والوں کو جزا دے گا۔''

یہ آیات تقریباً آٹھ برس پہلے، غزوۂ احد کے بعد، رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھیں لیکن بارہ ربیع الاوّل ۱۱ھ، ۸/ جون ۶۳۲ء، بروز پیر، بوقت دوپہر، مسجدِ نبوی میں موجود صحابہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آیات اسی وقت اور اسی موقع کے لیے نازل ہو رہی ہیں۔ ہر صحابی ان کی تلاوت کرنے لگا۔ [۱۹۳] حضرت عمرؓ اس جذب وجنون کے عالم سے باہر نکل آئے جو گھنٹہ بھر سے ان پر طاری تھا۔ ان کے الفاظ میں ''جب میں نے ابوبکرؓ کی زبان سے یہ آیات سنیں (تو مجھے ہوش آیا) مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب میری ٹانگیں میرے جسم کا بوجھ نہیں اٹھا سکیں گی۔ میں زمین پر گر پڑا۔'' [۱۹۴]

ان آیات کا بولتا ہوا پیغام یہ تھا کہ پیغمبرِ اسلام کو ایک دن دنیا سے جانا ہے۔ انؐ کے

جانے کے بعد اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان لانے والوں کو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا ہے جس کے عوض عنقریب انھیں انعام ملے گا۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ مومنین پہلی فرصت میں امیرالمومنین کا انتخاب کریں۔ مسجدِ نبوی میں موجود صحابہ نے فیصلہ کیا کہ ان کی پہلی ترجیح رسول کریم ﷺ کی تدفین ہے۔ [۱۹۵] اس کے بعد ہی پہلی فرصت میسر آسکتی ہے۔

عین اس وقت مسجدِ نبوی میں سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کی خبر بجلی بن کر گری۔ یہ کیسا تضاد تھا کہ چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک طرف مہاجرین اور متعدد انصار رسول کریم ﷺ کی تدفین کے بارے میں سوچ رہے تھے اور دوسری طرف انصاری صحابہ آپؐ کی خلافت کے بارے میں فوری فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہو چکے تھے، اور یہ فیصلہ ہوا ہی چاہتا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ کیا کیا جائے؟ فوری اور فطری ردِعمل تو سخت غصے کا زبانی اور عملی اظہار تھا۔ چودہ صدی پہلے کے عربوں کے مزاج کے پیشِ نظر اس کا اظہار نہ ہونا قدرت کا کرشمہ لگتا ہے۔ بہرحال سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کی خبر ملنے کے بعد، یہ واضح تھا کہ اگر کچھ کرنا ہے تو وہ فوری طور پر کرنا ہے۔ تلواریں سونت لینے سے مدینے کی گلیاں مہاجر اور انصار صحابہ کے خون سے سرخ تو ہوسکتی تھیں لیکن اس کا مطلب یہ ہوتا کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ان کے صحابہ ''الٹے پاؤں پھر گئے۔'' مسجدِ نبوی میں موجود صحابہ کے دماغوں میں سورۃ آلِ عمران کی وہ آیت گونج رہی تھی جو حضرت ابوبکرؓ نے ابھی پڑھی تھی: ''کیا اگر وہ مرجائیں..... تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟''

اگر سقیفہ بنی ساعدہ کے اس انتہائی عجلت میں بلائے ہوئے اجلاس میں، عجلت میں کوئی یک طرفہ فیصلہ ہوجاتا تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد کیا ہوتا؟ مفروضوں پر حتمی بات نہیں کی جاتی۔ تاہم ربع صدی بعد ہونے والی جنگِ جمل اور جنگِ صفین کی مثالیں موجود ہیں جہاں صحابہ ایک دوسرے کی گردنیں مار رہے تھے۔ اگر مسبّب الاسباب کو اسلام قائم و دائم رکھنا مقصود نہ ہوتا تو اس روز، اور اس وقت کوئی ایسا سبب بن جاتا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو دس منٹ کا یہ فیصلہ طے کرنے میں دس منٹ کی دیر ہوجاتی اور مؤرخ رقم کرتا کہ دس منٹوں کی

تاخیر کی وجہ سے صدیوں کی تاریخ بدل گئی، اور یہ بھی ممکن تھا کہ تاریخ میں کچھ بھی رقم نہ ہوتا کیوں کہ اس روز اسلام ختم ہوجاتا۔ اس کے بعد اس واقعے کی تاریخ میں کیا اہمیت باقی رہتی؟ چوپالوں اور قصبوں میں آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ جو تاریخ تو کجا خبر تک نہیں بنتے۔

اس نازک ترین گھڑی میں، اللہ کے دین کا جھنڈا تھامنے کا تاریخی فریضہ حضرت عمرؓ کو سونپا گیا۔ انھوں نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر حضرت ابوبکرؓ کو جو صائب مشورہ دیا، وہ رسول کریم ﷺ کی سیرت کی پہلی مفصل کتاب میں، جو ابنِ اسحاق نے لکھی ہے، ان الفاظ میں درج ہے: ''آیئے ہم اپنے انصاری بھائیوں کے پاس چلتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ وہ کیا کررہے ہیں۔''[۱۹۶]

حضرت ابوبکرؓ نے یہ مشورہ فوراً قبول کرلیا اور مشہور صحابی حضرت ابوعبیدہؓ کو بھی ساتھ لے لیا۔ اگلے دس منٹ میں یہ تینوں صحابہ سقیفہ بنی ساعدہ پہنچ گئے، جہاں اجلاس جاری تھا۔ جس وقت سخت دھوپ میں، یہ چھے قدم، ایک ساتھ، دس منٹ تک، مسجدِ نبوی سے سقیفہ بنی ساعدہ تک اٹھ رہے تھے، اس وقت کسے معلوم تھا کہ کچی زمین سے اٹھتا ہوا یہ ہر قدم تاریخ ساز اقدام ہے جس نے اسلامی تاریخ ہی نہیں بلکہ عالمی تاریخ کا رخ موڑ دیا؟

عالمی تاریخ کا رخ موڑنے والا یہ عجیب وغریب واقعہ، جس کے ذکر سے علامہ شبلی، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری اور مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اجتناب کیا ہے، ہم ایک بار پھر بیانیہ انداز کی بجائے سوال و جواب کے انداز میں بیان کریں گے۔ اس کے بعد یہ اکیسویں صدی عیسوی کے باشعور مسلمان کا کام ہے کہ وہ اس پر غور وفکر کے بعد اپنی رائے قائم کرے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ یہ غیر متوقع اور سنگین خبر سننے کے بعد مسجدِ نبوی میں موجود تمام صحابہ، ایک ساتھ، سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف کیوں نہیں چل پڑے؟ جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو انصاری صحابیوں کو یہ غلط تاثر ملتا کہ مہاجر صحابہ، بن بلائے مہمانوں کی طرح، انصار کے ہنگامی اجلاس میں اپنی عدوی برتری کا مظاہرہ کرنے آئے ہیں۔ اس (غیر ارادی) منفی تاثر کے نتائج مثبت نہیں ہوسکتے تھے۔ مہاجر صحابہ کے سہ رکنی وفد کی آمد سے تاثر یہ ملا کہ یہ وفد نہ مرعوب کرنے

کے لیے آیا ہے، نہ جھگڑا کرنے کے لیے، بلکہ ایک مثبت رویے کے ساتھ ایک مثبت مقصد کے لیے بات چیت کرنے آیا ہے۔ مقصد کا مثبت تاثر از حد ضروری تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ مقصد کیا تھا جسے لے کر یہ سہ رکنی وفد آیا تھا۔ اس کی تاریخی سند موجود ہے۔ وفد کا مقصد حضرت عمرؓ کے اس بے ساختہ جملے میں موجود ہے کہ ''آیئے ہم اپنے انصاری بھائیوں کے پاس چلیں اور معلوم کریں کہ وہ کیا کررہے ہیں؟'' اس طرح اسے ایک معلوماتی اور مصالحتی مشن کہا جاسکتا ہے۔

اگر اس سہ رکنی وفد میں سے کسی ایک صحابی کا مقصد اپنے لیے، یا اپنے میں سے کسی اور کے لیے، خلافت کا حصول ہوتا (جو انصار کا کھلا مقصد تھا) تو وہ انصار کے سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کی طرح، مسجدِ نبوی میں مہاجرین کے (فطری) اجتماع کو، کھلے طور پر، اس غرض سے پہلے ہی استعمال کرلیتے، اور سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کی خبر سننے کے بعد تو وہ لازمی طور پر اپنے اجتماع کو اس غرض سے فوراً استعمال کرتے۔ ان کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آتا کہ صرف دو افراد فوراً مسجدِ نبوی سے سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف چل پڑیں۔ وہ مسجدِ نبوی کے اجتماع سے ایک مینڈیٹ لے کر پوری قوت سے سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف روانہ ہوتے۔

رسول کریم ﷺ کی وفات کے ناقابلِ برداشت صدمے کے فوراً بعد، انصاری صحابہ کا آپؐ کے جسدِ مطہر سے چار فرلانگ پرے جمع ہوجانا جتنا ناقابلِ یقین منفی فیصلہ تھا، مسجدِ نبوی میں موجود مہاجر صحابہ کی اکثریت، اور ان کے قائدین کا اس اشتعال انگیز فیصلے سے بردباری اور دوراندیشی سے نپٹنا اتنا ہی ناقابلِ یقین مثبت فیصلہ تھا۔ ایسے نازک موقع پر ایسا فیصلہ کرنے کی توفیق اللہ ہی دے سکتا ہے۔ یہ بندے کے بس کی بات نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کو اس سہ رکنی وفد کا رکن کیوں بنایا گیا؟ اس کا مختصر ترین جواب، جو مختصر ہونے کے ساتھ مکمل بھی ہے، یہ ہے کہ مکے میں ''امین'' کا لقب پانے والےؐ نے مدینے میں ابوعبیدہؓ کو ''امین الامت'' کا لقب دیا تھا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جب مہاجر صحابہ کی اکثریت مسجدِ نبوی میں بیٹھی تھی، تو حضرت

علیؓ کہاں بیٹھے تھے؟ جواب ہے کہ وہ مسجد کے بالکل ساتھ اپنے (اور حضرت فاطمہؓ) کے حجرے میں بیٹھے تھے۔

اس کی وجہ یہ لکھی گئی ہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ اگلے صفحات میں آپؐ کی تجہیز و تکفین کا مرحلہ وار جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی تجہیز و تکفین کے سب فیصلے، ان کے جملہ انتظامات، اور ان انتظامات پر عمل درآمد کا آغاز آپؐ کے وصال کے اگلے روز منگل کو کسی وقت ہوا، اور آپؐ کو اس انتہائی گرم موسم میں، خاصی تاخیر سے، منگل اور بدھ کی درمیانی رات کو کسی وقت دفن کیا گیا۔ اس تاخیر پر تاویل حاضر، اور تاریخ خاموش ہے۔ تاریخ بوجوہ خاموش ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ حجرے میں اور کون تھا؟ گو حجرے میں حضرت عباسؓ سمیت کئی دوسرے صحابہ ہو سکتے ہیں لیکن تاریخ میں صرف حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کے نام ہیں۔ حضرت زبیرؓ حضرت ابوبکرؓ کے داماد تھے اور حضرت طلحہؓ حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے کئی برس بعد ان کے داماد ہوئے۔

حضرت زبیرؓ اس وقت حضرت ابوبکرؓ کی سب سے بڑی بیٹی حضرت اسماؓ کے شوہر تھے۔ یہ وہی اسماؓ ہیں جنھوں نے یکم ربیع الاوّل ۱ھ (۱۳ ستمبر ۶۲۲ء) بروز پیر، آپؐ کا اور اپنے والد کا سفری کھانا لے کر، غارِ ثور پر پہنچنے کے بعد، اپنے کمر بند کو کاٹ کر، اس کے ایک حصے سے آپؐ اور اپنے والد کا سفری کھانا باندھ کر لٹکایا تھا، اور اس فوری خدمت پر دربارِ رسالتؐ سے فوراً ''ذات النطاقین'' کا لقب پایا تھا۔ حضرت طلحہؓ، حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد، حضرت ابوبکرؓ کی سب سے چھوٹی بیٹی حضرت ام کلثوم کے شوہر ہوئے۔ واضح رہے کہ حضرت ام کلثوم کی ولادت حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد ہوئی تھی۔

رسول کریم ﷺ کے وصال کے فوراً بعد، یہ دونوں صحابہ اپنے خسر، یا ہونے والے خسر، کے ساتھ مسجدِ نبوی میں ہونے کی بجائے، مسجدِ نبوی سے متصل حجرے میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ ربع صدی بعد، جمادی الثانی ۳۶ھ (دسمبر ۶۵۶ء) میں، بصرہ (عراق) میں ہونے

والی جنگِ جمل میں، یہی دونوں صحابہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں پیش پیش تھے۔ دونوں جنگِ جمل میں کام آئے۔ اسے کیا کہا جائے گا؟

چھٹی، آخری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سوال کا کیا جواب ہے کہ خلیفۂ اول کے انتخاب کے پورے عمل میں، حضرت علیؓ کو نہ صرف یہ کہ خلیفہ نہیں چنا گیا، بلکہ انھیں پورے انتخابی عمل سے الگ تھلگ رکھا گیا۔ اس سوال کا جواب تاریخ کے اوراق سے یہ ملتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد، حضرت علیؓ خود مہاجر (اور انصار) صحابہ کی اکثریت کے اجتماعات سے الگ تھلگ ہو گئے۔ جب پیر کے روز عزادار مہاجر اور انصاری صحابہ مسجدِ نبوی میں جمع ہو گئے تھے، تو وہ وقت آپؐ کے سب مرد اعزّا کے لیے مسجدِ نبوی میں موجود ہونے کا تھا، جس سے چند گز کے فاصلے پر جسدِ مطہر تھا۔ اگر پیر کی دوپہر حضرت علیؓ بھی خواہ تھوڑی دیر کے لیے، مسجدِ نبوی میں آ جاتے، تو یہ ناممکن تھا کہ ان سے مشورہ نہ کیا جاتا۔ اسی طرح اگر وہ، یا حضرت عباسؓ، اپنے طور پر پیر کے روز کسی وقت سقیفہ بنی ساعدہ پہنچ جاتے، تو یہ ناممکن تھا کہ کوئی انھیں اس ڈیرے میں داخل ہونے، یا وہاں بیٹھنے، یا وہاں بولنے سے روکنے کی جرأت کرتا۔ مسجدِ نبوی یا سقیفہ بنی ساعدہ میں آنے کے لیے، حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ کو دعوت نامے نہیں بھیجے گئے۔ جس نے آنا چاہا، وہ پہنچ گیا۔ جس نے نہ آنا چاہا، وہ نہیں پہنچا۔

جو پہنچا، وہ مشوروں میں بھی شریک رہا اور فیصلہ سازی میں بھی۔ جو نہ پہنچا وہ ان میں کیسے شریک ہو سکتا تھا؟ اگر یہ ہوا ہوتا کہ انصاری صحابہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو تو سقیفہ بنی ساعدہ میں بلاتے اور حضرت علیؓ کو نہ بلاتے، یا اگر حضرت علیؓ وہاں جاتے اور انھیں بیٹھنے یا بولنے سے روکا جاتا، تو بات مختلف ہوتی۔ یہی بات مسجدِ نبوی کے اجتماع کے لیے کہی جا سکتی ہے۔

بات مختلف ضرور ہوتی لیکن بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی۔ گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی آنکھیں بند ہوتے ہی قبائلی رواج آپؐ کی بعض تعلیمات پر حاوی ہو گئے تھے، جس کا ایک مظہر قبائلی تفوق کی بنا پر خلافت پر اپنا حق جتانا تھا۔ اس کا اظہار ہر طرف سے ہوا، اور کھل کر ہوا۔

حضرت ابوبکرؓ نے مہاجر صحابہ کی طرف سے یہ کہہ کر خلافت کا حق جتایا کہ مہاجر صحابہ، حسب ونسب کے اعتبار سے، عرب کے تمام باشندوں میں ممتاز ہیں اور قبائلی روایات کے مطابق عرب قوم قریش کے سوا کسی اور کی سیادت ماننے کو تیار نہ ہوگی۔ حضرت ابوبکرؓ کی یہ بات اتنی مبنی برحقیقت تھی کہ انصاری صحابہ نے تسلیم کر لی۔ یہ بات اتنی مبنی برحقیقت تھی کہ صدیوں بعد تک خلیفہ قبیلہ قریش سے ہوتا رہا۔

بنو ہاشم سمجھتے تھے کہ رسول کریم ﷺ سے نزدیکی قرابت داری کی وجہ سے خلافت پر ان کا خاندانی حق ہے۔ پچھلے صفحات میں، اس موضوع پر خاصی تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ بنو ہاشم کی یہ بات، جس کی بنیاد قبیلے کے ایک خاندان کا تفوق تھا، نہیں مانی گئی۔ مدینے میں موجود اور مقیم صحابیوں کی غالب اکثریت نے خلافت کو ایک خاندان یعنی بنو ہاشم کا خاندانی حق نہیں سمجھا۔ دوسرے الفاظ میں، مہاجر وانصار صحابہ کی غالب اکثریت نے قریش کا ''قبائلی'' تفوق تو تسلیم کر لیا لیکن بنو ہاشم کا ''خاندانی'' تفوق تسلیم نہیں کیا۔ اس غالب اکثریت نے خلیفہ کی نامزدگی کی توثیق کا اختیار اس مجلسِ شوریٰ کو دیا جو مدینے میں مقیم اور موجود مہاجر اور انصار صحابہ پر مشتمل تھی اور اس مجلسِ شوریٰ کا فیصلہ حضرت علیؓ کے اپنے الفاظ میں ''کان ذلک اللّٰہ رضی'' یعنی ''اللہ کی رضا'' سمجھا گیا۔ یہ الفاظ ذیل میں وضاحت سے درج ہیں۔

حضرت علیؓ کے مندرجہ بالا الفاظ نہج البلاغۃ میں ہیں، اور ''حمایتِ اہلِ بیعت وقف (رجسٹرڈ)'' ریلوے روڈ لاہور کی شائع کردہ نہج البلاغۃ کے، جس کے ناشر شیعہ جنرل بک ایجنسی، انصاف پریس لاہور ہیں، صفحہ ۶۸۴ پر ہیں۔ اس کا پسِ منظر یہ ہے کہ جنگِ صفین (صفر ۳۸ھ/ جولائی ۶۵۸ء) سے ایک سال پہلے، حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے درمیان بہت سے خطوط کے تبادلے ہوئے۔ ابتدائی خطوط میں سے ایک خط میں، امیر معاویہ نے اپنا جو موقف بیان کیا، وہ مندرجہ بالا کتاب کے صفحہ ۶۸۶ پر، ان الفاظ میں درج ہے:

''(۱) علیؓ کی بیعت مدینہ میں ہوئی اور میں بیعت کے وقت شام میں تھا۔ چوں

کہ میں نے بیعت ہی نہیں کی، لہٰذا مجھ سے اطاعت کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اطاعت وہ کرے جو آپؑ کو خلیفہ تسلیم کرے۔''

''(۲) مجھے شوریٰ میں شامل نہیں کیا گیا، لہٰذا انتخاب ازسرِ نو ہونا چاہیے تاکہ میں بھی اپنی رائے دہندگی کا حق استعمال کر سکوں۔''

امیر معاویہ کا یہ موقف خلیفہ کے انتخاب (یا اس کی نامزدگی کی توثیق) کے لیے اس محدود حلقۂ انتخاب کو مسترد کرتا ہے۔ جو صرف ان صحابہ پر مشتمل ہو، جو خلیفہ کے انتخاب (یا اس کی نامزدگی کی توثیق) کے وقت مدینے میں موجود ہوں۔

حضرت علیؓ نے جواب میں لکھا:

عربی متن	اردو ترجمہ
(۱) انہٗ بایعنی القوم الذین بایعو ابابکر و عمر و عثمان.	(۱) حقیقت یہ ہے کہ میری بیعت ان ہی لوگوں نے کی جنھوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی۔
(۲) وانما الشوریٰ للمهاجرین والانصار فان اجتمعو علیٰ رجل وسموہ اماما	(۲) اور جہاں تک شوریٰ کا تعلق ہے، سو وہ صرف مہاجرین وانصار کا حق ہے، اگر وہ کسی شخص پر متفق ہو جائیں اور اسے امام کا لقب دیں
(۳) کان ذٰلک اللّٰہ رضی.	(۳) تو اسے اللہ کی رضا سے تعبیر کیا جائے گا۔

حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے اپنی خلافت کی مماثلت دینے کے بعد، شوریٰ کی ہیئت ترکیبی اور امام کے طریقۂ انتخاب کے بارے میں جو کچھ کہہ کر اسے ''اللہ کی رضا'' سے تعبیر کیا، اسے پڑھنے کے بعد اکیسویں صدی عیسوی کا باشعور مسلمان خود تفکر کرے تو اسے بہت سے سوالات کے جوابات ملتے جائیں گے، جو مسئلۂ خلافت تک محدود نہیں۔

مدینے میں مقیم اور موجود مہاجر صحابہ کے درمیان اگرچہ زبردست تناؤ موجود تھا لیکن

ان میں سے کسی صحابی نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا، جو بے ادبی یا عاقبت نااندیشی کہلائے۔ اس کے برعکس انصاری صحابہ کی اکثریت نے جو قدم اٹھائے، وہ نہ صرف اخلاقی طور پر انتہائی غلط تھے بلکہ اگر وہ کامیاب ہوجاتے تو اسلام کے لیے تباہ کن ہوتے۔ اس کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔

اولاً خود مدینے میں قبیلہ اوس کے بہت سے افراد قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعدؓ بن عبادہ کی خلافت قبول نہ کرتے۔ ان دونوں قبیلوں میں صدیوں تک باہمی خون ریزی ہوتی رہی تھی۔ صدیوں تک جلتی ہوئی آگ دس سال میں یکسر بجھ نہیں سکتی۔ آپؐ کو مدینہ بلانے کے بعد، یہ دونوں قبائل، آپؐ کی سیادت میں، امن وامان سے رہنے لگے تھے لیکن ایک حریف قبیلے کا سردار اگر سب کا سردار بن جاتا تو یہ آگ پھر بھڑک سکتی تھی اور ایسی بھڑکتی کہ سب کچھ بھسم کر ڈالتی۔

ہجرتِ مدینہ سے ڈھائی ماہ پہلے ہونے والی دوسری بیعتِ عقبہ کی بنیادی شق یہ تھی کہ انصارِ مدینہ آپؐ کی حفاظت اپنی جانوں اور اپنے بال بچوں کی طرح کریں گے۔ انصار نے نہ صرف یہ عہد نبھایا بلکہ اس سے کہیں آگے بڑھ کر مدینے ہجرت کرنے والے صحابہ کو اپنا دینی بھائی بنا کر اپنے گھروں میں رکھا اور اپنے کاروبار میں شریک کیا، حالاں کہ ایسا کرنا دوسری بیعتِ عقبہ کا حصہ نہ تھا۔

دوسری بیعتِ عقبہ نہ ہوتی تو خزرج کا سردار عبداللہ بن ابی مدینے کا سردار بن جاتا۔ اوس اور خزرج دونوں اس پر متفق ہو چکے تھے، حتیٰ کہ اس کی تاج پوشی کے لیے مرجان (مونگے) کا تاج تیار کیا جارہا تھا۔ دوسری بیعتِ عقبہ نے سب کچھ بدل دیا۔ عبداللہ بن ابی کی قسمت میں، سردار کی بجائے، منافق کا لقب آیا، اور وہ آج تک عبداللہ بن ابی منافق کے پورے نام سے جانا جاتا ہے۔ جب عبداللہ بن ابی منافق چل بسا تو خزرج نے حضرت سعدؓ بن عبادہ کو اپنا سردار منتخب کرلیا۔ یہ انتخاب رسول کریم ﷺ کی حیات ہی میں ہوگیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد قبیلہ خزرج کی ایک بار پھر یہ خواہش تھی کہ اس بار ان کے قبیلے کا سردار مدینے کا امیر بن جائے۔ وہ اس بار بھی ناکام رہے۔

ربیع الاوّل ۱۱ھ میں، انصار اس معروضی حقیقت کو بھلا بیٹھے کہ ۸ھ اور ۱۱ھ میں فرق

صرف دس سال کا نہیں بلکہ زمین آسمان کا تھا۔ دس سال پہلے عبداللہ بن ابی مدینے کا سردار بن جاتا تو وہ صرف پانچ چھے ہزار آبادی والے مدینے کا سردار ہوتا۔ ربیع الاوّل ۱۱ھ میں حضرت سعدؓ بن عبادہ مدینے کا سردار بنتے تو وہ صرف مدینے کے نہیں بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے امیر ہوتے۔ اگر شروع میں ان کا حریف قبیلہ اوس ان کے ساتھ بھی کھڑا ہوتا، تب بھی اوس اور خزرج کے منتخب کردہ سردار کو سب سے پہلے تو مدینے میں موجود اور مقیم مہاجر صحابہ تسلیم نہ کرتے۔ اس کے بعد مکے میں مقیم نومسلم صحابی تسلیم نہ کرتے، جو تعداد، تمول اور حربی قوت میں، اوس اور خزرج دونوں پر برتری رکھتے تھے اور مکے اور مدینے والوں کی مخالفت ظاہر ہونے کے بعد، جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے علاقوں بشمول طائف اور یمن کو حضرت سعدؓ بن عبادہ کی مخالفت کا مضبوط جواز مل جاتا۔ نوزائیدہ اسلامی مملکت میں وسیع پیمانے پر جنگ چھڑ جاتی جس میں فائدہ کسی کا نہ ہوتا اور نقصان سب کا ہوتا۔ نہ جانے کتنا؟

انصار اس حقیقت کو بھی فراموش کر بیٹھے کہ مسجدِ نبوی میں دیئے گئے آخری خطبے میں، آپؐ نے انصار کے بارے میں جو خصوصی وصیت کی تھی، اس میں انصار کو کیا پیغام دیا گیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا تھا: ''جو تمھارے نفع ونقصان کا متولی ہو، اسے چاہیے کہ ان (انصار) میں جو نیکوکار ہوں، انھیں قبول کرے اور جو خطاکار ہوں، انھیں معاف کرے۔''[۲۷]

کیا ان الفاظ سے یہ واضح تاثر نہیں ملتا کہ آپؐ بتارہے تھے کہ آپؐ کے بعد مسلمانوں کے متولی انصار نہیں ہوں گے۔ اگر خلیفہ انصار میں سے ہوتا تو اسے یہ وصیت کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ انصار میں جو نیکوکار ہوں وہ انھیں قبول کرے، اور جو خطاکار ہوں، انھیں معاف کرے۔

ثانیاً وہ صحابہ جو ذی قعد ۶ھ (مارچ ۶۲۸ء) میں ہونے والی صلح حدیبیہ کے بعد پچھلے چار برسوں کے دوران میں، وقتاً فوقتاً اسلام لائے تھے، اور خصوصاً وہ صحابی جو دیہاتوں میں آباد تھے، ان سب کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ صرف زبان سے کلمہ پڑھنے کے بعد ان کے دلوں میں ایمان بھی داخل ہوگیا تھا۔ خود مدینے میں منافقین موجود تھے۔ اس کا ثبوت قرآن ہے

جس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا؟ سورۃ حجرات (نمبر ۴۹) کی ۱۴ ویں آیت کا رواں ترجمہ ہے:

''دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ تمھیں یہ کہنا چاہیے کہ ہم جھک گئے کیوں کہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

سورۃ توبہ (نمبر ۹) کی ۱۰۱ ویں آیت میں، اہلِ مدینہ کا بھی ذکر ہے اور اس کا رواں ترجمہ یہ ہے:

''اور کچھ تمہارے گردوپیش والے دیہاتیوں میں، اور کچھ اہلِ مدینہ میں ایسے منافق شامل ہیں کہ نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔ آپؐ انھیں نہیں جانتے۔ ہم انھیں جانتے ہیں۔ ہم انھیں دہری سزا دیں گے۔''

منافق وہ شخص ہے جو زبان اور اعمال سے تو خود کو مسلمان ظاہر کرے لیکن دل سے اسلام کے خلاف ہو۔ مثلاً زبان سے کلمہ پڑھے، دکھاوے کے لیے نماز پڑھے، روزہ رکھے، حج کرے اور زکوٰۃ دے لیکن دل میں کافر رہے۔ رسول کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد، مدینے کے مضافات میں آباد بعض قبائل نے، جو اسلام لا چکے تھے، زکوٰۃ دینے سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ بات منافق سے آگے بڑھ چکی تھی۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے یہ منکرین اتنی کثیر تعداد میں تھے کہ بعض برگزیدہ صحابہ نے، جن میں حضرت عمرؓ جیسا سخت گیر صحابی بھی شامل تھا، خلیفہ اول سے کہا کہ حالات اتنے تشویش ناک ہیں کہ مصلحت سے کام لیا جائے اور ان منکرینِ زکوٰۃ سے فی الحال تعرض نہ کیا جائے۔

اس فیصلہ کن موقع پر، حضرت ابوبکرؓ تاریخ کے سٹیج پر پھر ایک مردِ آہن کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ قدرت کیا کرشمے دکھا رہی تھی؟ حضرت ابوبکرؓ نے وہ کیا جس کی حضرت عمرؓ سے توقع کی جانی چاہیے تھی اور حضرت عمرؓ نے وہ کہا جس کی حضرت ابوبکرؓ سے توقع ہو سکتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اللہ کے آسرے پر یہ بظاہر دانش مندانہ مشورہ نہ مانا اور اللہ نے انھیں سرخ رو کیا۔

دوسری کہیں زیادہ سنگین مثال مکے کے صحابیوں کی ہے۔ جوں ہی رسول کریم ﷺ کی وفات کی خبر مکے پہنچی تو وہاں کے صحابہ کی اکثریت نے اسلام سے پھر جانے کا قصد کیا۔ ان

کی تعداد اتنی کثیر اور ان کے عزائم اتنے خطرناک تھے کہ مکے کے نوجوان گورنر نے، جنھیں خود رسول کریم ﷺ نے ڈھائی سال پہلے، گورنر مکہ مقرر کیا تھا، بھاگ جانے میں عافیت جانی۔ گورنر روپوش ہو گئے۔[۱۹۷] مکے کو عرب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اگر مکے میں رہنے والے صحابہ مرتد ہو جاتے تو اس کے اثرات فوری طور پر پورے عرب پر پڑتے اور حضرت ابوبکرؓ کو اس سے نپٹنا محتاط الفاظ میں، آسان نہ ہوتا۔

فطرت اپنے مقاصد کی نگہ بانی کے لیے جس کا چاہے انتخاب کر لیتی ہے۔ اس وقت تاریخ کے سٹیج پر حضرت سہیلؓ بن عمرو نظر آتے ہیں۔ تاریخ کی کتابوں نے ان کے فیصلہ کن تاریخی کردار کو تاحال نظرانداز کیا ہے جس کی وجہ سے اکیسویں صدی عیسوی کے بیشتر مسلمان کو غالباً معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کون تھے، ان کے تاریخی کردار کے بارے میں علم ہونا تو بہت بعد کی بات ہے۔

حضرت سہیلؓ بن عمرو وہی سہیل بن عمرو ہیں جنھوں نے چار سال پہلے حدیبیہ کے مقام پر کفارِ مکہ کے سفیر اور ترجمان کی حیثیت سے رسول کریم ﷺ سے، اپنی اور کفارِ مکہ کی دانست میں، کفار کے حق میں کامیاب مذاکرات کیے تھے۔ انھوں نے ''**بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم**'' پر اعتراض کیا اور **باسمک اللھم** لکھوایا تھا۔ انھوں نے محمدؐ رسول اللہ کے الفاظ پر اعتراض کیا اور رسول اللہ کے الفاظ کٹوا کر محمدؐ بن عبداللہ لکھوایا تھا۔ انھوں نے معاہدے میں یہ سخت شرط لکھوائی تھی کہ اگر قریش کا کوئی مرد اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر، یعنی بھاگ کر، مدینے جائے گا تو اسے قریش کو واپس کر دیا جائے گا لیکن اگر مدینے سے کوئی شخص پناہ کی غرض سے بھاگ کر قریش کے پاس آئے گا تو قریش اسے واپس نہ کریں گے۔ یہ شرط آپؐ کے صحابہ کو سخت ناگوار گزری تھی۔ یہ شرط لکھی جا چکی تھی مگر ابھی صلح نامہ لکھا ہی جا رہا تھا، اور اس پر دستخط نہیں ہوئے تھے، کہ سہیل بن عمرو کے نوجوان بیٹے ابوجندل کفارِ مکہ کے چنگل سے نکل کر اپنی بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے پہنچ گئے۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ اس معاہدے کے تحت یہ پہلا شخص ہے جس کی واپسی کا میں آپؐ سے مطالبہ کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ابھی تو ہم صلح نامہ لکھ ہی رہے

ہیں، یہ مکمل نہیں ہوا۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو میں آپؐ سے کسی بات پر صلح نہیں کروں گا۔ آپؐ نے کہا: ''اس کو میری خاطر چھوڑ دو۔'' سہیل بن عمرو نے کہا کہ میں اسے آپؐ کی خاطر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ رسول کریم ﷺ نے انتہائی دل گرفتگی کے عالم میں کہا: ''سہیل! اتنا تو کر ہی دو۔'' سہیل بن عمرو نے کہا کہ نہیں میں نہیں کروں گا۔ یہ کہہ کر سہیل بن عمرو نے اپنے بیٹے کے مونہہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا، اور ان کا گریبان پکڑ کر گھسیٹا۔ ابوجندل چیخ اٹھے کہ مسلمانو! کیا تم مجھے مشرکین کے حوالے کر رہے ہو کہ وہ مجھے دین کے بارے میں فتنے میں ڈال دیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کے دل پر جو گزری ہوگی، وہ اللہ اور اس کا رسولؐ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''ابوجندل! صبر کرو۔ اللہ تمہارے لیے اور تمہارے دوسرے کم زور مسلمان ساتھیوں کے لیے کشادگی اور پناہ کی جگہ بنائے گا۔ ہم نے قریش سے صلح کر لی ہے اور ہم نے انھیں اور انھوں نے ہمیں، اس پر اللہ کا عہد دیا ہے۔ ہم بدعہدی نہیں کر سکتے۔'' [۱۹۸] صلح نامے کی اس شرط، اور ابوجندل کے ساتھ پیش آنے والے اس واقعے پر، صحابہ نے پہلی، اور آخری، بار آپؐ کے سامنے اپنے تحفظات کا کھلم کھلا اظہار کیا تھا۔ [۱۹۹]

سہیل بن عمرو ایک بغل میں اپنے بیٹے اور دوسری بغل میں معاہدے کو دبائے حدیبیہ سے ۱۵ میل دور مکے لوٹے تو کفار نے اسے اپنی ''فتح'' قرار دیا۔ جب رسول کریم ﷺ اس معاہدے کے ساتھ، اپنے ۱۴۰۰/ صحابہ کو لیے ہوئے، ۳۰۰ میل دور مدینے لوٹے تو اللہ تعالیٰ نے اسے مسلمانوں کے لیے ''فتحِ مبین'' قرار دیا۔ حدیبیہ اور مدینے کے درمیان، راستے میں، سورۃ فتح (نمبر ۴۸) کا بیشتر حصہ نازل ہوا۔ اس سورت کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ یہ سورۃ مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ [۲۰۰] سورۃ کی ابتدائی آیات کا رواں ترجمہ یہ ہے:

> ''ہم نے تمھیں کھلی فتح عطا کر دی تا کہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دے اور تمھیں سیدھا رستہ دکھائے اور تمھیں زبردست نصرت بخشے۔''

کسی انسان کو اس سے زیادہ پُرقوت الفاظ میں بشارت کیا مل سکتی ہے؟ اگر بات اللہ

کی بجائے انسان نے کہی ہوتی تو ہم کہتے کہ ظالم نے قلم توڑ دیا۔ جب اللہ اپنی نعمتیں تمام کر دے تو پھر بندے کے پاس مانگنے کے لیے کیا رہ جاتا ہے؟ جب یہ سورۃ اتری تو بعض صحابہ حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ کیا اس وحیِ الٰہی میں ''کھلی فتح'' سے مراد حدیبیہ میں ہونے والی صلح ہے؟ اس وقت یہ سوال بلاجواز نہ تھا۔ مستقبل قریب کے پے در پے ہونے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس صلح کے بعد مسلمانوں کو فتوحات ملتی گئیں، یہ فتح نہ صرف جنگ لڑے بغیر ملی بلکہ ایسی کڑی شرط پر، اور ان حالات میں جنگ نہ کرنے کے معاہدے کرنے پر ملی، جو شرط مسلمانوں کے نزدیک توہین آمیز تھی۔ قدرت کے راز قدرت ہی جانتی ہے۔ چار برس بعد، ربیع الاوّل ۱۱ھ بمطابق (جون ۶۳۲ء) میں جو ہو رہا تھا، وہ بھی قدرت کے راز ہیں۔ اب سلسلۂ کلام کو حضرت سہیلؓ بن عمرو سے جوڑتے ہیں۔

ذی قعد ۶ھ کو، حدیبیہ میں مکے والوں کی طرف سے مرکزی کردار سہیل بن عمرو تھے۔ ۱۱ھ کو ماہ ربیع الاوّل میں، مکے میں، مسلمانوں کی طرف سے مرکزی کردار بھی حضرت سہیلؓ بن عمرو تھے۔ جب بات یہاں تک پہنچی کہ گورنر مکہ، جنھیں ۸ھ میں آپؐ نے فتحِ مکہ کے بعد مقرر کیا تھا، فرار ہو گئے تو حضرت سہیلؓ بن عمرو نے مکے کے صحابہ کو جمع کیا اور انھیں کہا کہ ''اے اہلِ قریش! خدا کے لیے ذرا سوچو تو سہی، تمام لوگوں کے بعد تم اسلام لائے، اور آج تمام لوگوں سے پہلے تم اسلام سے باہر نکلنے کے لیے تیار ہو چکے ہو۔ یاد رکھو رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ قریش کی برتری قائم رکھنے کے لیے قریش کے ہاتھ سے ہی ان کی نصرت کرائے گا۔ کان کھول کر سن لو۔ جس شخص نے اسلام سے منہ پھیرا، اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔'' [۲۰۱]

یہ حضرت عمرؓ کی زبان اور ان ہی کا لہجہ معلوم ہوتا ہے۔ عرب اس لہجے اور زبان کو سمجھتے تھے۔ ڈگمگانے والے قدم سنبھل گئے۔ گورنر مکہ روپوشی سے نکل آئے۔ دوبارہ گورنر بن گئے۔ [۲۰۲] سہیلؓ بن عمرو نے، ۶ھ میں، غیر ارادی اور لاشعوری طور پر، اور ۱۱ھ میں، پوری قوتِ ارادی سے شعوری طور پر، اسلام کی فتح کے لیے کلیدی کردار ادا کیا۔

مدینے اور اس کے گردونواح کا حال قرآن بتا چکا ہے۔ اہلِ مکہ کا حال اوپر بیان

کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد عرب کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے نومسلم قبائل کی استقامتِ ایمانی کا اندازہ لگانا گو مشکل نہیں، تاہم اس کا بھی مختصر ذکر ہو جائے۔

سب سے بڑا فتنہ جزیرہ نمائے عرب میں، مشرق کی سمت سے، نجد میں اٹھا جہاں موجودہ بادشاہت کا دارالسلطنت ریاض واقع ہے۔ نجد کے ایک قبیلے بنو اسد کے سردار طلیحہ نے رسول کریم ﷺ کے انتقال کی خبر سنتے ہی اپنی نبوت کا اعلان کر دیا۔ نجد کی فتنہ انگیز زمین سے ہی نبوت کا دوسرا دعویدار مسلیمہ اٹھا جسے دنیا رسول کریم ﷺ کے دیئے ہوئے لقب ''کذّاب'' سے جانتی ہے۔ مسلیمہ کذاب نے آپؐ کی زندگی میں ہی نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اس نے آپؐ کو اس مضمون کا خط لکھا:

''یہ خط اللہ کے رسول مسلیمہ کی طرف سے اللہ کے رسول محمدؐ کے لیے ہے۔ میں اور آپؐ دونوں اس معاملے (یعنی حکومت اور رسالت) میں برابر برابر کے شریک کیے گئے ہیں۔ اس لیے نصف زمین ہمارے لیے ہونی چاہیے اور نصف قریش کے لیے، لیکن قریش ایسی قوم ہے جو حد سے تجاوز کرتی ہے۔''

آپؐ نے اپنے جواب میں، اسے ''مسلیمہ کذّاب'' کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

''یہ خط اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے مسلیمہ کذاب کے لیے ہے..... امابعد، زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، زمین کا وارث بنا دیتا ہے۔ خیر کا انجام پرہیزگاری ہوتا ہے۔'' [۲۰۳]

یہ تو تھے عرب کی سرحدوں کے اندر کے خطرات۔ اب خارجی خطرات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اسلام کی نوزائیدہ ریاست کے لیے، ایک سٹریٹیجک خطرہ مملکتِ مدینہ کے شمال میں، عرب اور شام کے درمیان واقع سرحدی علاقوں میں منڈلا رہا تھا، جس پر اپنی زندگی کے آخری دو برسوں میں آپؐ کی توجہ مرکوز رہی۔ رسول کریم ﷺ کی مدینے میں آمد کے بعد، وہاں صدیوں سے آباد یہودیوں کے جو مالدار اور طاقتور قبیلے وقتاً فوقتاً مدینے اور اطرافِ مدینہ سے نکالے جاتے رہے تھے، وہ سب وہاں سے نکل کر عرب اور شام کے درمیان ان سرحدی علاقوں

میں آباد ہو گئے تھے جہاں ان کے ہم قبیلہ، یا ہم مذہب، ایک زمانے سے رہ رہے تھے۔ یہ علاقے بازنطینی سلطنت کے عیسائی بادشاہ کی سلطنت کا حصہ تھے، جس کا شاہی لقب ہرقل ہوا کرتا تھا۔ ان سرحدی علاقوں میں آباد یہودی مدینے سے اپنی جلاوطنی کا بدلہ لینے کے لیے موقع کی تاک میں تھے۔ آج بھی عظیم تر اسرائیل کے مجوزہ نقشے میں مدینے کو شامل کیا جاتا ہے، مکے کو نہیں۔

عربی بولنے والے ''یہودی'' قبائل کے علاوہ، عرب اور شام کے درمیان ان سرحدی علاقوں میں عربی النسل ''عیسائی'' قبائل کی بڑی تعداد آباد تھی۔ یہ ان مشرک عربوں کی آل اولاد تھے جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور ان زرخیز علاقوں میں جا بسے۔ ۶ھ میں صلحِ حدیبیہ کے بعد، آپؐ نے ان علاقوں کے عربی النسل گورنروں کو، جو بازنطینی سلطنت کے نمائندے تھے، اپنے قاصدوں کے ہاتھ خطوط بھیجے۔ آپؐ کے ایک قاصد کو دمشق کے قریب شہید کر دیا گیا۔ قاصد کی شہادت کا قصاص لینے کے لیے، آپؐ نے، تقریباً سال بھر بعد، جمادی الاولیٰ ۸ھ (ستمبر ۶۲۹ء) میں تین ہزار صحابہ پر مشتمل فوج، اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ بن حارثہ کی قیادت میں بھیجی، جو منزلیں مارتی ہوئی اردن تک پہنچ گئی۔

اس فوج میں آپؐ کے سگے چچازاد بھائی اور حضرت علیؓ کے سگے بڑے بھائی، حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب اور عظیم جنرل خالدؓ بن ولید جیسے ممتاز صحابہ بھی عام سپاہیوں کے طور پر رضاکارانہ شامل ہوئے۔ ہرقل نے مقابلے کے لیے کوئی ایک لاکھ فوج میدان میں اتار دی۔ جمادی الاولیٰ ۸ھ (ستمبر ۶۲۹ء) میں، موجودہ ملک اردن کے ایک مقام موتہ پر جنگ ہوئی۔ پہلے سپہ سالار زیدؓ بن حارثہ شہید ہوئے۔ فوج کی کمان جعفرؓ ابن ابی طالب نے سنبھالی۔ انھوں نے بھی شہادت پائی۔ پھر ایک شاعر صحابی عبداللہؓ بن رواحہ نے علم تھاما۔ وہ بھی شہید ہو گئے۔ آخر میں مسلمانوں نے خالدؓ بن ولید کو اپنا سپہ سالار منتخب کیا۔

خالدؓ ایک پیدائشی جنرل تھے۔ انھیں اس بارے میں شبہ نہ تھا کہ مدینے سے سیکڑوں میل دور، دشمن کی اپنی سرزمین پر، تین ہزار کے لشکر اور ایک لاکھ کی فوج کے درمیان مقابلہ ممکن نہیں۔ اگر مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کو شکست ہو جائے گی۔ وہ اپنی فوج کو بھاری نقصان، یا

شکست، سے دوچار کیے بغیر مدینے واپس لے آئے۔ رسول کریم ﷺ نے انھیں ''سیف اللہ'' کے خطاب سے نوازا۔ مسلمانوں میں جنگِ موتہ کا منفی تاثر زائل کرنا ضروری تھا۔ ہرقل اور اس کے گورنروں پر بھی واضح کرنا ضروری تھا کہ مسلمان ان کی قوت سے خائف نہیں اور وہ مدینے کو میلی آنکھ سے نہ دیکھیں۔ اگلے سال ۹ھ (۶۳۰ء) میں، رسول کریم ﷺ گزشتہ سال سے دس گنی فوج یعنی ۳۰ ہزار صحابہ کے ساتھ مدینے سے تبوک کے لیے روانہ ہوئے، جو عرب اور شام کی سرحد پر واقع تھا۔ بیس روز تبوک میں پڑاؤ رہا اور ایک مہینا آنے جانے میں لگا۔ یہ فوج کوئی بڑی جنگ لڑے بغیر واپس آ گئی۔

غزوۂ تبوک کے ایک سال بعد، اپنی زندگی کے آخری ایام میں، آپؐ نے زیدؓ بن حارثہ کے نوجوان بیٹے اسامہؓ کی قیادت میں ایک بار پھر اسلامی لشکر شام کی سرحد پر بھیجنے کے لیے تیار کرلیا۔ اس لشکر میں حضرت عمرؓ جیسے صحابہ ایک عام سپاہی کے طور پر شامل ہوئے۔ ۸ھ میں جنگِ موتہ، ۹ھ میں غزوۂ تبوک اور ۱۱ھ کے آغاز میں اسی سرحد پر بھیجنے کے لیے اسلامی فوج کی تیاری سے یہ واضح ہے کہ ۸ھ (۶۲۹ء) میں فتحِ مکہ کے بعد، آپؐ کی نظروں میں اسلامی ریاست کو اصل خطرہ اب جلاوطن یہودیوں، عربی النسل عیسائیوں اور شام کی طرف سے تھا۔ مرتے دم آپؐ کی زبردست خواہش تھی کہ یہ لشکر فوراً شام کی سرحد کی طرف کوچ کردے۔

یہ وہ گمبھیر پسِ منظر تھا جس میں ان ہولناک داخلی اور خارجی خطرات سے یکسر بےخبر اور بے نیاز، خزرج کے سردار حضرت سعدؓ بن عبادہ، ایک گرم دوپہر میں، مسلمانوں کے امیر منتخب ہونے والے ہی تھے کہ حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہؓ وہاں پہنچ گئے[۲۰۴] اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔ دیکھا کہ اجلاس جاری ہے اور ایک شخص اجتماع کے وسط میں چادر اوڑھے لیٹا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ خلافت کے امیدوار حضرت سعدؓ بن عبادہ ہیں، جو سخت بیمار ہیں۔[۲۰۵]

ان تین سربرآوردہ مہاجر صحابہ کو دیکھ کر، ایک جوشیلے انصاری صحابی نے تقریر شروع کردی اور دیگر باتوں کے علاوہ کہا کہ ہم انصار، اللہ کے انصار (مددگار) اور اسلام کی فوج ہیں، جب کہ مہاجر صحابہ کی حیثیت اس فوج کے ایک دستے کی ہے۔[۲۰۶] آخری بات نہ صرف بے

موقع اور قبائلی تفوق و تفاخر کا مظہر تھی بلکہ حقیقت سے کوسوں دور تھی۔ حضرت عمرؓ کو یہ سخت ناگوار گزری۔ اسی اثنا میں کچھ اور مہاجر صحابہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ قبیلہ اوس کے حضرت اسیدؓ بن حضیر اور ان کے ذیلی قبیلے بنوعبدالاشہل کے افراد بھی آ گئے۔

یہ کیسا بےموقع ہی نہیں بلکہ بےرحم اجلاس تھا جس میں رسول کریم ﷺ کی وفات پر نہ غم والم کا اظہار کیا جارہا تھا، نہ آپؐ کے تجہیز و تکفین کے انتظامات کی بات ہورہی تھی، نہ آپؐ کے محاسن اور احسانات کا ذکر ہورہا تھا، نہ آپؐ کی صرف پانچ روز پہلے کی گئی اس پدرانہ وصیت کا تذکرہ تھا جس میں آپؐ نے انصار کو اپنے جسم کا حصہ قرار دیا تھا اور ان کا خصوصی خیال رکھنے کی خاص طور پر ہدایت کی تھی، نہ آپؐ کی سیرتِ طیبہ کا ذکر ہورہا تھا، اور نہ آپؐ پر درود وسلام بھیجا جارہا تھا، جو اللہ کا حکم تھا۔

انصاری صحابہ یہ سب کچھ بھلا بیٹھے، اور انھیں صرف مدینے کی سرداری یاد رہ گئی۔ انھوں نے خود کو اللہ کی فوج، اور مہاجر صحابہ کو اپنی اس فوج کا ایک دستہ قرار دیا، حالاں کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ ۱۱ھ میں انصار اسلامی فوج کا ایک دستہ رہ گئے تھے اور گزرتے وقت کے ساتھ، آٹے میں نمک بنتے جارہے تھے۔

حضرت عمرؓ یہ تقریر سنتے جارہے تھے، پہلو بدلتے جارہے تھے اور دماغ میں اس کا جواب تیار کرتے جارہے تھے۔[۲۰۷] تقریر ختم ہوتے ہی انھوں نے جواب دینے کے لیے اٹھنا چاہا لیکن حضرت ابوبکرؓ نے انھیں روک دیا۔[۲۰۸]

قبائلی تفاخر کا دعویٰ انصاری صحابہ کی طرف سے ہوا تھا۔ اس کا جواب دینا لازمی ہوگیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے صداقت، متانت، اخلاق اور مصالحت سے اس کا جواب دیا۔ انھوں نے اپنی مختصر تقریر میں کہا:[۲۰۹]

> ''لوگو! ہم مہاجرین ہیں۔ ہم سب سے پہلے اسلام لائے۔ ہم حسب ونسب کے اعتبار سے عرب کے تمام باشندوں سے ممتاز ہیں۔ ہمارا مولد مکہ ہے جو عرب کے ہر شہر سے ممتاز ہے۔ ہم آپ لوگوں سے پہلے اسلام لائے۔ قرآن نے بھی ہمیں

آپ لوگوں کے مقابلے میں حقِ تقدم دیا ہے۔ آپ ہمارے دینی بھائی ہیں جو اگر جنگوں میں ہمارے مددگار (انصار) رہے تو مالِ غنیمت میں ہمارے حصے دار رہے۔ آپ حضرات نے اپنے محاسن کا ذکر کیا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں۔ ہم تو یہاں تک مانتے ہیں کہ آپ دنیا میں افضل ہیں لیکن یاد رکھیے کہ عرب کے لوگ قریش کے علاوہ کسی کی سیادت قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے مسلمانوں کا سردار قریش میں سے، اور مسلمانوں کا وزیر انصار میں سے ہونا چاہیے۔''

حضرت ابوبکرؓ کا یہ خطاب مختصر، موثر اور مدلل تھا، تاہم اس میں دو باتیں نہیں ملتیں۔ اولاً انھوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ گھڑی خلافت پر اپنا حق جتانے کی نہیں، بلکہ رسول کریم ﷺ کے جسدِ مطہر کی تدفین کی فکر کرنے کی ہے۔ ثانیًا جب وہ کہہ رہے تھے کہ عرب کے لوگ قریش کے علاوہ کسی کی سیادت قبول نہیں کریں گے، تو ان کے ذہن میں نہ تو رسول کریم ﷺ کا نزدیک ترین خاندان بنو ہاشم تھا، جس کا حضرت علیؓ سمیت کوئی نمائندہ اس اجلاس میں موجود نہ تھا، اور نہ ہی قریش کا اہم خاندان بنو امیہ تھا، جو اسلام لا چکا تھا، اور جس کے نمائندے حضرت عثمانؓ بھی اس اجلاس میں موجود نہ تھے۔

اپنے خطاب کے فورًا بعد، حضرت ابوبکرؓ نے فورًا ایک ہاتھ سے حضرت ابوعبیدہؓ کا ہاتھ پکڑا، جو ان کے بالکل ساتھ بیٹھے تھے، اور پھر دوسرا ہاتھ بڑھا کر حضرت عمرؓ کا ہاتھ پکڑا جو ان سے ذرا پرے حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھ بیٹھے تھے، اور حاضرین سے کہا کہ ان دونوں میں سے جسے چاہو، اپنا امیر منتخب کرلو۔[۲۱۰] حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ پچاس برس کے پیٹے میں تھے جب کہ حضرت ابوبکرؓ کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔ ان تینوں کا تعلق قریش کے کم اہم چھوٹے ذیلی قبیلوں سے تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کی تجویز سن کر، ایک جوشیلے انصاری صحابی اٹھے اور کہا: ''اے قریش! مسلمانوں کا ایک امیر ہم میں سے، اور ایک تم میں سے ہونا چاہیے۔''[۲۱۱] انصار کا یہ ردِعمل بتاتا ہے کہ انصاری صحابہ اس روز کس ذہنی انتشار کا شکار تھے۔ انھوں نے پیر کے روز جو کیا اور

کہا، اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں ہنگامی اجلاس بلانا، اپنی اکثریت پر اصرار کرنا، اپنے علاوہ باقی صحابہ کی اکثریت کو اقلیت قرار دینا، پہلے صرف اپنے لیے خلافت کے حصول کی کوشش، اور اس کے بعد بیک وقت دو خلفا کی تجویز، یہ سب باتیں اس دن کی جارہی تھیں، جب آپؐ کا جسدِ مطہر دس منٹ کے فاصلے پر، سخت گرمی کے موسم میں، حجرے میں تھا۔

ابنِ اسحاق اور ابنِ ہشام دونوں نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ پھر وہ تُو تُو مَیں مَیں ہوئی کہ زبردست جھگڑے کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔[۲۱۲] اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں، یہ گھڑی نہ صرف سب سے اندوہناک بلکہ سب سے نازک تھی۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت فوری اور صحیح فیصلہ تھا جو قیادت کا سب سے بڑا امتحان ہوتا ہے۔

اللہ کے دین کے جھنڈے کو تھامنے کا اعزاز، ایک بار پھر، حضرت عمرؓ کے نصیب میں تھا۔ انھوں نے اپنی گرج دار آواز میں کہا: ''ابوبکر! اپنا ہاتھ بڑھایئے'' اور یہ کہہ کر ان کے دائیں ہاتھ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ کر ان کی بیعت کرلی۔[۲۱۳] یہ دو ہاتھ کیا ملے، تاریخ کا دھارا بدل گیا۔ صرف عرب کی تاریخ نہیں، بلکہ دنیا کی تاریخ کا۔

بیعت عہد و پیمان کو کہتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کی یہ پانچویں بیعت تھی۔ ان پانچ بیعتوں کا مختصر احوال نچلی سطور میں درج کیا جاتا ہے۔

ذی الحج ۱۲ نبوی (جولائی ۶۲۱ء) میں، مکے میں پہلی ''بیعتِ عقبہ'' ہوئی۔ مدینے کے بارہ باشندوں نے، جن میں قبیلہ خزرج کی اکثریت تھی، رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ان چھے باتوں کا عہد کیا: وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، اپنی بیٹیوں کو قتل نہیں کریں گے، تہمت نہیں لگائیں گے، اور بھلائی کی کسی بات میں رسول کریم ﷺ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

اگلے سال، ذی الحج ۱۳ نبوی (جون ۶۲۲ء) میں، دوسری ''بیعتِ عقبہ'' ہوئی جس میں ستر سے زیادہ مدینے والے شریک ہوئے۔ اکثریت بدستور خزرج کی تھی۔ انھوں نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ مدینے میں آپؐ کی حفاظت اپنی جان، اور اپنے بال بچوں کی طرح کریں گے۔

چھے سال بعد، ذی قعد ۶ھ (مارچ ۶۲۸ء) میں، مکے سے پندرہ میل دور حدیبیہ کے مقام پر ''بیعتِ رضوان'' ہوئی، جس میں تقریباً ۱۴۰۰/ مہاجر اور انصاری صحابہ نے آپؐ کے ہاتھ پر اس بات کا عہد کیا کہ وہ مرجائیں گے لیکن میدانِ جنگ نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے بارے میں سورۃ فتح (نمبر ۴۸) میں یہ آیت (نمبر ۱۸) نازل ہوئی کہ اللہ مومنین سے راضی ہوا جب وہ آپؐ سے درخت کے نیچے بیعت کررہے تھے۔ اللہ کے راضی ہونے کی وجہ سے یہ ''بیعتِ رضوان'' کہلائی۔ یہ بیعت حضرت عثمانؓ کی شہادت کی غلط خبر ملنے پر لی گئی تھی۔

۱۷/ رمضان ۸ھ (۸/ جنوری ۶۳۰ء) کو فتح مکہ کے بعد، رسول کریم ﷺ نے صفا پر بیٹھ کر اہلِ مکہ سے عہد لیا کہ جہاں تک ہوسکے گا، وہ آپؐ کی بات مانیں گے۔'' [۲۱۴]

''الرحیق المختوم'' میں تفسیرِ مدارک کے حوالے سے یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ:

''جب نبی کریم ﷺ مردوں کی بیعت سے فارغ ہوچکے، تو وہیں صفا ہی پر عورتوں سے بیعت لینی شروع کی۔ حضرت عمرؓ آپ سے نیچے بیٹھے تھے اور آپؐ کے حکم پر عورتوں سے بیعت لے رہے تھے، اور انھیں آپؐ کی باتیں پہنچا رہے تھے۔ اسی دوران ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ بھیس بدل کر آئی۔ دراصل حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ اس نے جو حرکت کی تھی، اس کی وجہ سے وہ خوف زدہ تھی کہ کہیں رسول اللہ ﷺ اسے پہچان نہ لیں۔ ادھر رسول اللہ ﷺ نے (بیعت شروع کی تو) فرمایا: ''میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروگی۔'' حضرت عمرؓ نے (یہی بات دہراتے ہوئے) عورتوں سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اور چوری نہ کروگی۔'' اس پر ہندہ بول اٹھی: ''ابوسفیان بخیل آدمی ہے۔ اگر میں اس کے مال سے کچھ لے لوں تو؟'' ابوسفیان نے (جو وہیں موجود تھے) کہا: ''تم جو کچھ لے لو وہ تمھارے لیے حلال ہے۔'' رسول اللہ ﷺ مسکرانے لگے۔ آپؐ نے ہندہ کو پہچان لیا۔ فرمایا: ''اچھا..... تو تم ہو ہندہ؟'' وہ بولی: ''ہاں، اے اللہ کے نبیؐ! جو کچھ گزر چکا ہے، اسے معاف فرمادیجیے۔ اللہ آپؐ کو معاف فرمائے۔''

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: ''اور زنا نہ کروگی۔'' اس پر ہندہ نے کہا کہ ''بھلا کہیں آزاد عورت بھی زنا کرتی ہے؟'' پھر آپؐ نے فرمایا: ''اور اپنی اولاد کو قتل نہ کروگی۔'' ہندہ نے کہا: ''ہم نے بچپن میں انھیں پالا پوسا لیکن بڑے ہونے پر آپ لوگوں نے انھیں قتل کردیا۔ اس لیے آپؐ اور وہ ہی بہتر جانیں۔'' یاد رہے کہ ہندہ کا بیٹا حنظلہ بن ابی سفیان بدر کے دن قتل کیا گیا تھا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ ہنستے ہنستے چت لیٹ گئے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی تبسم فرمایا۔'' [۲۱۵]

اب ربیع الاوّل ۱۱ھ (جون ۶۳۲ء) میں اسلامی تاریخ کی پانچویں بیعت کی ابتدا حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر ہورہی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس بار کس بات کا عہد لیا جارہا تھا؟ اس کا جواب حضرت ابوبکرؓ کی اس تقریر میں ہے جو انھوں نے اگلے روز مسجدِ نبوی میں کی تھی اور کہا تھا کہ: ''لوگو! جب تک میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کروں، تم میری اطاعت کرنا۔ اگر مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوجائے، جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حکم عدولی ہو، تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں۔'' [۲۱۶] اسلامی تاریخ میں خلافت کی یہ پہلی بیعت تھی اور اس کی شرائط مختصر ترین الفاظ میں ہر کس وناکس پر واضح کردی گئیں۔ اب ہم سقیفہ بنی ساعدہ واپس چلتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ تاریخ منتظر تھی کہ حضرت عمرؓ کب بیعت کرتے ہیں۔ ادھر انھوں نے بیعت کی، اُدھر سقیفہ بنی ساعدہ میں موجود تمام صحابہ، خواہ مہاجر ہوں یا انصار، حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے اس والہانہ انداز سے لپکے کہ مجمع کے درمیان چادر میں لپٹے ہوئے اپنے معزز، معمر اور بیمار سردار حضرت سعدؓ بن عبادہ کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ [۲۱۷] حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں حضرت سعدؓ بن عبادہ اپنی سب زمین اور جائیداد مدینے میں چھوڑ چھاڑ شام میں جاکر آباد ہوگئے اور تین چار سال بعد حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں وفات پاگئے۔

حضرت عمرؓ کے الفاظ میں، اللہ نے مسلمانوں کے امور ایسے شخص کے ہاتھ میں دیئے، جو اس وقت مسلمانوں میں سب سے بہتر تھا۔ [۲۱۸] (واضح رہے کہ حضرت ابوبکرؓ قریش کے ذیلی قبیلے تیم سے تعلق رکھتے تھے، جو بنوامیہ اور بنوہاشم کے مقابلے میں کم تر درجہ رکھتا تھا۔ حضرت علیؓ

کے الفاظ میں، یہ اللہ کی رضا تھی۔[۲۱۹] یہی رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی، جو رضائے الٰہی کے تابع ہوتی ہے۔ اگر فیصلہ قریش کے ذیلی قبائل کے تقابلی تفوق کی بنیاد پر ہوتا تو بنو ہاشم یا بنو امیہ میں سے کوئی صحابی خلیفہ بنتا۔ دوسرے الفاظ میں، خلیفہ اول یا ۳۰ سالہ حضرت علیؓ ہوتے یا ۵۵ سالہ حضرت عثمانؓ۔ یہ دونوں خلیفہ بنے لیکن بعد میں۔ ان دونوں کے ذیلی قبائل یعنی بنو امیہ اور بنو ہاشم بھی خلیفہ کا لقب اختیار کر کے ''مسلم سلطنت'' کے موروثی اور مطلق العنان بادشاہ بنتے رہے لیکن وہ بھی بہت بعد میں، اور یہ ہرگز اسلامی ریاست نہیں تھی، بلکہ مسلم سلطنت تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے ذریعے، رسول کریم ﷺ کے اس اَن کہے فیصلے کی بھی توثیق ہوگئی کہ مومنین کا امیر کسی کی نامزدگی سے نہیں بنے گا، خواہ وہ نامزدگی اللہ کے آخری رسولؐ کی ہی کیوں نہ ہو، بلکہ جمہور کی آزادانہ رائے سے منتخب ہوگا۔

حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب رسول کریم ﷺ کی اس مستند حدیث کے مطابق تھا کہ ''اگر (حکومت) بن مانگے ملی تو تمہاری مدد کی جائے گی۔''[۹۹] حضرت ابوبکرؓ کو حکومت بن مانگے اور اچانک ملی۔ اور ان کے سوا دو سالہ مختصر دورِ خلافت میں، انھیں اس طرح غیبی مدد ملی کہ اس کے لیے حضرت عائشہؓ کے اس قول سے بہتر اور مختصر الفاظ میں اظہارِ حقیقت مشکل ہے کہ ''جب رسول کریم ﷺ کی وفات ہوئی تو عرب مرتد ہونا شروع ہوگئے، یہودیت اور نصرانیت ابھرنے لگی، نفاق ظاہر ہونے لگا اور مسلمان بھیڑوں کے اس گلّے کی مانند ہوگئے، جو جاڑوں کی رات میں ہونے والی بارش سے شرابور ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ اللہ نے امت کو ابوبکرؓ پر جمع کر دیا۔''[۲۲۰]

سقیفہ بنی ساعدہ کے اجلاس کے بارے میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ یہ کب شروع اور کب ختم ہوا، تاہم یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ یہ اجلاس خاصی دیر جاری رہا ہوگا اور اس اجلاس میں عرب کی روایت کے مطابق بہت سے صحابہ نے کھل کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہوگی۔ اسی طرح اس کا بھی ذکر نہیں ملتا کہ پیر کے روز ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی باجماعت نمازیں کہاں پڑھی گئیں اور کس نے پڑھائیں۔ آیا یہ نمازیں مسجدِ نبوی میں باجماعت ادا کی گئیں؟ اگر ایسا ہوا،

تو امام کون تھا؟

سقیفہ بنی ساعدہ کا یہ وقوعہ ایک عجوبہ ہے۔ اولاً کون سوچ سکتا تھا کہ آپؐ پر اپنی جان چھڑکنے والے انصاری صحابہ، آپؐ کی وفات کی خبر سنتے ہی کسی کی چوپال میں جمع ہوجائیں گے؟ بات ایک دو کی نہیں، ایک کثیر تعداد کی ہے۔ ثانیاً جب حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کا نام پیش کیا تو انصاری صحابہ نے اسے قبول نہیں کیا لیکن جب حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تو یہی انصاری صحابہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے ایسے لپکتے ہیں کہ اپنے قبائلی سردار حضرت سعدؓ بن عبادہ کو، ان کی علالت اور ضعیف العمری کے باوجود، روند ڈالتے ہیں۔

دل پلٹتے ضرور ہیں لیکن اس پیر کے روز، دوپہر کے لگ بھگ، دل ایسے پلٹے کہ آپؐ پر اپنی جان نچھاور کرنے والے، اور آپؐ کی حفاظت اپنے بال بچوں کی طرح کرنے والے صحابہ آپؐ کے جسدِ مطہر کے پاس نہیں پھٹکے، اور اسی دن کے آخری حصے میں دل ایسے پلٹے کہ ان ہی صحابہ نے اپنے سب سے بڑے قبائلی سردار کو اپنے پیروں تلے کچلتے ہوئے ایک مہاجر صحابی کو تاحیات اپنا سردار منتخب کرلیا۔

اس عمل سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ انصار کے دلوں میں خوف، اور مزاج میں تلون ضرور تھا لیکن نیت میں فتور نہ تھا۔ اگر فتور ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ وہ اس اہم مسئلے پر اسی روز اوس کے بڑے حصے اور خزرج کے موقف سے اچانک دست بردار ہوجاتے اور اتنے بے پناہ جوش سے اچانک فریق ثانی کا موقف مان جاتے، اور موقف بھی خلافت تاحیات کے بارے میں۔

پچھلے صفحات میں، یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ انصاری صحابہ کو کس مہاجر صحابی، یا مہاجر صحابہ، کی طرف سے یہ زبردست خطرہ محسوس ہورہا تھا کہ اگر انصار نے رسول کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد، حضرت سعدؓ بن عبادہ کی خلافت کا اعلان نہیں کیا تو یہ منصب انصار کو نہیں ملے گا بلکہ کسی مہاجر صحابی کے پاس چلا جائے گا۔

اس پر مختصر تبصرہ ہوچکا ہے، اب مفصل تبصرہ پیش ہے۔

کیا انھیں یہ زبردست خطرہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے تھا؟ ''سقیفہ کے حقائق'' کے صفحہ ۵۷ پر درج ہے:

''(انصاری صحابی) حباب بن منذر نے سقیفہ میں حضرت ابوبکر سے خطاب کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ ہمیں آپ لوگوں سے کوئی ڈر نہیں ہے لیکن ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ لوگوں کے بعد ''وہ لوگ'' برسر اقتدار آ جائیں، جن کے باپ، دادا اور بھائیوں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے۔''

ظاہر ہے کہ ''وہ لوگ'' سے مراد بنوامیہ تھے۔ کیا انصار کو بنوامیہ سے اتنا خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کے تدارک کے لیے فوراً سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو گئے؟

بنوامیہ کے واحد امیدوار حضرت عثمانؓ ہو سکتے تھے۔ پیر کے روز، وہ نہ مسجدِ نبوی میں نظر آتے ہیں، نہ ہی سقیفہ بنی ساعدہ میں، اور نہ کہیں اور۔ اگلے روز منگل کو نمازِ فجر کے وقت وہ مسجدِ نبوی میں آتے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے ہیں۔ خلافت سے عثمانؓ کی عدم دلچسپی سوا دو سال بعد پھر کھل کر نظر آتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب حضرت ابوبکرؓ بسترِ مرگ پر ہیں۔ وہ جن چند صحابہ سے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کے بارے میں مشاورت کرتے ہیں، ان میں حضرت عثمانؓ بھی شامل ہیں۔ محمد حسین ہیکل کی کتاب ''ابوبکر'' سے یہ چند اقتباسات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں:

ابوبکر نے عثمان بن عفان کو بلایا اور فرمایا: ''اے ابوعبداللہ! عمر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' عثمان نے جواب دیا کہ ''ان کے متعلق آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔'' ابوبکر نے کہا: ''اس کے باوجود میں تم سے ان کے متعلق رائے دریافت کرتا ہوں۔'' عثمان نے جواب دیا: ''عمر کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور علم و فضل کے لحاظ سے وہ ہم میں یکتا ہیں۔'' ابوبکر نے کہا: ''اے ابوعبداللہ! اللہ تم پر رحم فرمائے۔ واللہ اگر میں عمر کو تمہارا امیر مقرر کر جاؤں تو وہ تم پر کسی قسم کی زیادتی نہ کریں گے۔''

''بعض صحابہ نے جب یہ سنا کہ ابوبکر آئندہ ہونے والے خلیفہ کے بارے میں

لوگوں سے مشورہ لے رہے ہیں اور اپنے بعد عمر کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں تو انھیں بے حد فکر ہوئی کیوں کہ عمر کی سختی ضرب المثل تھی..... چنانچہ ان لوگوں کا ایک وفد اجازت لے کر ان (ابوبکرؓ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور وفد کے قائد طلحہ بن عبداللہ (عبیداللہ) نے عرض کی: ''ہم نے سنا ہے کہ آپ عمر بن خطاب کو اپنا جانشین مقرر کر رہے ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو جب اللہ آپ سے عمر کو خلیفہ بنانے کے متعلق باز پرس کرے گا تو آپ اسے کیا جواب دیں گے؟ آپ کی موجودگی میں وہ لوگوں سے جس طرح پیش آتے ہیں، اس کا حال آپ پر عیاں ہے مگر آپ کے بعد تو ان کے ظلم و ستم کی کوئی حد نہ ہوگی۔''

یہ سن کر ابوبکر کو سخت طیش آیا اور بخار کی حالت میں چلاّ کر بولے: ''مجھے بٹھا دو'' چنانچہ آپ کو بٹھا دیا گیا۔

آپ نے ان لوگوں کی طرف منہ کر کے فرمایا: ''کیا تم مجھے اللہ کے غضب سے ڈراتے ہو؟ واللہ جب میں اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گا تو عرض کروں گا کہ اے اللہ! میں نے تیرے سب سے بہتر بندے کو تیرے بندوں پر خلیفہ بنایا ہے۔''

''جب ابوبکر عمر کی خلافت کے بارے میں کلیتہً مطمئن ہو گئے تو انھوں نے اپنے کاتب عثمان بن عفان کو بلایا اور کہا: ''جو کچھ میں تمھیں بتاؤں، اسے لکھ لو۔'' اس کے بعد یہ عبارت لکھوائی:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وہ وصیت ہے جو ابوبکر بن ابوقحافہ نے اس دنیا سے رخصت، اور آخرت کی زندگی میں داخل ہوتے وقت لکھوائی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب بڑے سے بڑا کافر بھی ایمان لے آتا ہے اور جھوٹے سے جھوٹا شخص بھی سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں اپنے بعد.....''

''بعض روایات میں آتا ہے کہ..... جب ان الفاظ پر پہنچے.....تو ان پر غشی طاری ہو گئی۔ عثمان کو ابوبکر کا منشا معلوم ہی تھا۔ انھوں نے (ابوبکر کی) حالتِ غشی ہی میں یہ الفاظ لکھ دیئے: ''عمر بن خطاب کو تم پر خلیفہ مقرر کرتا ہوں اور میں نے تمہاری بھلائی میں کوئی دقیقہ سعی

فروگزاشت نہیں کیا۔''

جب ابوبکر کی غشی دور ہوئی تو انھوں نے فرمایا: ''جو میں نے لکھوایا تھا، اسے دوبارہ پڑھو۔''

جب عثمان نے پوری عبارت پڑھی تو ابوبکر نے اللہ اکبر کہا اور فرمایا: ''معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں ڈر تھا کہ اگر غشی کی حالت میں میری جان نکل گئی اور میں پوری وصیت نہ لکھوا سکا تو لوگوں میں خلیفہ کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔''

عثمان نے کہا کہ آپ درست فرماتے ہیں.....ابوبکر نے عثمان کی لکھی ہوئی عبارت برقرار رکھی اور فرمایا: ''اللہ تمھیں اس کی بہترین جزا دے۔''[۲۲۱]

حضرت عثمانؓ کے بارے میں مندرجہ بالا تحریر پڑھنے کے بعد بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ انصاری صحابہ کو بنوامیہ اور ان کے واحد نمائندے حضرت عثمانؓ کی طرف سے خوف تھا تو ہم اس کا فیصلہ اپنے قاری پر چھوڑتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے تو ان کے ساڑھے گیارہ سال دورِ خلافت میں انصاری صحابہ سے زیادتی کی کوئی ایک مثال موجود نہیں ہے۔

کیا انصاری صحابہ کو یہ فوری خطرہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے تھا؟ اگر ایسا ہوتا تو تاریخ میں کچھ اور ہوتا، یا نہ ہوتا، لیکن اس کا ذکر ضرور ہوتا کیوں کہ پہلے خلیفہ وہی بنے۔ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ثانیاً اگر خطرہ حضرت ابوبکرؓ تھے تو مہاجر صحابہ کی طرف سے سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے لیے سب سے پہلے جو نام پیش ہوتا، وہ حضرت ابوبکرؓ کا ہوتا، جب کہ تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے دوسروں کے نام پیش کیے۔ ثالثاً سب سے غور طلب بات یہ ہے کہ ادھر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، ادھر انصاری صحابہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے ایسے دیوانہ وار لپکے جیسے ان کے قبائلی سردار حضرت سعدؓ بن عبادہ نے انتہائی عجلت میں بلایا ہوا یہ اجلاس حضرت ابوبکرؓ کی فوری بیعت کی غرض سے بلایا تھا۔ ایک پوری جماعت میں اچانک رونما ہونے والی یہ تبدیلیٔ قلب کسی جادو ٹونے

کے ذریعے تو نہیں آتی، نہ ہی کسی دھمکی یا جبر کا نتیجہ تھی۔ جن حضرات نے حضرت عمرؓ کو خلیفہ کے طور پر منتخب کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا، انھیں حضرت ابوبکرؓ کو مسترد کرنے میں کیا امر مانع تھا؟ وجہ جو بھی بنی وہ سب پر عیاں ہوگی، اور سب کے دل و دماغ میں فوراً جگہ بنا گئی ہوگی۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں انتہائی غیر معمولی حالات میں ہونے والی اس بیعت کے بعد، انصاری صحابہ نے پھر کبھی خلافت تو کجا وزارت اور مشاورت کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ عربوں میں قبائلی تشخص صرف ان کی پہچان نہیں بلکہ ان کی آن ہوا کرتی تھی لیکن اوس اور خزرج کا قبائلی تشخص ایسا غائب ہوا کہ بعد میں صدیقی، فاروقی، عثمانی، ہاشمی، عباسی، جعفری اور زیدی وغیرہ کے خاندانی نام تواتر سے آتے رہے لیکن خزرجی یا اوسی کا خاندانی نام سننے میں نہیں آیا۔ انصاری لکھا جاتا ہے لیکن یہ خاندانی نام نہیں۔

کیا انصاری صحابہ کو یہ فوری خطرہ حضرت عمرؓ کی طرف سے تھا؟ حضرت عمرؓ کی سختی اور غصیلی طبیعت سے تو کیا انصاری اور کیا مہاجر سبھی یکساں ڈرتے تھے، لیکن سختی اور غصے سے ڈرنا الگ بات ہے، اور یہ خوف ہونا کہ رسول کریم ﷺ کے بعد حضرت عمرؓ فوری طور پر خلیفہ بن جائیں گے، بالکل علیحدہ بات ہے۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ انصاری صحابہ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے کا اظہار اس بے خوفی سے کیا کہ جوں ہی حضرت عمرؓ کا نام خلافت کے ایک امیدوار کی حیثیت سے پیش ہوا، انصاری صحابہ نے یہ متبادل تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کا ایک امیر انصار سے اور دوسرا قریش سے ہو۔ تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انصاری صحابہ کو یہ خطرہ ہو کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بن جائیں گے۔

کیا انصاری صحابہ کو یہ فوری خطرہ حضرت علیؓ کی طرف سے تھا؟ پچھلے صفحات میں ہم نے لکھا تھا کہ یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اگلے صفحات میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔ یہ جائزہ اب پیش ہے۔

یہ خیال کرنا کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد حضرت علیؓ اپنی خلافت کا

اعلان کر دیتے، اور اس طرح انصار کو خلافت سے محروم کر دیتے، اتنا ہی غلط ہوگا جتنی یہ سوچ کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ (یا حضرت عثمانؓ) ایسا کر سکتے تھے، یا ایسا کرنے کا سوچ سکتے تھے۔ صحیح بخاری کی گواہی موجود ہے کہ رسول کریم ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں، حضرت علیؓ نے، حضرت عباسؓ کی ترغیب کے باوجود آپؐ سے یہ پوچھنے سے انکار کر دیا[۱۳۹] کہ آپؐ کے بعد آپؐ کا خلیفہ کون ہوگا۔ کیا ایسا شخص رسول کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد اپنی خلافت کا اعلان کر سکتا تھا؟ جواب نفی میں ہے۔

اگر انصاری صحابہ کو حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ سے یہ فوری خطرہ نہیں ہونا چاہیے تھا، تو پھر وہ کس فوری خطرے کی وجہ سے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو گئے؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے جس کی طرف مؤرخین کی نظر نہیں گئی۔ ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے، ڈاکٹر حمید اللہ کی دو انگریزی کتابوں کے ترجموں سے دو اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ یہ کتابیں ۲۰۰۹ء میں، بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور نے شائع کیں۔ دونوں اقتباسات میں گو الفاظ مختلف ہیں لیکن بات ایک ہی کہی گئی ہے۔

پہلی کتاب کا نام ''محمد رسول اللہ ﷺ'' [۱۸۲] ہے۔ جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے صفحات ۳۱۵، ۳۱۶ سے اقتباس یہ ہے:

''جب رحمۃ للعالمین ﷺ کا وصال ہوا، تو حضرت عباسؓ پھر حضرت علی المرتضیٰؓ کے پاس تشریف لے گئے اور بولے: ''ہم رسول مکرم ﷺ کے سب سے قریبی رشتے دار ہیں۔ میری مدد و اعانت کرو۔ میں آپؐ کے جانشین کے طور پر تمہاری بیعت کر لوں گا۔ دوسرے لوگ میری پیروی کریں گے اور کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ اگر تم نے انکار کر دیا تو یہ موقع ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جائے گا۔'' مگر حضرت علی المرتضیٰ نظم و ضبط کے اس قدر پکے اور بااصول تھے کہ دوسروں کے سامنے کسی بھی بات کو پہلے سے طے شدہ امر کے طور پر پیش کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ عام مشاورت کے دوران کوئی بھی ہماری جانشینی کے حق سے انکار نہیں کرے گا۔''[۲۲۲]

دوسری کتاب کا نام ''رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی و جانشینی'' [۴۶] ہے، اس کا بھی پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے صفحات ۱۹۱، ۱۹۲ پر، ڈاکٹر حمید اللہ نے اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''جونہی رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا، حضرت عباسؓ تیزی سے اپنے بھتیجے حضرت علیؓ کے پاس پہنچے اور کہا: ''اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو، میں تمہارے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتا ہوں، دوسرے لوگ ہماری تقلید کریں گے۔'' مگر حضرت علیؓ نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ ایسے کاموں کے لیے مسلمانوں سے مشورہ ضروری ہے اور مزید یہ کہا کہ ہمارے حقوق، اور حق، کو کون نظر انداز کر سکتا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ کے منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد، حضرت عباسؓ پھر حضرت علیؓ کے پاس گئے اور طنزیہ انداز میں کہا: ''میں نے تمھیں پہلے ہی کہہ دیا تھا۔'' بلاذری، انساب: پیرا ۱۱۸۰، ۱۱۸۵۔[۲۲۳]

مندرجہ بالا دو اقتباسات کو، ''سقیفہ کے حقائق'' کے اس اقتباس [۴۵] سے ملا کر پڑھیں، جس کا گزشتہ صفحات میں ذکر تھا، تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضرت عباسؓ نے رسول کریم ﷺ کی زندگی کے بالکل آخری ایام میں، اور مزید برآں آپؐ کی وفات کے چند منٹ بعد، پے در پے، خلافت کے حصول کے لیے تین کوششیں کیں۔ آپؐ کی حیات کے دوران میں ہونے والی پہلی دو کوششوں کے بارے میں قطعی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صرف حضرت علیؓ کے لیے ہی تھیں۔ یہ نکتہ اکیسویں صدی عیسوی کے مسلمان کے لیے قابلِ غور ہے۔

ایک کوشش (اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پہلی تھی یا دوسری) وہ تھی جب حضرت عباسؓ نے از خود آپؐ سے پوچھا کہ اگر آپؐ کے بعد حکومت ''ہمارے'' پاس رہے گی تو ''ہمیں'' اس کی بشارت دیجیے۔[۴۵] اس سوال میں یہ آرزو پنہاں نہیں بلکہ عیاں تھی کہ ''ہمیں'' حکومت کی بشارت دیں۔ آپؐ نے بشارت نہیں دی بلکہ فرمایا کہ میرے بعد تم لوگ ''مستضعفین'' میں ہوگے۔[۱۴۱]

ایک اور کوشش (اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پہلی تھی یا دوسری) وہ تھی جب، صحیح بخاری

کے الفاظ میں، اور حضرت عباسؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق، حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ اب ہمیں رسول کریم ﷺ کے پاس چلنا چاہیے اور آپؐ سے پوچھنا چاہیے کہ خلافت کسے ملے گی؟ اگر ''ہم'' اس کے مستحق ہیں تو ''ہمیں'' معلوم ہوجائے گا۔[۱۳۹] یہ دو کوششیں تو رسول کریم ﷺ کی حیات میں کی گئیں۔

تیسری اور آخری کوشش وہ ہے جب آپؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی، حضرت عباسؓ حضرت علیؓ سے کہتے ہیں کہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ میں تمھاری خلافت کی بیعت کروں گا اور دوسرے لوگ ہماری تقلید کریں گے۔[۲۲۳] کیا یہی وہ خطرہ تھا جس کا سدباب کرنے کے لیے انصاری صحابہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے؟

حضرت عباسؓ لوگوں کو بھاری شرح سود (ربا) پر قرض دیا کرتے تھے۔ حجِ الوداع کے مشہور خطبے میں، آپؐ نے حضرت عباسؓ کا نام لے کر، ان کا سود ان الفاظ میں منسوخ کر دیا تھا: ''اور پہلا سود جو میں منسوخ کرتا ہوں، وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے۔''[۲۲۴] ۱۱۸ سال بعد، آلِ عباس نے آلِ علی و فاطمہ کے نام پر، ۷۵۰ء میں، خلافت حاصل کر لی، جو اگلے پانچ سو سال ۱۲۵۸ء تک ان کے پاس رہی۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں ہونے والی اس کاروائی نے، جو رسول کریم ﷺ کی وفات کے کوئی گھنٹہ بھر بعد شروع ہوگئی تھی، اور خدا جانے کب ختم ہوئی، صحابہ کو ذہنی اور جسمانی طور پر نچوڑ دیا ہوگا۔ اس طویل اجلاس کے اختتام پر، حضرت ابوبکرؓ کی بیعت صرف ان صحابہ نے کی، جو اجلاس کے اختتام پر وہاں موجود تھے۔ اسے بعض تجویز کنندگان کی طرف سے خلافت کے لیے نامزدگی تو کہا جاسکتا ہے لیکن خلافت کے لیے فیصلہ نہیں۔ فیصلے کے لیے نامزدگی کی توثیق ''عام بیعت'' کے ذریعے ضروری تھی۔ اسلام کی تاریخ میں پہلی بار یہ طے ہونا تھا کہ خلافت کے لیے ''عام بیعت'' سے کیا مراد ہے؟ اور یہ کس نکتے پر ہوگی؟

۱۱ھ (۶۳۲ء) میں، مدینے سے باہر رہنے والے صحابہ کی تعداد مدینے میں مقیم صحابہ کی تعداد سے کئی گنا زیادہ تھی۔ صرف مکے کے صحابہ کی تعداد ہی مدینے کے صحابہ سے زیادہ تھی،

تاہم خلیفہ کی نامزدگی کی توثیق کے لیے لی جانی والی ''عام بیعت'' صرف مدینے میں بیعت کے وقت موجود اور مقیم صحابہ تک محدود رہی۔ یہ آئینی نظام ربع صدی تک جاری رہا۔ ۲۵ سال بعد، حضرت علیؓ نے امیر معاویہ کے نام اپنے خط میں، جس کا متن نہج البلاغۃ میں درج ہے اور جس کا حوالہ پچھلے صفحات میں موجود ہے، اسی اصول کا ذکر کے امیر معاویہ کے دعوے کو رد کیا تھا۔ مدینے میں ''عام بیعت'' کے ذریعے خلافت کی نامزدگی کی توثیق ہوجانے کے بعد، مدینے سے باہر رہنے والے صحابہ، یا تابعین، سے بھی منتخب شدہ خلیفہ کی بیعت لی جاتی، جو نہ فیصلے کی حیثیت رکھتی تھی اور نہ فیصلے کی توثیق کی۔ یہ دونوں مراحل قبل ازیں طے ہو چکے ہوتے تھے۔

مندرجہ بالا قدرِ مشترک کے علاوہ، چاروں خلفائے راشدین کے لیے لی جانی والی عام بیعتوں کا انداز ہر بار مختلف رہا۔ ان کا جائزہ پیش ہے۔

رسول کریم ﷺ نے کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کیا البتہ امت کی رہنمائی کے لیے واضح اشارے ضرور چھوڑے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں، حضرت ابوبکرؓ کی نامزدگی سے پہلے کئی نام پیش ہوئے۔ جب اس محدود اجتماع میں ان کا نام منظور ہوگیا۔ تو اسے توثیق کے لیے صرف مدینے کے شہریوں کی عام بیعت کے لیے پیش کیا گیا۔ یہ ربیع الاوّل ۱۱ھ (جون ۶۳۲ء) کی بات ہے۔

سَوا دو سال بعد، ۲۱/ جمادی الثانی ۱۳ھ (۲۲/ اگست ۶۳۴ء) کو، جب حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوا، تو انھوں نے، اپنے مرض الموت کے دوران میں، رسول کریم ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کی بجائے، چند صحابہ سے مشورہ کرنے کے بعد، جن میں حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے نام نمایاں ہیں، اور جن میں حضرت علیؓ کا نام نہیں آتا، حضرت عمرؓ کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا، اور اپنے وصال سے پہلے، ان کی نامزدگی کی حمایت کے لیے مدینے میں مقیم اور موجود صحابیوں کی رضامندی حاصل کر لی۔ حضرت ابوبکرؓ کی نامزدگی کئی دوسرے ناموں پر غور کرنے کے بعد ہوئی تھی۔ تاریخ میں ایسے کوئی شواہد نہیں کہ حضرت عمرؓ کی نامزدگی بھی کئی ناموں پر غور کرنے کے بعد ہوئی، تاہم حضرت عمرؓ کی نامزدگی کی توثیق بھی مدینے میں موجود اور مقیم صحابہ نے کی۔ حضرت علیؓ نے نہج البلاغۃ میں درج اپنے محولہ بالا فرمودے میں اس کا ذکر کیا

ہے۔ مدینے سے باہر رہنے والے صحابہ نے اہالیانِ مدینہ کی توثیق پر صاد کیا۔

سوال یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جیسا سچا عاشقِ رسولؐ جو اپنے پیارے نبی ﷺ کے اتباعِ سنت کو اپنا جزِ ایمان سمجھتا ہو، انھوں نے خلافت جیسے اہم ترین معاملے کے بارے میں رسول کریم ﷺ کی واضح سنت پر عمل کیوں نہیں کیا؟ حضرت ابوبکرؓ بھی، اپنے مرض الموت میں، حضرت عمرؓ کے حق میں واضح اشارے دینے کے بعد، خلافت کا فیصلہ امت پر چھوڑ سکتے تھے۔ ساری عمر سنتِ رسولؐ پر سختی سے عمل پیرا رہنے کے بعد، حضرت ابوبکرؓ اپنی زندگی کے آخری ایام میں، اس وقت تک سنتِ نبویؐ کو نہ چھوڑتے، جب تک ملی مفاد کی کوئی بہت اہم وجہ نہ ہو۔ ان کی وصیت کے الفاظ پر غور کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ وہ وقت ہے جب بڑے سے بڑا کافر بھی ایمان لے آتا ہے، اور جھوٹے سے جھوٹا شخص بھی سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ کہنے کے بعد، وہ حضرت عمرؓ کو اپنا خلیفہ نامزد کرتے ہیں۔ آخر کیوں؟

تاریخ میں اس کا جواب حضرت ابوبکرؓ کے ان الفاظ میں ہے:

''جب میں اللہ کے حضور حاضر ہوں گا تو عرض کروں گا اے اللہ! میں نے تیرے سب سے بہتر بندے کو تیرے بندوں پر خلیفہ بنایا ہے۔'' حضرت ابوبکرؓ کا یہ جواب مدلل ہے لیکن مکمل نہیں۔ رسول کریم ﷺ بھی حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں، یا حضرت علیؓ کے متعلق یہی کہہ کر، انھیں اپنا خلیفہ نامزد کر سکتے تھے، جس کے بعد کسی توثیق کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ یہ سوال بدستور قائم ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جیسے عاشقِ رسولؐ نے خلافت جیسے اہم ترین مسئلے پر سنتِ رسولؐ پر کیوں عمل نہیں کیا؟

وجہ یہی لگتی ہے کہ سوا دو سال پہلے، حضرت ابوبکرؓ جس تجربے سے گزرے، انھوں نے اس تجربے کو دہرانا امت کے مفاد میں نہ سمجھا۔ وہ تجربہ کیا تھا؟ حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں کیا سنا اور کیا دیکھا؟ حضرت عمرؓ کی طرح، انھوں نے اسے بیان نہیں کیا لیکن عرصہ گزر جانے کے بعد، دوسروں نے اسے ایسے بیان کیا جیسے وہ سقیفہ بنی ساعدہ کے عین وسط میں ٹیپ ریکارڈ لیے بیٹھے تھے اور ہر مقرر کی ہر بات لفظ بہ لفظ ریکارڈ کرتے جاتے تھے۔

اس تحریر میں، سقیفہ بنی ساعدہ کے صرف وہ چند واقعات درج کیے گئے ہیں جو سب روایات میں مشترک ہیں، اور جن کی بنیاد، اور ماخذ، حضرت عمرؓ کا وہ مشہور خطبہ ہے جو انھوں نے اپنے آخری حج سے لوٹنے کے بعد، اور اپنی شہادت سے دس دن پہلے مسجدِ نبوی میں نمازِ جمعہ سے پہلے دیا تھا۔ حضرت عمرؓ سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان سے زیادہ معتبر شاہد، سامع، ناظر اور راوی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ اس روز اس جگہ کیا ہوا، (جس کے لیے حضرت عمرؓ کی شہادت کافی ہے) لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ معلوم کرنا ہے کہ جو کچھ ہوا، وہ کیوں ہوا؟ اسی وجہ سے، اس تحریر میں غیر روایتی اندازِ بیان اختیار کر کے، اس وقوعہ کے محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اکیسویں صدی کا باشعور مسلمان ان پر تدبر کرے اور اپنے نتائج خود اخذ کرے۔

اہم بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کے فیصلے کی حضرت سعد بن عبادہ کے سوا نہ صرف مدینے میں موجود اور مقیم سب صحابہ نے، بلا استثنا، بلا تاخیر اور بلا جبر و اکراہ توثیق کی اور نہ صرف حضرت عمرؓ کی فوراً بیعت کی، بلکہ حضرت عمرؓ کے سوا دس سالہ دورِ خلافت میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا کہ کسی نے یہ کہا ہو کہ اس نے مجبوراً حضرت عمرؓ کی بیعت کی ہو۔

یہاں حضرت علیؓ اور حضرت خالدؓ بن ولید کا ذکر ضروری ہے۔ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت تو کئی ماہ بعد کی، لیکن حضرت عمرؓ کی بیعت کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ حضرت خالدؓ بن ولید ان صحابہ میں تھے جو حضرت عمرؓ کی نامزدگی اور بعد میں عام بیعت کے وقت مدینے میں نہیں تھے۔ وہ نہ مشورے میں شامل تھے نہ بیعت میں۔ حضرت عمرؓ نے خلیفہ بنتے ہی حضرت خالدؓ بن ولید کو، جنھیں رسول کریم ﷺ نے ''سیف اللہ'' کا لقب دیا تھا، سپہ سالاری کے منصب سے برطرف کر دیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید حضرت عمرؓ کو وہی کہہ سکتے تھے، جو ۲۳ برس بعد امیر معاویہ نے حضرت علیؓ کو کہا، یعنی یہ کہ خلیفہ کے انتخاب کے وقت خالدؓ بن ولید نہ شوریٰ میں شامل تھے، اور نہ ہی انھوں نے حضرت عمرؓ کی بیعت کی، لیکن انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا بلکہ مدینے میں موجود اور مقیم صحابہ کی توثیق کو کافی سمجھا۔ غرضیکہ اہلِ مدینہ کی طرف سے حضرت عمرؓ کی نامزدگی کی توثیق کے بعد

مدینے سے باہر رہنے والے ہر مسلمان نے، بلا تاخیر اور بلا ترغیب، حضرت عمرؓ کی خلافت کو تسلیم کیا۔

سوا دس سال بعد، (ذی الحج ۲۳ھ/ نومبر ۶۴۴ء میں) جب حضرت عمرؓ کی آخری گھڑیاں آئیں تو انھوں نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے نیا طریقہ ایجاد کیا۔ انھوں نے ان دس صحابہ میں سے جنھیں روایات میں عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے (یعنی وہ دس صحابہؓ جنھیں رسول کریم ﷺ نے ان کی زندگی میں جنتی ہونے کی بشارت دی) چھے افراد پر مشتمل حلقۂ انتخاب تشکیل دیا۔ یہ چھے افراد تھے: (۱) حضرت عثمانؓ، (۲) حضرت علیؓ، (۳) حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، (۴) حضرت زبیرؓ، (۵) حضرت طلحہؓ اور (۶) حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ ان میں کوئی انصاری صحابی نہ تھا۔

عشرہ مبشرہ کے وہ باقی چار صحابہ کون تھے جو مجلس شوریٰ/ حلقہ انتخاب میں شامل نہ تھے۔ یہ چار صحابہ تھے: (۱) حضرت ابوبکرؓ، (۲) حضرت ابو عبیدہؓ، (۳) حضرت عمرؓ، (۴) حضرت سعیدؓ بن زید۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ وفات پا چکے تھے۔ حضرت عمرؓ بسترِ مرگ پر تھے۔ حضرت سعیدؓ بن زید کا مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہ حضرت عمرؓ کے سگے بہنوئی اور چچازاد بھائی تھے۔ وہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ کے شوہر تھے، جن کے مکے کے گھر میں، سورۃ طٰہٰ کی چند آیات پڑھ کر خطّاب کے غصیلے بیٹے کے نصیب میں یہ لکھا گیا تھا کہ وہ وقت آنے پر، رہتی دنیا تک، دنیا کا سب سے عظیم حکمران بنے گا۔ حضرت سعیدؓ بن زید سے اس دوہرے قریبی رشتے کی وجہ سے، دنیا کے اس عظیم ترین حکمران کی سختی نے یہ گوارا نہ کیا کہ ان نصف درجن افراد کی فہرست میں حضرت سعیدؓ بن زید کا نام بھی شامل کر دیں۔ تجویز آئی کہ بر بنائے استحقاق اپنے بیٹے عبداللہ کا نام ہی فہرست میں ڈال دیں۔ امیر المومنین نے کہا: ''ہرگز نہیں۔ اگر میرا بیٹا اہل الرائے اصحاب میں ہے تو اس سے مجلسِ شوریٰ/ حلقہ انتخاب اس کی رائے مانگ سکتا ہے لیکن میرا بیٹا خلافت کا امیدوار نہیں ہو سکتا۔''

ان چھے ممتاز مہاجر صحابہ کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ باہمی مشاورت کے ذریعے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ چن لیں۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں، خلیفہ کے انتخاب کے

لیے یہ پہلی، اور آخری، باضابطہ مجلسِ شوریٰ تھی۔

حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت، حضرت طلحہؓ مدینے سے باہر تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف خلافت کی امیدواری سے خود ہی دست بردار ہو گئے۔ مجلسِ شوریٰ کے اراکین نے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ نامزد کرنے کا اختیار حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو سونپ دیا اور اس طرح وہ اسی پوزیشن میں آ گئے جو حضرت عمرؓ کی خلافت کی نامزدگی کے وقت حضرت ابوبکرؓ کی تھی، گویا یہ اختیار حضرت عمرؓ کی بجائے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو مل گیا۔

حضرت عمرؓ کی تدفین کے بعد، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ بن وقاص اور حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے علاوہ مدینے میں موجود اور مقیم دوسرے صحابہ سے بھی مشاورت کی اور حضرت عثمانؓ کو خلیفہ نامزد کیا۔ نامزدگی کا اعلان ہوتے ہی، مدینے میں موجود اور مقیم تمام صحابہ نے ان کی فوری بیعت کر کے ان کی نامزدگی کی توثیق کر دی۔ ان صحابہ میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔

ساڑھے گیارہ برس بعد (ذی الحج ۳۵ھ/ جون ۶۵۶ء میں) جب ضعیف العمر حضرت عثمانؓ کو تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے سفاکی سے شہید کیا گیا تو مدینے میں انارکی پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے نہ تو (حضرت ابوبکرؓ کی طرح) کسی کو نامزد کیا، نہ ہی (حضرت عمرؓ کی طرح) کوئی مجلسِ شوریٰ بنائی جو اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرے، اور نہ ہی (سقیفہ بنی ساعدہ کی طرح) کسی صحابی نے خود کو (حضرت سعدؓ بن عبادہ کی طرح) خلافت کے لیے پیش کیا۔

مصر اور عراق سے آنے والے ہزاروں صحابہ اور تابعین جو سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے، ذی الحج ۳۵ھ میں، حضرت عثمانؓ کی مخالفت میں یلغار کر کے مدینے میں ہر طرف نظر آ رہے تھے (اور جو مدینے میں موجود ضرور تھے لیکن اس کے مستقل ساکن نہیں تھے) جون کے گرم ترین مہینے میں پانچ روز تک مدینے میں موجود اور مقیم صحابہ پر زور ڈالتے رہے کہ وہ اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں اور بالآخر حضرت علیؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔

اس طرح رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد، اور حضرت علیؓ کے خلیفہ بننے تک

ہر بار خلافت کی ایک نئی روایت قائم ہوتی رہی۔ ان سب روایات میں واحد قدرِ مشترک یہ تھی کہ خلیفہ کی نامزدگی کی توثیق کا حق صرف مدینے میں موجود اور مقیم صحابہ کو حاصل رہا اور خلافت کے لیے نامزدگی بھی ان ہی اصحاب تک محدود رہتی تھی۔ اس مستحکم روایت کا سب سے مؤثر اور واضح اظہار حضرت علیؓ کی خلافت کے موقع پر ہوا، جب عراق، مصر اور مدینے سے باہر رہنے والے دیگر صحابہ اور تابعین نے مدینے میں موجود ہونے کے باوجود، کئی روز تک مدینے میں موجود اور مقیم صحابہ سے پیہم یہ مطالبہ کیا کہ وہ حسبِ دستور مدینے میں موجود اور مقیم صحابہ میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرلیں۔ اس روایت کے آغاز اور اس روایت پر اصرار کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ مدینے میں مقیم صحابہ کرام رسول کریم ﷺ کی تعلیم، تربیت اور صحبت سے سب سے زیادہ فیض یاب ہوئے اور ان کی یہ فضیلت توثیقِ خلافت کی واحد قابلِ قبول بنیاد قرار پائی۔

یہ بنیاد اس وقت تک قائم رہ سکتی تھی جب تک آپؐ کے صحابہ زندہ تھے۔ جب وہ ہی نہ ہوں گے تو یہ بنیاد کیسے قائم رہ سکتی ہے؟ علاوہ ازیں جب مسلمانوں کی آبادی دنیا بھر میں پھیل جائے اور ان کی غالب اکثریت مدینے کے باہر آباد ہو، تو یہ لازمی تھا کہ صحابہ کی زندگی ہی میں یہ غالب اکثریت اپنے امیر کے انتخاب اور اس انتخاب کی توثیق دونوں میں اپنا جائز اور غالب حق مانگتی اور اس روایت کو بدلنا پڑتا۔ درحقیقت اس تبدیلی کا آغاز حضرت علیؓ کی خلافت کے صرف دو سال بعد، یعنی جنگِ صفین (صفر ۳۸ھ/ جولائی ۶۵۸ء) کے فوراً بعد، خارجیوں کے خروج کے ساتھ ہوگیا، جن کا موقف تھا کہ خلافت قبیلۂ قریش میں محدود نہیں رہنی چاہیے، بلکہ ایک مسلمان حبشی غلام بھی نہ صرف خلیفہ بن سکتا ہے، بلکہ اسے خلیفہ بنانا چاہیے بشرطیکہ اس کا کردار مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے ناقابلِ ملامت ہو۔

عیسوی تقویم کے مطابق، خلافتِ راشدہ کا دورانیہ تقریباً ۲۸ سال ۷ ماہ رہا، جس کی تفصیلات یہ ہیں:

نام	خلافت کا آغاز اور اختتام (قمری مہینوں میں)	(عیسوی مہینوں میں)	دورانیہ (عیسوی سال/ماہ/دن)
حضرت ابوبکرؓ	۱۳ ربیع الاوّل ۱۱ھ، تا ۲۱ جمادی الثانی ۱۳ھ	۹ جون ۶۳۲ء، تا ۲۲ اگست ۶۳۴ء	۱۴/۲/۲
حضرت عمرؓ	۲۲ جمادی الثانی ۱۳ھ، تا یکم محرم ۲۴ھ	۲۳ اگست ۶۳۴ء، تا ۷ نومبر ۶۴۴ء	۱۵/۲/۱۰
حضرت عثمانؓ	۴ محرم ۲۴ھ، تا ۱۸ ذی الحج ۳۵ھ	۱۰ نومبر ۶۴۴ء، تا ۱۷ جون ۶۵۶ء	۸/۷/۱۱
حضرت علیؓ	۲۴ ذی الحج ۳۵ھ، تا ۱۹ رمضان ۴۰ھ	۲۳ جون ۶۵۶ء، تا ۲۶ جنوری ۶۶۱ء	۴/۷/۴
	کل دورانیہ	۲۸ سال ۷ ماہ ۱۰ دن	

۲۸ سال ۷ ماہ کے اس دور میں، نہ خلیفہ کے انتخاب کے لیے کوئی ضابطہ تشکیل پایا، اور نہ ہی خلیفہ کو ہٹانے کے لیے۔ خلیفہ کے ہٹنے کے دو ہی طریقے تھے: موت یا معزولی۔ معزولی کی صرف ایک صورت حضرت ابوبکرؓ نے خلافت سنبھالتے ہی اپنے پہلے خطبے میں بتائی تھی کہ ''اگر مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوجائے جس میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی حکم عدولی ہوتی ہو، تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں۔'' معزولی کا یہ اصول اخلاقی طور پر مثالی لیکن عملی طور پر بے شمار پیچیدگیوں کا حامل تھا۔ فسخِ بیعت اور بغاوت میں امتیاز کرنا کوئی آسان کام نہیں اور پھر یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فسخِ بیعت اخلاقی طور پر درست ہوئی ہے؟ معزولی کا ایک اور طریقہ جو ہر قسم کی پیچیدگیوں سے پاک ہے، یہ ہے کہ خلیفہ خود اپنی معزولی کا اعلان کرے۔ امام حسنؓ نے یہی کیا اور گوشہ نشین ہوگئے۔ ان کے والد حضرت علیؓ نے بھی تحکیم کے فیصلے کے تحت، جو ان کی

رضامندی سے ہوا تھا، اپنی معزولی پر آمادگی ظاہر کردی تھی اور معزولی کے اصول کو تسلیم کرلیا تھا۔

۲۸ سال ۷ ماہ کے اس دور میں، خلیفہ کو پہلے نامزد کیا گیا، اور پھر اس کی توثیق ''مدینے میں موجود اور مقیم بالغ مردوں'' کا حق سمجھا گیا، جو عددی اور علاقائی، ہر دو اعتبار سے، اقلیت میں ہونے یا محدود ہونے کے باوجود، نہ صرف جزیرہ نمائے عرب بلکہ عراق، مصر اور اسلامی مملکت کے دوسرے علاقوں میں رہنے والوں کے لیے قابلِ قبول تھا۔ یہی وہ واحد پہلو ہے جسے ہم نظام کا نام دے سکتے ہیں، تاہم اس نظام کی قبولیت بلکہ اس کا جاری رہنا بھی محدود وقت کے لیے ہوسکتا تھا۔ اگر یہ اللہ کا نظام ہوتا تو ابدی ہوتا۔

۲۸ سال ۷ ماہ کے اس دور میں، مسلمانوں کا امیر بیک وقت سربراہِ ریاست، سربراہِ مملکت، سپہ سالار اور قرآن وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے یک رکنی پارلیمان تھا۔ خلیفہ نہ کسی کابینہ کے سامنے جواب دہ تھا، نہ کسی مجلسِ شوریٰ کے سامنے۔ وہ براہِ راست اور بیک وقت اللہ اور اللہ کی مخلوق کے سامنے جواب دہ تھا، جس سے بڑی، فوری، کھری اور کڑی جواب دہی ممکن نہیں۔ مملکت کے تمام چھوٹے بڑے عہدوں پر تقرریاں، تنزلیاں اور تبادلے خلیفہ کے دائرہ اختیار میں تھے۔ خلیفہ کے منصب کی میعاد تاحیات تھی، جب کہ ریاست کے باقی سب عہدیداروں کے مناصب کی میعاد خلیفہ کی صوابدید پر تھی۔

یہ اسلامی نظام نہیں بلکہ عربی نظام تھا، جو رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد، اسلام کے چوٹی کے دماغ، اپنے اپنے زمانے کے حالات کو سامنے رکھ کر، وضع کرتے رہے۔ یہ اپنی نوعیت کے منفرد حکومتی تجربات تھے، جن کی مثال دنیا میں نہ پہلے ملتی ہے اور نہ بعد میں۔ یہ ایک بہت بڑی بات ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دماغ تقلید کے قائل نہیں تھے، اجتہاد کے قائل تھے۔

۲۸ سال ۷ ماہ کے اس دور میں، حکمرانوں کا کردار اتنا مثالی رہا کہ اس کی مثال دنیا میں نہ پہلے ملتی ہے اور نہ بعد میں، تاہم حکمرانوں اور نظامِ حکومت میں امتیاز ضروری ہے۔ حکمرانوں کی بات تو ہوگئی لیکن نظامِ حکومت کو مثالی کہنا، دیگر وجوہات کے علاوہ اس بنیادی سبب سے بھی درست نہ ہوگا کہ اس مختصر دور میں، ہر بعد میں آنے والے نے اپنے پیش رو سے مختلف

مثال قائم کی۔

رسول کریم ﷺ کے آخری ایام کو بیانیہ انداز میں پڑھ کر، اکیسویں صدی عیسوی کا مسلمان اس وقت تک مکمل استفادہ نہیں کرسکتا، جب تک ان بنیادی مسائل کا ذکر، اور اس کے ساتھ ان کا مختصر تجزیہ، بھی پیش نہ کیا جائے، جن کا آپؐ کے آخری ایام کے ساتھ تعلق ہے۔ پچھلے صفحات میں یہ ضرورت پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اگلے صفحات میں، آپؐ کی وفات کے فوراً بعد ہونے والے بقیہ واقعات کا جائزہ بیانیہ انداز میں پیش ہے۔

پیر اور منگل کی درمیانی رات:

یہ پوری رات رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں اسی بستر پر اکیلے لیٹے ہوئے گزاری، جس پر آپؐ کا دوپہر کے وقت انتقال ہوا تھا۔ اندھیرا ہوا تو ایک روایت کے مطابق، حجرے کا دروازہ باہر سے بند کردیا گیا۔[۲۲۵]

منگل۔ وفات سے ایک دن بعد:

اگلے روز، تاروں کی چھاؤں میں، مدینے میں موجود سب انصاری صحابہ (سوائے حضرت سعدؓ بن عبادہ کے) اور مدینے میں موجود تمام مہاجر صحابہ (سوائے بنو ہاشم کے) مسجدِ نبوی میں جمع ہوگئے۔ پہلے حضرت عمرؓ نے ایک مختصر تقریر کی، جس کا نفسِ مضمون یہ تھا:

> ''لوگو! کل میں نے یہاں جو کہا تھا، وہ نہ تو اللہ کی کتاب میں ہے اور نہ ہی رسول کریم ﷺ نے مجھ سے کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ چوں کہ آپؐ کو ابھی بہت سے امور کا انتظام کرنا ہے، اس لیے آپؐ کی وفات ہم سب کے بعد ہوگی۔ اللہ نے ہمیں وہ کتاب دی ہے جس کے ذریعے اللہ نے اپنے رسولؐ کی ہدایت کی۔ اگر تم نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا تو کامیابی کی راہ تمہارے لیے بھی کھلی ہے۔ آج اللہ نے تمہارے امور ایسے شخص کے ہاتھوں میں دے دیئے ہیں، جو تم میں سب

سے بہتر ہے۔ وہ آپؐ کا ندیمِ خاص تھا۔ قرآن میں ہے کہ جب یہ دونوں غار میں تھے تو ان میں سے دوسرے ابوبکر تھے۔ اب اٹھو اور ابوبکر کی بیعت کرو۔'' [۲۲۶]

صحابہ نے بیعتِ عام شروع کردی۔ بیعتِ عام مکمل ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہوئے اور ایک مختصر تقریر کی جو پچھلے ۲۴ گھنٹوں میں ان کی تیسری فی البدیہہ تقریر تھی۔ پہلی دو تقریروں کی طرح، ان کی تیسری تقریر بھی اختصار، اخلاص اور سب سے بڑھ کر معنویت کا مرقع تھی۔ اس کے آئینے میں جہاں آج کے مسلمان کو ان کی غیر معمولی شخصیت کی جھلک دیکھنے کا موقع ملتا ہے، وہیں اس میں ایک مسلم حکم ران کے لیے حکومت کے بنیادی رہنما اصول انتہائی سادہ اور دل میں جذب ہونے والے الفاظ میں ایسے بیان کیے گئے ہیں، جیسے دریا کو کوزے میں سمو دیا جائے۔ یہ مختصر تقریر ہر مسلمان حکومت کے ہر اہم دفتر میں نمایاں طور پر آویزاں ہونی چاہیے، بشرطیکہ وہ حکومت حقیقت میں مسلمان ہو۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا:

''لوگو! میں تمہارا امیر ضرور بنایا گیا ہوں لیکن تم سے بہتر نہیں ہوں۔

صحیح کام کروں تو میرا ساتھ دینا، غلط کام کروں تو ٹوک دینا۔ صدق امانت اور کذب خیانت ہے۔ تمہارا کم زور میرے نزدیک قوی ہے جب تک میں اللہ کے حکم سے اسے اس کا حق نہ دلوادوں، اور تمہارا قوی میرے نزدیک کم زور ہے جب تک میں اللہ کے حکم سے کم زور کا حق جو اس کے ذمے ہے، اس سے نہ لے لوں۔ اللہ اس قوم پر ذلت مسلط کرتا ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چھوڑ دے۔ جب بھی کسی قوم میں بدکاری پھیلی، اللہ نے اس قوم میں مصیبت اور بلائیں عام کردیں۔

لوگو! جب تک میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کروں، تم میری اطاعت کرو۔ اگر مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوجائے جس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی حکم عدولی ہو، تو میری اطاعت تم پر لازم نہیں۔ اب اٹھو اور نماز کے لیے کھڑے ہوجاؤ۔ اللہ تم پر رحم کرے۔'' [۲۲۷]

مدینہ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں اس وقت ہزاروں صحابی آباد تھے۔ اگر ان سب نے بیک وقت باآواز بلند بیعت کے الفاظ دہرائے ہوں، تو یہ بیعت نمازِ فجر سے پہلے مکمل ہوگئی، اور اس کے بعد نمازِ فجر پڑھی گئی۔ اگر بیعتِ عقبہ، بیعتِ حدیبیہ اور بیعتِ مکہ کی طرح ہر صحابی نے یکے بعد دیگرے حضرت ابوبکرؓ کے سیدھے ہاتھ پر اپنا سیدھا ہاتھ رکھ کر بیعت کی تو فرداً فرداً بیعت کرنے، اور بیعت سے پہلے اور بعد میں کی جانے والی تقاریر میں اچھا خاصا وقت لگا ہوگا، اور چوں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی تقریر کے اختتام پر نماز کے لیے کھڑے ہوجانے کو کہا تھا، اس لیے یہ بیعت نمازِ ظہر سے پہلے مکمل نہ ہوئی ہوگی۔ یہ خلافت کے لیے ''پہلی بیعتِ عامہ'' تھی اور اس کے پورے ہونے پر، رسول کریم ﷺ کا وہ صحابی جو خلافت کا سب سے زیادہ حق دار ہونے کے باوجود، خلافت کا دعوے دار نہیں تھا، مدینے کے عوام کے ووٹ سے اسلامی ریاست کا پہلا خلیفہ منتخب ہوگیا۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ کی عمر ۶۰ سال، حضرت عمرؓ کی ۵۰ سال، حضرت عثمانؓ کی ۵۵ سال اور حضرت علیؓ کی ۳۰ سال تھی۔

(۱) شہر کا انتخاب:

عام بیعت کے بعد، رسول کریم ﷺ کی تجہیز و تکفین کے بارے میں مشاورت کا عمل بالآخر شروع ہوا۔ اس مشاورت میں سب نے شرکت کی۔ سب سے پہلے یہ طے کرنا تھا کہ آپؐ کو کہاں دفن کیا جائے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل آرا سامنے آئیں: [۲۲۸]

(۱) یروشلم:

اس تجویز کی بنیاد یہ تھی کہ یہ شہر بہت سے انبیا کی آخری آرام گاہ ہے۔ تعجب ہے کہ تجویز دینے والوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ مدینے اور یروشلم کے درمیان سیکڑوں میل کا فاصلہ ہے اور آپؐ کے جسدِ مطہر کو وہاں لے جانے میں ہفتوں لگ جاتے اور وہ بھی جون کی

شدید گرمی میں۔اس کے علاوہ یروشلم ہرقل کے زیرِ تسلط تھا۔تقریباً تین سال پہلے، جمادی الاولیٰ ۸ھ (ستمبر ۶۲۹ء) میں، زیدؓ بن حارثہ کی سرکردگی میں موتہ (اردن) کے مقام پر رومیوں سے انتہائی خطرناک جنگ ہو چکی تھی۔ اگلے سال رجب ۹ھ (اکتوبر ۶۳۰ء) میں، رسول کریم ﷺ نے اس محاذ پر اپنی زندگی کی سب سے بڑی فوج کشی کی اور تبوک تک پہنچ گئے۔ دو سال بعد، ربیع الاوّل ۱۱ھ (جون ۶۳۲ء) میں، حضرت زیدؓ بن حارثہ کے نوجوان بیٹے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کی قیادت میں، اسلامی لشکر تین سال پہلے ہونے والی جنگِ موتہ کا بدلہ لینے کے لیے مدینے سے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے کوچ کا منتظر تھا۔ان حالات میں یروشلم کے بارے میں سوچنا سخت حیران کن ہے۔[۲۲۹] ظاہر ہے کہ یہ تجویز منظور نہیں ہو سکتی تھی، چنانچہ نہ ہوئی

(۲) مکہ:

اس تجویز کی بنیاد یہ تھی کہ مکہ آپؐ کی جائے ولادت اور آپ کے اجداد کا وطن ہے[۲۳۰] اور یہاں خانہ کعبہ ہے۔ مدینے سے مکے کا سفر ہفتہ بھر سے کم نہ تھا۔ جون کی گرمی میں، آپؐ کے جسدِ مطہر کے ساتھ، مدینے سے مکے تک اونٹوں پر سفر کرنا بھی اتنا ہی غیر حقیقت پسندانہ تھا، جتنی یروشلم کی تجویز، چنانچہ یہ تجویز بھی منظور نہ ہوئی۔

(۳) مدینہ: [۲۳۱]

رسول کریم ﷺ کی وفات کو تقریباً ۲۴ گھنٹے گزرنے کے بعد، آپؐ کی تدفین کے لیے اس سے بہتر جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔اس پر جلد اتفاق ہو گیا۔

(II) مدینے میں جگہ کا انتخاب:

اب سوال اٹھا کہ مدینے میں کس جگہ دفن کیا جائے۔اس بارے میں بھی تین تجاویز پیش ہوئیں:

(۱) مسجدِ نبوی میں منبر کی جگہ جہاں آپؐ خطبہ دیتے تھے۔[۲۳۲]

(۲) مصلے کی جگہ جہاں آپؐ نماز کی امامت فرماتے تھے۔[۲۳۳]

(۳) جنت البقیع کا قبرستان [۲۳۴]

پہلی دو تجاویز آپؐ کی یہ بات یاد آنے پر مسترد کر دیں گئیں[۲۳۵] کہ مرض الموت کی شدت کے دوران آپؐ نے بار بار یہ کہا تھا کہ ''یہود اور نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے انبیا کی قبور کو سجدہ گاہ بنا دیا۔'' منبر اور مصلے دونوں مسجد میں تھے، مصلے کے معنے سجدہ گاہ ہیں۔

جنت البقیع میں اس وقت رسول کریم ﷺ کے شیر خوار بیٹے ابراہیم، آپ کی تین بیٹیاں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ، آپؐ کی ایک بیوی حضرت زینبؓ بنت خزیمہ اور بہت سے صحابہ دفن تھے۔حضرت ابوبکرؓ کو یاد آیا کہ آپؐ نے ایک بار فرمایا تھا کہ اللہ کے رسول کو وہیں دفن کیا گیا ہے جہاں اس کی روح قبض کی گئی تھی۔ انھوں نے صحابہ کو بتایا۔ دو دنوں کے دوران، یہ تیسرا موقع تھا جب حضرت ابوبکرؓ کے چند جملوں سے حتمی فیصلے ہو گئے۔ فیصلہ ہوا کہ نہ صرف یہ کہ آپؐ کو حضرت عائشہ کے حجرے میں دفن کیا جائے بلکہ آپؐ نے جس پلنگ پر وفات پائی تھی، اسے ہٹا کر عین اس کے نیچے آپؐ کی قبر کھودی جائے۔[۲۳۶]

(III) اب پانچ مراحل باقی تھے:

(۱) غسل

(۲) تکفین

(۳) نمازِ جنازہ

(۴) قبر کی تیاری

(۵) تدفین

غسل، تکفین اور تدفین کے فرائض حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، حضرت عباسؓ کے دونوں بیٹوں، اسامہؓ بن زیدؓ اور آپؐ کے آزاد کردہ غلام شقران نے ادا کیے۔[۲۳۷] غسل دینے اور کفنانے کے وقت زیادہ افراد جمع نہیں کیے جاتے لیکن تدفین سب عزیز و اقارب کی

موجودگی میں ہوتی ہے جس کے بعد فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ تاہم تدفین کے وقت حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ موجود نہ تھے۔ تاریخ اس کی وجہ کے بارے میں خاموش ہے اور اکیسویں صدی عیسوی کے مسلمان کو اس پر تدبر کی دعوت دیتی ہے تاریخ بہرحال قابلِ قبول وجہ بتائے بغیر، یہ ضرور بتاتی ہے کہ رسول کریم ﷺ کی نمازِ جنازہ، کسی امام کے پیچھے، ''باجماعت'' ادا نہیں کی گئی۔[۲۳۸] اسلام میں باجماعت فرض نماز کی طرح باجماعت نمازِ جنازہ کی فضیلت ہے۔ ایک اجتماعی دکھ میں خاندان یا احباب کا ہر فرد شرکت کے لیے اتنا بے چین ہوتا ہے کہ اعزا و اقربا دور دور سے نمازِ جنازہ پڑھنے پہنچتے ہیں۔ جب حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی موت کی خبر مدینے پہنچی تو آپؐ نے اپنے صحابہ کے ساتھ اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ باجماعت پڑھی تھی۔

اگر سقیفہ بنی ساعدہ کے انہونے وقوعہ کی وجہ سے، آپؐ کی تجہیز و تکفین غیر معمولی اور غیر ضروری تاخیر سے شروع ہوئی، تو اس کی وجہِ تاخیر (یعنی یہ واقعہ) تاریخ میں درج ہے لیکن تدفین کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی غیر موجودگی اور تدفین سے پہلے باجماعت نمازِ جنازہ ادا کرنے میں کیا امر مانع رہا؟ جو کام سترہ منٹ میں ہوسکتا تھا، اس میں سترہ گھنٹے کیوں لگائے گئے؟ شدید موسمِ گرما میں، پیر کا روز گزرنے کے بعد، منگل کو بھی پورا دن آپؐ کا جسدِ مطہر حضرت عائشہؓ کے حجرے میں پلنگ پر رہا۔ صحابہ دس دس کی ٹولیوں میں آتے[۲۳۹] اور ہر صحابی فرداً فرداً نمازِ جنازہ پڑھتا۔ جب ایک ٹولی چلی جاتی تو دوسری اندر آتی اور پھر اسی طرح ہر صحابی فرداً فرداً نمازِ جنازہ پڑھتا۔ اس انداز میں جو نہ پہلے اور نہ بعد میں کبھی اختیار کیا گیا، پہلے مردوں نے فرداً فرداً آپؐ کی نمازِ جنازہ پڑھی اور پھر خواتین نے۔ آخر میں بچوں کو حجرے میں داخل کیا گیا۔

اگر اس وقت مدینے اور اس کے آس پاس کی آبادی مردوں، عورتوں اور بچوں کو ملا کر پانچ ہزار کے لگ بھگ ہو، اور ہمارا قیاس ہے کہ یہ اس سے کہیں زیادہ تھی، اور دس دس افراد کی ایک ٹولی کے حجرے میں داخل ہونے، آپؐ کو دیکھنے، فرداً فرداً نمازِ جنازہ پڑھنے اور پھر ایک ایک کرکے باہر نکلنے میں، اگر دو منٹ بھی لگیں، تو اس پورے عمل کے مکمل ہونے میں سترہ

گھنٹے لگتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ ماہ جون کے دوسرے ہفتے کا آغاز تھا۔ ابنِ سعد نے، طبقاتِ ابنِ سعد میں، دو رواۃ کے حوالے سے لکھا ہے کہ تدفین سے پہلے آپؐ کا کرتہ پھولا ہوا تھا اور ناخنوں میں سبزی آ گئی تھی۔[۲۶۱]

پچھلے چودہ سو سال سے، مدینے میں میّتوں کو تدفین سے پہلے باجماعت نمازِ جنازہ کے لیے مسجدِ نبوی لایا جاتا ہے۔ آج بھی نمازِ باجماعت کے بعد مسجدِ نبوی میں باجماعت نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ آپؐ کے امتیوں کی باجماعت نمازِ جنازہ تو آج بھی مسجدِ نبوی میں پڑھی جاتی ہے اور خود آپؐ کی باجماعت نمازِ جنازہ آپؐ کے حجرے سے متصل مسجدِ نبوی میں نہیں پڑھی گئی اور اس موضوع پر لکھنے سے بھی گریز کیا گیا ہے۔ جس طرح بعض مورخین نے، جن کے نام پچھلے صفحات میں دیئے گئے ہیں، سقیفہ بنی ساعدہ کے ذکر کو ٹال کر اس کے بارے میں شبہات بڑھائے، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی آپؐ کی تدفین کے وقت غیر موجودگی، آپؐ کی باجماعت نمازِ جنازہ ادا نہ ہونے، اور ہر فرد کے فرداً فرداً نمازِ جنازہ پڑھنے کی وجوہات پر روشنی نہ ڈال کر تجسّس اور استعجاب میں اضافہ کیا گیا ہے۔ تدفین کے وقت سات موجود افراد میں تین کا اضافہ مشکل نہ تھا۔

ہم تاریخ کے اس خلا کو پُر تو نہیں کر سکتے لیکن چند تاریخی حقائق کا ذکر ضرور کر سکتے ہیں۔ اولاً اگر آپؐ کی نمازِ جنازہ امام کے پیچھے باجماعت ادا کی جاتی، جو کی جانی چاہیے تھی، تو اس کی امامت خلیفہِ وقت حضرت ابوبکرؓ کرتے۔ ثانیاً حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے وقت تک حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا تھا۔ ثالثاً حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد، حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو اکیلے اپنے حجرے میں آنے کو کہا۔ حضرت ابوبکرؓ پہنچ گئے۔ حضرت علیؓ نے کہا: ''ابوبکر! ہم جانتے ہیں کہ اللہ نے آپ کو کتنا نوازا ہے، اور آپ کا رتبہ کتنا بلند ہے۔ اللہ کی قسم ہمیں کسی ایسے فائدہ پر ملال نہیں جو اللہ نے آپ کو عطا کیا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتے دار ہونے کے ناطے خلافت کے معاملے میں ہمارا بھی کچھ حق بنتا تھا۔ آپ نے تو ہمیں اپنا حق استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا، اور ہمارے سامنے حتمی فیصلہ رکھ دیا۔''

حضرت ابوبکرؓ نے یہ سنا تو رو پڑے اور کہا: ''علی! اگر ایک طرف میری اور میرے خاندان کے مابین خوشنودی کا معاملہ ہو اور دوسری طرف میری اور اللہ کے رسول ﷺ کے خاندان کے مابین خوشنودی کا معاملہ ہو، اور مجھے ان دونوں میں انتخاب کرنا پڑے، تو اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میری دلی تمنا یہ ہوگی کہ میرے اور میرے آقا ﷺ کے خاندان کے درمیان تعلقات استوار ہوں۔'' [۲۴۰]

اسی دن ظہر کے وقت حضرت علیؓ نے مسجدِ نبوی میں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ [۲۴۱]

(۳) غسل:

رسول کریم ﷺ کے جسدِ مطہر کو غسل دینے والوں میں مندرجہ ذیل صحابہ شامل تھے: [۲۴۲]

(۱) حضرت علیؓ

(۲) حضرت عباسؓ

(۳) حضرت عباسؓ کے بڑے بیٹے حضرت فضلؓ

(۴) حضرت عباسؓ کے دوسرے بیٹے حضرت قثمؓ

(۵) حضرت زیدؓ کے بیٹے حضرت اسامہؓ

(۶) رسول کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام شقرانؓ

ابھی جسدِ مطہر کو غسل دینا شروع نہیں ہوا تھا کہ خزرج کے ایک صحابی حضرت اوسؓ بن خولی نے حضرت عائشہؓ کے حجرے کے بند دروازے پر دستک دی اور کہا: ''علی! اللہ کے رسول ﷺ کے غسل میں ہمارا بھی حصہ ہے۔'' حضرت اوسؓ ان جاں نثار صحابہ میں تھے جنھوں نے جنگِ بدر میں شرکت کی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ آپؐ کی تجہیز و تکفین کے ان مراحل میں بھی شرکت کے لیے بے چین تھے، جن میں ایک انتہائی محدود تعداد ہی شریک ہوسکتی

ہے۔ حضرت اوسؓ بن خولی نے اس دردمندی سے یہ درخواست کی کہ حضرت علیؓ نے کہا: ''اچھا، اندر آجاؤ۔'' [۲۴۳]

اب سوال یہ اٹھا کہ جسدِ مطہر کو غسل دینے کے لیے آپؐ کے جسم کے اوپر سے آپؐ کا جُبّہ اتارا جائے یا نہیں؟ [۲۴۴] فیصلہ یہ ہوا کہ آپؐ کو جبے سمیت غسل دیا جائے، چنانچہ پانی آپؐ کے جبّے کے اوپر ڈالا جاتا رہا اور حضرت علیؓ جبّے کے اوپر سے آپؐ کا جسم ملتے رہے۔ [۲۴۴] جسم پر پانی پڑا اور اسے رگڑا گیا تو پورے حجرے میں خوشبو پھیل گئی۔ [۲۴۵] صحرائے عرب کے دو گرم ترین دن گزرنے کے باوجود، آپؐ کو دیکھ کر یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ آپؐ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ حضرت علیؓ کے مونہہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے:

''میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! زندگی میں بھی آپؐ کتنے اچھے لگتے تھے، اور مرنے کے بعد بھی آپؐ کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔'' [۲۴۶]

(۴) تکفین:

غسل کے بعد کفنانے کا مرحلہ آیا۔ اس کے لیے پہلے صرف ایک یمنی چادر کا انتخاب ہوا، لیکن پھر کسی وجہ سے، جو کہیں درج نہیں، اسے ترک کر دیا گیا، اور جسدِ مطہر پر تین سفید چادریں یکے بعد دیگرے لپیٹ دی گئیں۔ ترک شدہ چادر حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہؓ نے تبرکاً لے لی۔ [۲۴۷]

(۵) قبر کی تیاری:

اب قبر کی تیاری کا مرحلہ تھا۔ یہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ دوسرا دن ہونے کے باوجود، آپؐ کی قبر کو تیار کرنے کے لیے گورکن کا انتخاب نہیں ہوا تھا۔ مدینے میں دو ماہر گورکن تھے۔ ایک حضرت ابوعبیدہؓ تھے۔ یہی وہ حضرت ابوعبیدہؓ ہیں جن کا نام حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے ایک مستحق امیدوار کے طور پر پیش کیا تھا، اور جنھیں حضرت عمرؓ نے خلیفہ بنتے ہی حضرت خالدؓ بن ولید کی جگہ شام میں اسلامی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ حضرت ابوعبیدہؓ

صندوقی طرز کی قبر بناتے تھے جس کا مکے میں رواج تھا۔ اس قبر کی چاروں اطراف صندوق کی طرح عمودی ہوتیں۔ دوسرے ایک انصاری صحابہ حضرت ابوطلحہ زیدؓ بن سہیل تھے۔ وہ بغلی طرز کی قبر بناتے تھے جس کا مدینے میں رواج تھا۔[۲۴۸] اس میں قبر کے بغل میں ایک گڑھا ہوتا ہے جسے لحد کہتے ہیں اور جس میں مردے کو لٹا دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں آج بھی لحد مروج ہے۔

منگل کے روز کسی وقت حضرت عباسؓ نے ان دونوں گورکنوں کو بلانے کے لیے قاصد بھیجے۔ روایت ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ گھر پر نہیں ملے۔[۲۴۹] یہ بات یقینی ہے کہ اگر منگل کو انھیں بروقت، یہ اشارہ بھی مل جاتا کہ انھیں رسول کریم ﷺ کی قبر تیار کرنی ہے، تو وہ حضرت عائشہؓ کے حجرے کے پاس سے نہ ہلتے کجا یہ کہ اپنے گھر پر نہ ملیں۔ علاوہ ازیں مدینہ کتنا بڑا شہر تھا کہ وہ ڈھونڈنے سے نہ ملتے۔ اگر کوئی منادی والا مدینے کی چند گلیوں میں ان کا نام پکارتا تو وہ مل جاتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی تدفین پر نہ صرف یہ کہ پیر کو غور نہیں ہوا، بلکہ منگل کو بھی حضرت عباسؓ نے یہ کارروائی خاصی دیر سے شروع کی۔ اس کارروائی میں ریاست کا عمل دخل کم اور حضرت عباسؓ یا بنوہاشم کا حصہ زیادہ رہا۔ اگر انتظام ریاست کے پاس ہوتا تو یہ مراحل زیادہ منظّم طریقے اور کم تاخیر سے مکمل ہو سکتے تھے۔

حضرت ابوطلحہ زیدؓ بن سہیل مل گئے اور انھوں نے آ کر حضرت عائشہؓ کے حجرے میں آپؐ کی لحد تیار کی۔[۲۵۰] مدینہ نخلستان ہے اور اس کے زیرِ زمین پانی کی سطح بلند تھی۔ قبر کھودی تو معلوم ہوا کہ نیچے زمین گیلی تھی، چنانچہ لحد میں پہلے وہ بستر[۲۵۱] بچھایا گیا جس پر آپؐ نے پیر کو دن میں وفات پائی تھی، اور جس پر پیر اور منگل کی درمیانی رات حجرے میں اکیلے گزری تھی۔

(۲) تدفین:

تدفین میں وہی سات صحابہ، بشمول حضرت اوسؓ بن خولی، شریک ہوئے جو غسل میں شریک تھے۔[۲۵۲] پچھلے صفحات میں بتایا گیا ہے کہ جب فرداً فرداً نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے سیکڑوں ٹولیاں حجرے میں آتی رہیں تو ہر ٹولی دس صحابہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس طرح تدفین کے

وقت کم از کم تین اور صحابی آسانی سے حجرے میں آ سکتے تھے۔ وفات کے کم از کم ۳۲ گھنٹے[۲۵۳] بعد، منگل اور بدھ کی درمیانی رات کو، بالآخر جسدِ مطہر کو لحد میں بستر کے اوپر رکھ دیا گیا۔ لحد کے بغلی گڑھے کو کچی اینٹوں سے بند کر دیا گیا اور اوپر مٹی ڈال دی گئی۔[۲۵۴]

حضرت امِ سلمہؓ کہتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی موت کا یقین نہیں آیا، یہاں تک کہ میں نے کدالوں کی آوازیں سنیں۔[۲۵۵] حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی تدفین کا علم نہ ہوا، یہاں تک کہ ہم نے بدھ کی رات کے درمیانی اوقات میں کدالوں کی آواز سنی۔[۲۵۶] ابنِ اسحاق کے مطابق لحد میں چار صحابہؓ اترے:[۲۵۷]

(۱) حضرت علیؓ (۲) اور (۳) حضرت عباسؓ کے دونوں بیٹے، فضلؓ اور قثمؓ۔ قثمؓ لحد سے سب سے آخر میں نکلے۔ (۴) رسول کریم ﷺ کے مولا یعنی آزاد کردہ غلام شقرانؓ۔ وہ حبشی نژاد تھے۔ وہ اور حضرت اوسؓ بن خولی قوی الجثہ تھے۔ وہ روایات جن میں لکھا ہے کہ مغیرہؓ بن شعبہ سب سے آخر میں باہر نکلے، درست نہیں۔[۲۵۸] وہ تدفین کے وقت موجود ہوں گے۔

تدفین ہو چکی تو رسول کریم ﷺ کے نوجوان ذاتی خدمت گار حضرت اَنسؓ حضرت فاطمہؓ کے حجرے کے سامنے سے گزرے، جس کے متصل حجرے میں آپؐ کو ابھی دفن کیا گیا تھا۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ پر اپنی جان چھڑکنے والی بیٹی نے، رات کے سناٹے میں، سسکیوں سے ڈوبی ہوئی آواز میں، دروازے کی اوٹ سے، انھیں پکارا۔ صحیح بخاری کے مطابق، حضرت فاطمہؓ کے الفاظ یہ تھے:

یا انس اطابت انفسکم ان تحتو علیٰ رسول اللہ ﷺ التراب[۲۵۹]

اے اَنس! تمہارے دلوں نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ رسول اللہ ﷺ کے جسم پر مٹی ڈالو؟

اَنسؓ کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔ آج اکیسویں صدی عیسوی میں، کسی انسان کے پاس اس کا جواب ہے؟

اللھم صلی علیٰ محمد النبی الامّی وآلہٖ و اصحابہٖ وسلم

حواشی وحوالہ جات:

۱ (i) سیرۃ النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی (اضافہ وتکمیلہ)، ص: ۱۷۰ (حاشیہ)، مطبع معارف، اعظم گڑھ، بھارت، ۱۹۳۳ء

(ii) سیرۃ النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی (اضافہ وتکمیلہ)، ص: ۱۷۶ (حاشیہ)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۲ (i) مؤطا (اردو ترجمہ بمعہ عربی متن)، مرتب: امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحیدالزماں، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت: نامعلوم

(ii) Al Muwatta (انگریزی ترجمہ)، مترجم: Aisha Abdul Rahman، Bewley Kagan Paul International, London WC 1B 35W, U.K.، ۱۹۸۹ء

۳ (i) مؤطا (کتاب الجنائز)، مرتب: امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحیدالزماں، ص: ۲۲۰ تا ۲۳۹، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت: نامعلوم

(ii) Al-Muwatta (The Burials)، مترجم: Aisha Abdul Rahman، Bewley، ص: ۸۵ تا ۹۲، Kagan Paul International, London WC 1B 35W, U.K.، ۱۹۸۹ء

۴ (i) مؤطا (مردے کے دفن کے بیان میں)، مرتب: امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحیدالزماں، ص: ۲۲۷، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت: نامعلوم

(ii) Al-Muwatta (Burying the dead)، مترجم: Aisha Abdul Rahman Bewley، ص: ۸۸، Kagan Paul International, London WC 1B 35W, U.K.، ۱۹۸۹ء

۵ (i) مؤطا (اردو ترجمہ بمعہ عربی متن)، مرتب: امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحیدالزماں، ص: ۲۲۷، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت: نامعلوم

(ii) Al Muwatta (انگریزی ترجمہ)، مترجم: Aisha Abdul Rahman، Bewley، ص: ۸۸، Kagan Paul International, London WC 1B 35W, U.K.، ۱۹۸۹ء

۶ المغازی (عربی میں) (تین جلدوں میں)، مصنف: محمد بن عمر بن واقدی، تحقیق: ڈاکٹر مارسڈن جونز، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ۱۹۶۶ء

۷ المغازی (عربی میں) (جلد سوئم)، مصنف: محمد بن عمر بن واقدی، تحقیق: ڈاکٹر مارسڈن جونز، ص: ۱۱۲۰، عالم الکتب، بیروت، لبنان (تیسرا اڈیشن ۱۹۸۴ء)

۸ The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء (پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

۹ سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) (عربی متن "السیرۃ النبویہ" مطبوعہ "دارالکتب العلمیہ" بیروت، شائع شدہ ۲۰۰۹ء میں دیکھا جاسکتا ہے)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۰ (i) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۷۸۷، ۷۸۸، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۷۸، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء (پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

۱۱ تاریخ الامم والملوک (تاریخِ طبری) جلد دوئم (حصہ اول) (اردو ترجمہ)، مصنف: ابوجعفر محمد بن جریر طبری، مترجم: سید محمد ابراہیم ندوی، ص: ۴۳۱، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۳ء

۱۲ The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل،

مترجم: اسماعیل راگی فاروقی، ص: ۴۹۵، Islamic Book Trust, Kualalampur, Malaysia ۱۹۹۳ء

۱۳ حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابو یحییٰ امام خان، ص: ۶۳۰، ۶۳۱، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۴ Muhammad، مصنف Martin Lings، ص: ۳۳۷، سہیل اکیڈمی، اردو بازار چوک، لاہور، ۱۹۸۵ء

۱۵ الرحیق المختوم، مصنف صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص: ۶۲۳، ۶۲۴، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۶ قرآن سورۃ المائدۃ (۵)، آیت نمبر: ۳، پارہ: "لایحب اللّٰہ" (۶)

۱۷ (i) The Life of Muhammad (Translation), Author: Ibn-e-Ishaq, P:679, Oxford Univeristy Press, Karachi, 1955 (Reprinted: 1967)

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجم: عبدالجلیل صدیقی، ص: ۸۹، ۷۹۴، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۸ (i) سیرت النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی، ص: ۱۷۸، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

(ii) سیرۃ خیر الانامؐ (مرکزی مقالہ سیرت)، مصنف: ڈاکٹر حمید اللہ، ص: ۱۶۳، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۹ مؤطا (اردو ترجمہ بمعہ عربی متن)، مرتب: امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحید الزماں، ص: ۲۲۷، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت: نامعلوم

۲۰ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۱۷، "باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ"، حدیث: ۷۲۷، Kazi Publications 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۲۱ ایضاً

۲۲ ایضاً

۲۳ (i) ایضاً، ص: ۵۱۸

(ii) مؤطا (اردو ترجمہ بمعہ عربی متن)، مرتب: امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحید الزماں، ص: ۷۰۶، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت: نامعلوم

۲۴ (i) تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) جلد دوئم (حصہ اول) (اردو ترجمہ)، مصنف: ابو جعفر محمد بن جریر طبری، مترجم: سید محمد ابراہیم ندوی، ص: ۴۳۲، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۳ء

(ii) الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص: ۶۲۵، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۵ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) جلد دوئم (حصہ اول) (اردو ترجمہ)، مصنف: ابو جعفر محمد بن جریر طبری، مترجم: سید محمد ابراہیم ندوی، ص: ۴۳۲، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۳ء

۲۶ ایضاً

۲۷ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۹۲، ۹۳، "باب مناقب الانصار"، حدیث: ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، Kazi Publications 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۲۸ (i) ایضاً، ص: ۵، "باب مناقب المہاجرین"، حدیث: ۶

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ)، جلد دویم، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۷۹۵، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

(iii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۷۹، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء (پہلی بار

لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

۲۹ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۴۸۷، باب ''حجۃ الوداع''، حدیث: ۶۸۹، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۳۰ ایضًا، ص: ۵، کتاب المناقب، باب قول النبیؐ، حدیث نمبر: ۶، سدوا الابواب الا باب ابوبکرؓ

۳۱ ایضًا

۳۲ ایضًا، ص: ۷، ''باب قول النبیؐ''، حدیث نمبر: ۸، ۹

۳۳ ایضًا، ص: ۵، ''باب قول النبیؐ سدوا الابواب الا باب ابوبکر''

۳۴ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام: پنجاب یونیورسٹی، جلد نمبر: ۱۲، ص: (۷۹۱)، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور ۲۰۰۵ء (بارثانی)

۳۵ الفاروق، علامہ شبلی نعمانی، ص: ۱۰۸، ۱۰۹، مدینہ پبلشنگ کمپنی، بندر روڈ، کراچی، ۱۹۷۷ء

۳۶ ایضًا، ص: ۱۰۹، ''حاشیہ''

۳۷ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۱۲، ''باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ''، حدیث: ۷۱۷، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۳۸ ایضًا، ص: ۵۱۱، حدیث: ۷۱۶

۳۹ Sahih Muslim (انگریزی ترجمہ) (Vol:II-B)، مرتب: امام مسلم، مترجم: ڈاکٹر محمود مرتاجی، ص: ۲۴۲، ''کتاب الحج''۔ ''باب حجۃ النبیؐ''، حدیث: ۱,۲۱۸، ناشر: دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۸ء

۴۰ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۴۸۴، ''باب حجۃ

الوداع''، حدیث: ۶۸۵، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۴۱ ایضًا، ص: ۴۸۷، باب ''حجۃ الوداع''، حدیث: ۶۸۹

۴۲ ایضًا، ص: ۵۱۲، باب ''مرض النبیؐ ووفاتہ''، حدیث: ۷۱۷

۴۳ ایضًا

۴۴ ایضًا، ص: ۵۱۱، ۵۱۲، حدیث: ۷۱۶، ۷۱۷

۴۵ سقیفہ کے حقائق (روایت ابومخنف کی روشنی میں)، مصنف: جلیل تاری، مترجم: نسیم حیدر زیدی، ص: ۹۰، مجمع جہانی اہل بیت، قم، ایران، ۲۰۰۶ء

۴۶ رسول اللہؐ کی حکمرانی و جانشینی، مصنف: ڈاکٹر حمید اللہ، مترجم: خالد پرویز، ص: ۱۷۳، ۱۷۴، بیکن بکس، اردو بازار لاہور/گلگشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۶ء

۴۷ The Prophet's establishing a state and his succession، مترجم: خالد پرویز، ص: ۱۹۰، ۱۹۱، بیکن بکس، اردو بازار، لاہور/گلگشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۹ء

۴۸ صحیفہ ہمام بن منبہ عن ابی ہریرہؓ (ترجمہ)، تحقیق و ترجمہ: ڈاکٹر حمید اللہ، بیکن بکس، میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور/گلگشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۷ء

۴۹ مؤطا (اردو ترجمہ بمعہ عربی متن)، مرتب: امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحید الزماں، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا

۵۰ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۱۱، ۵۱۲، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۱۶، ۷۱۷، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۵۱ The Origins and Early Development of Shi'a Islam، سید حسین محمد جعفری، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۰ء

۵۲ سقیفہ کے حقائق (روایت ابومخنف کی روشنی میں)، مصنف: جلیل تاری، مترجم: نسیم حیدر

زیدی،ص:۸۱،مجمع جہانی اہل بیت،قم،ایران،۲۰۰۶ء

۵۳؎ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume IV)،مترجم:ڈاکٹر محمد محسن خان،اسلامک یونیورسٹی،مدینہ،ص:۴۴۹،''کتاب الانبیا''،حدیث:۶۷۵، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore،۱۹۷۹ء

۵۴؎ سقیفہ کے حقائق (روایت ابومخنف کی روشنی میں)،مصنف:جلیل تاری،مترجم:نسیم حیدر زیدی،ص:۸۱،مجمع جہانی اہل بیت،قم،ایران،۲۰۰۶ء

۵۵؎ Sahih Muslim (انگریزی ترجمہ) (Vol: IV-A)،مرتب:امام مسلم،مترجم:ڈاکٹر محمود مرتاجی،ص:۴۷،''فضائل ابوبکر صدیقؓ''،حدیث:۲۳۸۷،ناشر:دارالاشاعت، اردو بازار،کراچی،۱۹۹۸ء

۵۶؎ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume VII)،مترجم:ڈاکٹر محمد محسن خان،اسلامک یونیورسٹی،مدینہ،ص:۳۸۷، ''کتاب المرضیٰ''،باب:''مریض کا کہنا کہ مجھے تکلیف ہے،یا کہنا کہ''ہائے سر''یا میری تکلیف بہت بڑھ گئی ہے اور ایوبؑ کا کہنا کہ مجھے بیماری ہوگئی ہے اور آپ الرحم الراحمین ہیں۔''حدیث:۵۷۰، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore،۱۹۷۹ء

۵۷؎ رسول اللہؐ کی حکمرانی و جانشینی،مصنف:ڈاکٹر حمید اللہ،ص:۱۹۲،بیکن بکس،اردو بازار لاہور/ گلگشت کالونی،ملتان،۲۰۰۹ء

۵۸؎ ایضًا

۵۹؎ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)،مترجم:ڈاکٹر محمد محسن خان،اسلامک یونیورسٹی،مدینہ،ص:۵۱۱،''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''،حدیث:۷۱۶، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore،۱۹۷۹ء

۶۰؎ (i) ایضًا،ص:۵۱۸،''باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ''،حدیث:۷۲۷

(ii) ایضًا،(Volume I) ص:۳۶۵،''کتاب الاذان''،حدیث:۶۴۷،۱۹۷۶ء

۶۱؎ ایضًا

۶۲؎ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)،مصنف:ابنِ اسحاق، مترجم:الفرڈ گیوم،ص:۶۸۰،۶۸۱،اکسفورڈ یونیورسٹی پریس،کراچی،۱۹۶۷ء(پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ)،جلد دویم،مرتب:ابنِ ہشام،مترجمین:عبدالجلیل صدیقی اور (نظر ثانی) مولانا غلام رسول مہر،ص:۷۹۹،۸۰۰،شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی،۱۹۷۹ء

(iii) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume I)،مترجم:ڈاکٹر محمد محسن خان،اسلامک یونیورسٹی،مدینہ،ص:۳۶۵،''کتاب الاذان''،حدیث:۶۴۷، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore،۱۹۷۶ء

۶۳؎ (i) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ)،جلد دویم،مرتب:ابنِ ہشام،مترجمین:عبدالجلیل صدیقی اور (نظر ثانی) مولانا غلام رسول مہر،ص:۷۹۹،۸۰۰،شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی،۱۹۷۹ء

(ii) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume I)،مترجم:ڈاکٹر محمد محسن خان،اسلامک یونیورسٹی،مدینہ،ص:۳۶۵،''کتاب الاذان''،حدیث:۶۴۷، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore،۱۹۷۶ء

۶۴؎ ایضًا (Vol: V)،مترجم:ڈاکٹر محمد محسن خان،اسلامک یونیورسٹی،مدینہ،ص:۹۲،''باب مناقب الانصار''،حدیث:۱۴۳،۱۴۴،۱۴۵، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore،۱۹۷۹ء

۶۵؎ ایضًا،ص:۵۱۹،باب''مرض النبیؐ ووفاتہ''،حدیث:۷۲۸

۶۶؎ ایضًا،ص:۷۵،باب''مناقب فاطمہ''،حدیث:۱۱۱

۶۷ ایضاً، ص:۵۱۳، باب ''مرض النبیؐ ووفاتہ''، حدیث:۱۸۱۷

۶۸ ایضاً، ص:۶۸، باب ''مناقب الحسن والحسین''، حدیث:۹۶

۶۹ (i) ایضاً، ص:۴۳، باب ''مناقب علی بن ابی طالب''، اس کے نیچے حدیث کا نمبر نہیں ہے۔ باب کا عنوان ہی حدیث ہے، اس کا پس منظر اگلی حدیث (۸۶۳) میں ہے۔
(ii) ایضاً (Vol: III)، ص: ۵۳۷، ۵۳۸، ''کتاب الصلح''، حدیث:۸۶۳

۷۰ صحیفہ ہمام بن منبہ عن ابی ہریرہؓ، تحقیق اور ترجمہ: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، بیکن بکس، میاں چیمبرز، ٹمپل روڈ، لاہور/ گلگشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۷ء

۷۱ مؤطا (Al-Muwatta)، مرتب: امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحید الزماں، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، ۱۹۸۹ء

۷۲ The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص: ۶۵۰، کراچی، ۱۹۶۷ء (پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

۷۳ سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) جلد دویم، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظر ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۴۲۷، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۷۴ کتاب المغازی (عربی) (تین جلدوں میں)، مصنف: محمد بن عمر بن واقد، تحقیق: ڈاکٹر مارسڈن جونز، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ۱۹۶۶ء/ عالم الکتب، بیروت، لبنان، ۱۹۸۴ء (تیسرا اڈیشن)

۷۵ مسند امام احمد بن حنبلؒ، مؤلف: امام احمد بن حنبلؒ، مترجم: محمد ظفر اقبال، (اردو ترجمہ بارہ جلدوں پر مشتمل ہے) مکتبہ رحمانیہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۹ء

۷۶ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد دویم)، زیرِ اہتمام: پنجاب یونیورسٹی، ص: ۷۰، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۰ء

۷۷ رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص: ۲۶۹، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

۷۸ مسند امام احمد بن حنبلؒ (جلد دہم)، مؤلف: امام احمد بن حنبلؒ، مترجم: محمد ظفر اقبال، مسند الانصار، ص: ۶۶۳، مکتبہ رحمانیہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۹ء

۷۹ اٹلس سیرت نبویؐ (عربی سے اردو ترجمہ) مؤلف: ڈاکٹر شوقی ابو خلیل، مترجم: محمد امین، ص: ۴۷۶، دارالسلام، ریاض/ لاہور، ۲۰۰۳ء

۸۰ تذکرۃ الحفاظ (جلد اول)، مصنف: امام شمس الدین ذہبی، مترجم: حافظ محمد اسحاق، ص: ۲۹، اسلامک پبلشنگ ہاؤس، شیش محل روڈ، لاہور، ۱۹۸۱ء

۸۱ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد چہارم)، زیر اہتمام: پنجاب یونیورسٹی، ص: ۱۲۲، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور، ۱۹۶۹ء

۸۲ صحیح بخاری شریف (مترجم) (جلد دوئم)، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: علامہ وحید الزماں، ص: ۱۸۱۷، ''کتاب المغازی''، حدیث نمبر: ۱,۴۷۵، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

۸۳ صحیح البخاری (جلد دوئم)، مترجم: ظہور الباری اعظمی، ص: ۷۶۲، ۷۶۳، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۸۵ء

۸۴ لغات القرآن (جلد دوئم)، مؤلف: مولانا محمد عبدالرشید نعمانی، ص: ۵۴، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۴ء

۸۵ (i) سیرت نگاری (آغاز و ارتقا)، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، ص: ۳۷، قرطاس، پوسٹ بکس نمبر ۸۴۵۳، کراچی یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء
(ii) ایضاً

۸۶ مسند امام احمد بن حنبلؒ، مؤلف: امام احمد بن حنبلؒ، مترجم: محمد ظفر اقبال، ص: ۲۸۸ (جلد دہم)، حدیث نمبر: ۲۳,۴۰۰، مکتبہ رحمانیہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۹ء

۸۷ The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۵۰، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء (پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

۸۸ سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ)، (جلد دویم)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور

(نظر ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص:۷۴۲، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۸۹ المغازی (جلد سوئم) (عربی)، مصنف: محمد بن عمر بن واقدی، تحقیق: ڈاکٹر مارسڈن جونز، ص:۱۱۸۰، ۱۱۸۱، عالم الکتب، بیروت، لبنان، ۱۹۸۴ء

۹۰ (i) الطبقات الکبیر (عربی) (جلد دوئم)، مصنف: محمد بن سعد، ص:۱۵۴، ۱۵۵، مکتبہ الخانجی، قاہرہ، ۲۰۰۱ء

(ii) طبقاتِ ابنِ سعد (اردو ترجمہ) (جلد اول)، مترجم: عبداللہ العمادی، ص:۴۵۸، ۴۵۹، نفیس اکیڈمی، سٹریچن روڈ، کراچی (۱۹۸۳ء اشاعت سوئم)

۹۱ سقیفہ کے حقائق (روایت ابومخنف کی روشنی میں)، مصنف: جلیل تاری، مترجم: نسیم حیدر زیدی، ص:۳۱، مجمع جہانی اہل بیت، قم، ایران، ۲۰۰۶ء،

www.ahl-ul-bayt.org, info@ahl-ul-bayt.org

۹۲ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیرِ اہتمام: پنجاب یونیورسٹی، جلد نمبر:۱۲، ص: ۴۰۵، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور، ۲۰۰۵ء (بار ثانی)

۹۳ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) جلد دوئم (حصہ اول) (اردو ترجمہ)، مصنف: ابوجعفر محمد بن جریر طبری، مترجم: سید محمد ابراہیم ندوی، ص: ۴۰۵، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۳ء

۹۴ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۷، ''کتاب لانبیا''، باب: قول النبیؐ، حدیث: ۸، ۹، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۹۵ سقیفہ کے حقائق (روایت ابومخنف کی روشنی میں)، مصنف: جلیل تاری، مترجم: نسیم حیدر زیدی، ص:۸۱، مجمع جہانی اہل بیت، قم، ایران، ۲۰۰۶ء

۹۶ ایضاً، ص: ۵۵

۹۷ نہج البلاغۃ (ترجمہ)، مترجم: علامہ سید شریف رضی، شیعہ جنرل بک ایجنسی، انصاف پریس

لاہور/حمایت اہلِ بیت وقف رجسٹرڈ، ریلوے روڈ، لاہور، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

۹۸ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیرِ اہتمام: پنجاب یونیورسٹی، جلد نمبر:۱۴ (۲)، ص: ۵۹، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۲ء

۹۹ (i) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume IX)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۱۹۵، ''کتاب الاحکام''، حدیث: ۲۶۱، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

(ii) صحیح بخاری شریف مترجم (جلد سوئم)، مترجم: علامہ وحیدالزماں، ص: ۹۰۲، ''کتاب الاحکام''، حدیث نمبر: ۲۰۲۴، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

(iii) صحیح البخاری (جلد سوئم)، مترجم: ظہور الباری اعظمی، ص: ۷۹۰، ''کتاب الاحکام''، حدیث نمبر: ۲۰۱۸، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

۱۰۰ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۰۹، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۱۲، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۱۰۱ ایضاً (Vol: 1)، ص: ۳۷۱، ''کتاب الاذان''، حدیث نمبر: ۶۵۵، ۱۹۷۶ء

۱۰۲ ایضاً

۱۰۳ ایضاً

۱۰۴ ایضاً

۱۰۵ ایضاً

۱۰۶ ایضاً

۱۰۷ ایضاً

۱۰۸ ایضاً

۱۰۹ ایضًا (Vol: V)، ص: ۵۱۸، باب مرض النبیؐ، حدیث نمبر: ۷۲۷، ۱۹۷۹ء

۱۱۰ ایضًا

۱۱۱ ایضًا (Vol: 1)، ص: ۳۸۳، ''کتاب الاذان''، حدیث نمبر: ۶۸۰، ۱۹۷۶ء

۱۱۲ ایضًا

۱۱۳ ایضًا

۱۱۴ ایضًا، ص: ۳۸۴، حدیث نمبر: ۶۸۱

۱۱۵ ایضًا

۱۱۶ ایضًا

۱۱۷ ایضًا

۱۱۸ ایضًا، ص: ۴۰۲، ''کتاب الاذان''، ابواب صفة الصلاة، حدیث نمبر: ۷۲۱

۱۱۹ ایضًا، ص: ۳۷۲، ''کتاب الاذان''، حدیث نمبر: ۶۵۵

۱۲۰ ایضًا

۱۲۱ ایضًا

۱۲۲ (i) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume I)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۳۸۴، ''کتاب الاذان''، حدیث: ۶۸۱، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۶ء

۱۲۳ ایضًا

۱۲۴ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۰، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء (پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) (جلد دوئم)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۷۹۸، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۲۵ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۰، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء (پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) (جلد دوئم)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۷۹۸، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۲۶ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۲۵، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۳۵، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۱۲۷ سیرۃ خیرالانامؐ (مرکزی مقالہ سیرت)، ڈاکٹر محمد حمیداللہ، ص: ۱۶۵، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۲۸ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۲۵، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۳۵، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۱۲۹ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۰، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) (جلد دویم)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۷۹۹، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۳۰ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۰، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) (جلد دویم)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۷۹۹، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۳۱ رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص: ۲۷۴، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

۱۳۲ (i) ایضًا

(ii) نبی رحمتؐ، سید ابوالحسن ندوی، ص: ۵۴۵، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد (۱)، کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

۱۳۳ مسند امام احمد بن حنبلؒ (جلد:۱۱)، مؤلف: امام احمد بن حنبلؒ، مترجم: محمد ظفر اقبال، ص: ۶۰، حدیث نمبر: ۲۴۷۲۶، مکتبہ رحمانیہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۹ء

۱۳۴ (i) رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص: ۲۷۴، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

(ii) الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص: ۶۲۸، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۳۵ (i) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۲۰، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۲۹، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

(ii) ایضًا (Vol: 1)، ص: ۴۰۲، ''کتاب الاذان'' ابواب صفۃ الصلاۃ، حدیث نمبر: ۷۲۱، ۱۹۷۶ء

۱۳۶ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابن اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۲، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) (جلد دویم)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظر ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۰۱، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۳۷ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۲۳، ''باب

مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۳۳، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۱۳۸ ایضًا، ص: ۵۱۹، حدیث نمبر: ۷۲۸

۱۳۹ ایضًا

۱۴۰ سقیفہ کے حقائق (روایت ابومخنف کی روشنی میں)، مصنف: جلیل تاری، مترجم: نسیم حیدر زیدی، ص: ۹۰، مجمع جہانی اہلِ بیت، قم، ایران، ۲۰۰۶ء

۱۴۱ ایضًا

۱۴۲ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۱۳، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۱۸، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۱۴۳ ایضًا، ص: ۵۲۱، حدیث نمبر: ۷۳۰

۱۴۴ ایضًا، ص: ۵۲۶، حدیث نمبر: ۷۳۹

۱۴۵ ایضًا، ص: ۵۱۳، حدیث نمبر: ۷۱۹

۱۴۶ ایضًا، ص: ۵۲۶، حدیث نمبر: ۷۳۹

۱۴۷ (i) رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص: ۲۷۶، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

(ii) الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص: ۶۲۹، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۴۸ (i) ایضًا

(ii) رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص: ۲۷۶، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

۱۴۹ ایضًا

۱۵۰ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۱۴، ۵۲۷، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۲۱، ۷۴۰، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۱۵۱ ایضاً (Volume V)، ص: ۵۲۰، ۵۲۲، حدیث: ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲۔

۱۵۲ ایضاً (Vol:V)، ص: ۵۱۵، ۵۱۶، حدیث نمبر: ۷۲۲، ۷۲۶

۱۵۳ ایضاً (Vol:V)، ص: ۵۱۵، ۵۲۱، حدیث نمبر: ۷۲۲، ۷۳۰

۱۵۴ ایضاً (Vol:V)، ص: ۵۲۱، ۵۱۶، حدیث نمبر: ۷۳۰

۱۵۵ ایضاً (Vol:V)، ص: ۵۱۵، ۵۲۳، حدیث نمبر: ۷۲۲، ۷۳۲

۱۵۶ ایضاً (Vol:V)، ص: ۵۱۵، ۵۱۶، حدیث نمبر: ۷۲۲

۱۵۷ ایضاً (Vol:V)، ص: ۵۱۴، حدیث نمبر: ۷۲۱

۱۵۸ ایضاً (Vol:V)، ص: ۵۱۴، ۵۱۵، حدیث نمبر: ۷۲۱، ۷۲۲

۱۵۹ ایضاً (Vol:V)، ص: ۵۱۵، حدیث نمبر: ۷۲۲

۱۶۰ ایضاً (Vol:V)، ص: ۵۲۳، حدیث نمبر: ۷۳۲

۱۶۱ ایضاً

۱۶۲ رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص: ۲۷۷ (جلد اول)، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

۱۶۳ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۱۵، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۲۲، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۱۶۴ ایضاً، ص: ۵۲۶، حدیث نمبر: ۷۳۹

۱۶۵ رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص: ۲۷۷، دارالاشاعت،

اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

۱۶۶ (i) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume II)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۲۱۴، ۲۱۶، حدیث نمبر: ۳۸۲، ۳۸۴، ۳۸۵، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

(ii) صحیح بخاری شریف (مترجم) (جلد اول)، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: علامہ وحیدالزماں، ص: ۵۷۹، ۵۸۱، ''کتاب الجنائز''، حدیث نمبر: ۱,۲۱۶، ۱,۲۱۹، ۱,۲۲۰، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۶۷ (i) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume II)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۲۱۱، حدیث: ۳۷۵، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

(ii) صحیح بخاری شریف (مترجم) (جلداول)، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: علامہ وحیدالزماں، ص: ۵۷۷، حدیث نمبر: ۱,۲۱۰، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۶۸ (i) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume II)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۲۱۱، حدیث: ۳۷۵، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

(ii) صحیح بخاری شریف (مترجم) (جلداول)، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: علامہ وحیدالزماں، ص: ۵۷۷، حدیث نمبر: ۱,۲۱۰، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۶۹ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۲، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) (جلد دویم)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی

اور (نظر ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص:۸۰۳، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۷۰ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (i) (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۳۰، ''کتاب الانبیا''، حدیث:۴۲، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

(ii) ایضًا، ص:۳۱، باب مناقب عثمانؓ بن عفان (باب ہی حدیث ہے)

(iii) ایضًا، حدیث نمبر:۴۴

۱۷۱ الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص:۶۳۱، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۷۲ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص:۵۲۳، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۳۳، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۱۷۳ (i) جامع ترمذی (جلد دوئم)، ص: ۵۱۳، ۵۱۵، ''ابواب المناقب''، حدیث نمبر: ۳,۴۱۳، ۳,۴۱۴، ۳,۴۲۰، ۳,۴۲۱، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

(ii) الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص: ۶۴۵ تا ۶۴۷، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۷۴ جامع ترمذی (جلد دوئم)، ص:۵۱۲، ۵۱۳، ''ابواب المناقب''، حدیث نمبر:۳,۴۱۱، ۳,۴۱۲، ۳

۱۷۵ ایضًا، ص:۵۱۳، ''ابواب المناقب''، حدیث نمبر:۳,۴۱۳

۱۷۶ ایضًا، حدیث نمبر:۳,۴۱۴

۱۷۷ کتاب الطبقات الکبیر (عربی میں) (جلد دوئم)، مصنف: محمد بن سعد (ابنِ سعد)، تحقیق: ڈاکٹر علی محمد عمر، ص:۲۳۳، مکتبہ الخانجی الشرکہ الدولیہ للطباعۃ، منطقہ صناعیہ ثانیہ قطعہ ۱۳۹۔ شارع ۳۹، مدینہ ۶/اکتوبر، قاہرہ، ۲۰۰۱ء، email: pic@6oct.ie-eg.com

۱۷۸ ایضًا

۱۷۹ ایضًا

۱۸۰ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۶۸۲، ۶۸۳، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) (جلد دویم)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظر ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص:۸۰۴، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۸۱ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۶۸۷، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) (جلد دویم)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظر ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص:۸۱۳، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۸۲ محمد رسول اللہؐ (انگریزی میں) (ترجمہ)، مصنف: ڈاکٹر حمیداللہ، مترجم: خالد پرویز، ص:۳۱۵، بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور/گلگشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۹ء

۱۸۳ ابوبکرؓ (عربی میں) (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: شیخ محمد احمد پانی پتی، ص:۴۹۱، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۹ء

۱۸۴ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۶۸۳، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (اردو ترجمہ) (جلد دویم)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظر ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص:۸۰۶، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۸۵ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص:۵۲۳، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ''، حدیث: ۷۳۳، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۱۸۶ ایضًا

۱۸۷ ایضًا

۱۸۸ ایضًا

۱۸۹ ایضًا

۱۹۰ ایضًا

۱۹۱ ایضًا، ص:۵۲۴

۱۹۲ ایضًا

۱۹۳ ایضًا

۱۹۴ ایضًا

۱۹۵ محمد رسول اللہؐ (انگریزی میں) (ترجمہ)، مصنف: ڈاکٹر حمیداللہ، مترجم: خالد پرویز، ص:۳۱۴، بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور/گلگشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۹ء

۱۹۶ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۶۸۳، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص:۸۰۶، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۹۷ (i) ایضًا، ص:۸۱۸

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۷۹۴، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

۱۹۸ (i) ایضًا، ص:۵۰۴، ۵۰۵

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص:۳۷۸ تا ۳۸۰، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

(iii) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume III)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص:۵۶۶ تا ۵۶۸، ''کتاب الشروط'' باب ''الشروط فی الجہاد''، حدیث: ۸۹۱، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

(iv) الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص: ۴۶۵ تا ۴۶۷، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۹۹ (The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume III، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۶۸، ۵۶۹، ''کتاب الشروط'' باب ''الشروط فی الجہاد''، حدیث: ۸۹۱، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۲۰۰ (The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume VI، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۳۴۳، ''کتاب التفسیر'' حدیث: ۳۵۷، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۲۰۱ (i) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۸، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۷۹۴، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(iii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: اسماعیل راگی فاروقی، ص: ۵۱۳، ۵۱۴، Islamic Book Trust, Kualalampur, Malaysia، ۱۹۹۳ء

(iv) حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابو یحییٰ امام خان، ص: ۶۵۳، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۰۲ مندرجہ بالا چاروں کتابوں کے ان ہی صفحات پر درج ہے۔

۲۰۳ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۶۴۹، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۳۹۷، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۰۴ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۱۴، ''کتاب المناقب'' حدیث: ۱۹، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۲۰۵ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۵، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۰۹، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۰۶ (i) ایضًا

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۵، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۰۷ (i) ایضًا

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۰۹، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۰۸ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۱۴، ''کتاب المناقب'' حدیث: ۱۹، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۲۰۹ (i) ایضًا

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۶، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(iii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۰، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

(iv) حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابو یحییٰ امام خان، ص: ۶۴۸، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۱۰ (i) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۱۴، ''کتاب المناقب''، حدیث: ۱۹، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۶، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(iii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۰، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۱۱ مندرجہ بالا تینوں کتابوں کے ان ہی صفحات پر درج ہے۔

۲۱۲ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۶، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۰، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۱۳ (i) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۱۴، ''کتاب المناقب''، حدیث: ۱۹، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابن اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۶، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(iii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۰، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۱۴ الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص: ۵۵۶، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۱۵ ایضًا

۲۱۶ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۷، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۲، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۱۷ (i) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۱۴، ''کتاب المناقب''، حدیث: ۱۹، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۶، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(iii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۰، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۱۸ (i) ایضًا، ص: ۸۱۱

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۷، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۱۹ نہج البلاغۃ (ترجمہ) حضرت علیؓ کے خطبات، مکتوبات اور فرمودات کا مجموعہ، مترجم: علامہ سید شریف رضی، ص: ۶۸۴، شیعہ جنرل بک ایجنسی، انصاف پریس، لاہور/ حمایتِ اہلِ بیت وقف رجسٹرڈ، ریلوے روڈ، لاہور، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

۲۲۰ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق،

مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۹، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۸، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۲۱ ابوبکرؓ (عربی میں) (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: شیخ محمد احمد پانی پتی، ص: ۴۹۰ تا ۴۹۴، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۹ء

۲۲۲ محمد رسول اللہؐ (انگریزی میں) (ترجمہ)، مصنف: ڈاکٹر حمیداللہ، مترجم: خالد پرویز، ص: ۳۱۵، ۳۱۶، بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور/ گلگشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۹ء

۲۲۳ رسول اللہؐ کی حکمرانی و جانشینی، (انگریزی میں) مصنف: ڈاکٹر حمیداللہ، مترجم خالد پرویز، ص: ۱۹۱، ۱۹۲، بیکن بکس، اردو بازار لاہور/ گلگشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۹ء

۲۲۴ Sahih Muslim (ترجمہ) (Vol: II-B)، مرتب: امام مسلم، مترجم: ڈاکٹر محمود مرتاجی، ص: ۲۴۲، ''کتاب الحج''۔ ''باب حجۃ النبیؐ''، حدیث: ۱,۲۱۸، ناشر: دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۸ء

۲۲۵ الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص: ۶۳۲، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۲۶ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۶، ۶۸۷، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۱، ۸۱۲، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۲۷ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۷، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۲، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۲۸ The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: محمد حسین

ہیکل، مترجم: اسماعیل راگی فاروقی، ص: ۵۱۱ تا ۵۱۳، Islamic Book Trust, Kualalampur, Malaysia، ۱۹۹۳ء

(ii) حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابو یحییٰ امام خان، ص: ۶۵۰ تا ۶۵۳، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۲۹ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: اسماعیل راگی فاروقی، ص: ۵۱۱، Islamic Book Trust, Kualalampur, Malaysia، ۱۹۹۳ء

(ii) حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابو یحییٰ امام خان، ص: ۶۵۰، ۶۵۱، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۳۰ (i) ایضًا، ص: ۶۵۰، ۶۵۱

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: اسماعیل راگی فاروقی، ص: ۵۱۱، Islamic Book Trust, Kualalampur, Malaysia، ۱۹۹۳ء

۲۳۱ (i) ایضًا

(ii) حیاتِ محمد صل اللہ علیہ وسلم (عربی سے اردو ترجمہ) مصنف محمد حسین ہیکل، مترجم: ابو یحییٰ امام خان، ص ۶۵۰، ۶۵۱، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور ۱۹۹۳ء

۲۳۲ (i) ایضًا، ص: ۶۵۱

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: اسماعیل راگی فاروقی، ص: ۵۱۱، Islamic Book Trust, Kualalampur, Malaysia، ۱۹۹۳ء

۲۳۳ (i) ایضًا

(ii) حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابو یحییٰ امام خان، ص: ۶۵۱، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور

۲۳۴ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۸، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۵، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۳۵ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: اسماعیل راگی فاروقی، ص: ۵۱۱، Islamic Book Trust, Kualalampur, Malaysia، ۱۹۹۳ء

(ii) حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابو یحییٰ امام خان، ص: ۶۵۱، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۳۶ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۸، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۵، ۸۱۶، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۳۷ (i) ایضًا، ص: ۸۱۴

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۷، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۳۸ (i) ایضًا، ص: ۶۸۸

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۶، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۳۹ الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص: ۶۳۳، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۴۰ (i) تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) جلد دوئم (حصہ اول) (اردو ترجمہ)، مصنف: ابوجعفر محمد بن جریر طبری، مترجم: سید محمد ابراہیم ندوی، ص: ۴۴۴، ۴۴۵، دارالاشاعت، اردو

بازار، کراچی، ۲۰۰۳ء

(ii) Muhammad، Martin Lings، ص: ۳۴۴، سہیل اکیڈمی، اردو بازار چوک، لاہور، ۱۹۸۵ء

۲۴۱ (i) ایضًا

(ii) تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) جلد دوئم (حصہ اول) (اردو ترجمہ)، مصنف: ابوجعفر محمد بن جریر طبری، مترجم: سید محمد ابراہیم ندوی، ص: ۴۴۵، دارالاشاعت، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۴۲ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۷، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۴، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۴۳ (i) ایضًا

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۷، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۴۴ (i) ایضًا، ص: ۶۸۷، ۶۸۸

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۴، ۸۱۵، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۴۵ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: اسماعیل راگی فاروقی، ص: ۵۱۲، Islamic Book Trust, Kualalampur, Malaysia، ۱۹۹۳ء

(ii) حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابو یحییٰ امام خان، ص: ۶۵۱، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۴۶ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۸، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۴، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۴۷ Sahih Muslim (Vol: II-A) (ترجمہ) مرتب: امام مسلم، مترجم: ڈاکٹر محمود مرتاجی، ص: ۵۶، ''کتاب الجنائز''، باب ''**فی کفن المیت**''، حدیث: ۹۴۱، ناشر: دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۸ء

۲۴۸ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۸، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۵، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء، (ترجمہ نامکمل ہے)۔

۲۴۹ (i) حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابو یحییٰ امام خان، ص: ۶۵۳، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی (اضافہ وتکمیلہ)، ص: ۱۸۴، مطبع معارف، اعظم گڑھ، بھارت، ۱۹۳۳ء

(iii) ایضًا، ص: ۱۹۰، ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۲۵۰ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص: ۶۸۸، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص: ۸۱۵، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/ کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۵۱ (i) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی (اضافہ وتکمیلہ)، ص: ۱۸۴، مطبع معارف، اعظم گڑھ، بھارت، ۱۹۳۳ء

(ii) ایضًا، ص:۱۹۱، ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۲۵۲ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: اسماعیل راگی فاروقی، ص:۵۱۴، Islamic Book Trust, Kualalampur, Malaysia، ۱۹۹۳ء

(ii) حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابویحییٰ امام خان، ص:۶۵۳، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۵۳ رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص: ۲۷۹، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

۲۵۴ (i) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: اسماعیل راگی فاروقی، ص:۵۱۴، Islamic Book Trust, Kualalampur, Malaysia، ۱۹۹۳ء

(ii) حیاتِ محمد ﷺ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: ابویحییٰ امام خان، ص:۶۵۳، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۵۵ مؤطا (اردو ترجمہ بمعہ عربی متن)، مرتب: امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحید الزماں، ص: ۲۲۸، ''کتاب الجنائز''۔ ''ماجاء فی دفن المیت'' (مردے کے دفن کے بیان میں) میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

۲۵۶ The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۶۸۸، اسکفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۵۷ (i) ایضًا، ص:۶۸۸، ۶۸۹

(ii) سیرت النبیؐ (جلد دوئم) (اردو ترجمہ)، مرتب: ابنِ ہشام، مترجمین: عبدالجلیل صدیقی اور (نظرِ ثانی) مولانا غلام رسول مہر، ص:۸۱۶، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور/کراچی، ۱۹۷۹ء

۲۵۸ (i) ایضًا، ص:۸۱۷

(ii) The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ

اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۶۸۹، اسکفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۵۹ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Volume V)، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص: ۵۲۷، ''باب مرض النبی ﷺ و وفاتہٗ''، حدیث: ۷۳۹، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore، ۱۹۷۹ء

۲۶۰ عمرؓ فاروق اعظم، مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: حبیب اشعر، ص: ۷۰۸، ۷۰۹، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۲ء (چھٹی بار)

۲۶۱ (i) الطبقات الکبیر (عربی) (جلد دوئم)، مصنف: محمد بن سعد، ص: ۲۳۹، مکتبہ الخانجی، قاہرہ، ۲۰۰۱ء

(ii) طبقاتِ ابن سعد (اردو ترجمہ) جلد دویم)، مترجم: عبداللہ العمادی، ص: ۳۱۷، نفیس اکیڈمی، سٹریچن روڈ، کراچی، طبعِ ششم: ۱۹۸۲ء

❁ ❁ ❁

رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات

رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات آپؐ کے ہم عصر ہی بتا سکتے تھے اور انہیں کو بتانا بھی چاہیے تھی لیکن سیرت النبیؐ (جلد دوئم) میں سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ''کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخِ وفات کی مجھ کو کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی۔''[۱] یہ بھی کم حیرت کی بات نہیں کہ آپؐ کی وفات کے ڈیڑھ سو سال گزرنے کے بعد، جب آپؐ کی پہلی مفصل سوانح عمری[۲] لکھی گئی، جو اکیسویں صدی ہجری میں بھی موجود ہے، تو اس میں آپؐ کے یومِ ولادت، یومِ وفات، وقتِ وصال اور تاریخِ ولادت (۱۲ ربیع الاوّل) سب کا ذکر ہے، اگر نہیں ہے تو تاریخِ وفات کا۔

تاریخِ وفات کی طرح، آپؐ کی تاریخِ ولادت کے بارے میں بھی کوئی حدیث نہیں ہے۔ یہ قابلِ فہم ہے۔ جب آپؐ پیدا ہوئے تو بھلا کون انسان جانتا تھا کہ یہ یتیم بچہ بڑا ہو کر کیا بنے گا اور اللہ اس کے ذکر کو کیا رفعت دے گا۔ اس وقت آپؐ کی تاریخِ پیدائش کون یاد رکھتا؟ یہی وجہ ہے کہ آج جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ بیسویں صدی عیسوی کے مشہور سیرت نگار قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی مقبول کتاب ''رحمۃ للعالمینؐ'' میں ۹ ربیع الاوّل[۳] کو خاصی تفصیل اور بہت وثوق سے آپؐ کی تاریخِ ولادت لکھا گیا ہے، یا جب یہ پڑھتے ہیں کہ دوسری صدی ہجری میں آپؐ کے مشہور سوانح نگار ابنِ اسحاق نے، کسی سند کا حوالہ دیئے بغیر، ۱۲ ربیع الاوّل[۴] کو آپؐ کی تاریخِ ولادت قرار دیا، یا جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں ۱۷ ربیع

الاوّل اور بیشتر مسلم ممالک میں ۱۲ ربیع الاوّل کو عیدِ میلاد النبیؐ کے طور پر منایا جاتا ہے، تو اکیسویں صدی عیسوی کا مسلمان حیران ہوتا ہے کہ ۹، ۱۲ یا ۱۷ ربیع الاوّل میں سے کون سی تاریخ صحیح ہے اور کس بنیاد پر؟

یہ تو تاریخِ ولادت کی بات ہوئی لیکن جب تاریخِ وفات کی بات آتی ہے تو یہ پڑھ کر حیرت دوچند ہو جاتی ہے کہ ''کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخِ وفات کی.....کوئی روایت احادیث میں'' کیوں نہیں؟

جب آپؐ دنیا سے رخصت ہوئے تو آپؐ کا نام پورے عرب میں گونج رہا تھا، اور آپؐ کے جاں نثار صحابہ کی تعداد ہزاروں میں تھی، جن سے ہزاروں احادیث مروی ہیں۔ آپؐ کی وفات کے صرف بارہ برس بعد، جب ایران، عراق، شام، فلسطین اور مصر جیسے مشہور ممالک، جنھیں اس وقت وہی مقام حاصل تھا، جو آج یورپ اور امریکا کو ہے، اسلامی حکومت کا حصہ بنے، اس وقت بھی آپؐ کے ہزاروں صحابہ زندہ تھے۔ کیا وجہ ہے کہ اس لمبے عرصے کے دوران، اور بعد میں بھی، ان میں سے کسی ایک صحابی کے حوالے سے، اس موضوع پر، ایک حدیث نہیں ملتی؟ کیا اس طویل عرصے کے دوران میں کسی مسلمان کو ان صحابہ سے یہ بات پوچھنے کی خواہش اور جستجو نہیں ہوئی؟ کیا انھیں خود کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس بارے میں بتانا چاہیے؟

اس ناقابلِ فہم بات کو سمجھنے کی سعی میں، پہلی صدی ہجری، دوسری صدی ہجری، تیسری صدی ہجری اور آخر میں چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی میں، آپؐ کی تاریخِ وفات کا جس طرح ذکر ہوا، یا نہیں ہوا، اس کا مختصر سا جائزہ پیش ہے۔

پہلی صدی ہجری:

دنیا کے قدیم ترین مجموعۂ حدیث کا جو نسخہ[۵] بیسویں صدی عیسوی میں، تحقیق اور تصدیق کے بعد، بازیاب ہوا، وہ ہمام بن منبہ سے منسوب ہے۔ وہ روایتاً ۱۰۱ھ (۷۱۹ء) میں وفات پا گئے۔ یہ پہلی صدی ہجری کا اوّلین اور واحد، معلومہ مجموعۂ حدیث ہے، جو آج ہمارے

پاس ہے۔اس میں کل ۱۳۸ حدیثیں ہیں، جو حضرت ابو ہریرہؓ کے کانوں نے براہِ راست رسول کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنیں، اور حضرت ابو ہریرہؓ سے براہِ راست ہمام بن منبہ تک پہنچیں، جن کے درمیان کوئی دوسرا راوی نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا سالِ وصال ۵۸ھ (۶۷۸ء) بتایا جاتا ہے۔اس طرح یہ ۱۳۸ حدیثیں تقریباً پہلی نصف صدی ہجری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ہمام بن منبہ کو منتقل ہوگئی تھیں۔

یہ قدیم ترین مجموعۂ حدیث دریافت کرنے، اور اس کی ہر طرح تصدیق کرنے کے بعد، اسے شائع کرانے کی سعادت ڈاکٹر حمیداللہ کو ملی۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء) میں یہ نسخہ برلن (جرمنی) میں دیکھا، اور بعد میں اس نسخے سے بھی کہیں قدیم تر قلمی نسخے کا دمشق (شام) میں کھوج لگایا، اور دونوں نسخوں کا مقابلہ کرنے کے بعد، اسے ۱۹۵۳ء میں حیدرآباد (بھارت) سے شائع کرادیا۔نصف صدی بعد، ۲۰۰۷ء میں، یہ مجموعۂ حدیث لاہور اور ملتان (پاکستان) سے بیک وقت شائع ہوا۔

اس مجموعۂ احادیث میں نہ کہیں رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات کا ذکر ہے، نہ یومِ وفات کا، اور نہ آپؐ کے آخری ایام، وفات، یا وفات کے بعد ہونے والے واقعات کا۔

دوسری صدی ہجری:

فقہ، تاریخ نویسی اور تصنیف وتالیف کے اعتبار سے، دوسری صدی ہجری بہت اہم ہے۔ذیلی سطور میں وہ آٹھ نام دیئے جارہے ہیں، جو سب صاحبِ تصنیف تھے، جنھوں نے اپنی پوری عمر یا اس کا بیشتر حصہ دوسری صدی ہجری میں گزارا، جن میں سے بیشتر مدینے میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے، اور بعض بزرگوں کی ساری زندگی مدینے میں گزری اور وہیں مدفون ہوئے۔ان سے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ ان میں سے بیشتر بزرگ رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات کا ذکر کریں گے۔ یہ آٹھ مشہور نام یہ ہیں:

نمبر شمار	نام	ہجری سنین میں	عیسوی سنین میں	کتاب	تاریخِ وفات کا ذکر
۱۔	امام جعفر صادقؒ	۸۰ھ۔۱۴۸ھ	۶۹۹ء۔۷۶۵ء	۔۔۔	نہیں کیا
۲۔	امام ابوحنیفہؒ	۸۰ھ۔۱۵۰ھ	۶۹۹ء۔۷۶۷ء	کتاب الآثار	نہیں کیا
۳۔	ابنِ اسحاق	۸۵ھ۔۱۵۱ھ	۷۰۴ء۔۷۶۸ء	المبتداء المبعث والمغازی	نہیں کیا۔یومِ وفات (پیر) کا ذکر ہے۔
۴۔	امام مالکؒ	۹۳ھ۔۱۷۹ھ	۷۱۱ء۔۷۹۵ء	موطا	نہیں کیا۔یومِ وفات (پیر) کا ذکر ہے۔
۵۔	امام شافعیؒ	۱۵۰ھ۔۲۰۴ھ	۷۶۷ء۔۸۲۰ء	کتاب الام	نہیں کیا
۶۔	واقدی	۱۳۰ھ۔۲۰۷ھ	۷۴۷ء۔۸۲۲ء	المغازی	پہلی بار ۱۲ ربیع الاوّل کا ذکر کیا۔
۷۔	ابنِ ہشام	نامعلوم۔۲۱۳ھ	نامعلوم۔۸۲۸ء	سیرۃ النبیؐ	نہیں کیا۔یومِ وفات (پیر) کا ذکر ہے۔
۸۔	ابنِ سعد☆	۱۶۸ھ۔۲۳۰ھ	۷۸۴ء۔۸۴۵ء	طبقاتِ کبیر☆	۱۲ ربیع الاوّل کا ذکر دہرایا۔

☆ (طبقاتِ کبیر تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی لیکن ابن سعد کی ۶۲ سال عمر میں سے ۳۲ سال کا تعلق دوسری صدی ہجری سے ہے)

ان آٹھ میں سے پانچ بزرگ یعنی امام جعفر صادقؒ، امام ابوحنیفہؒ، ابنِ اسحاق، امام مالکؒ اور واقدی ہم عصر تھے۔ امام شافعیؒ، واقدی، ابنِ ہشام اور ابنِ سعد بھی ہم عصر تھے۔ واقدی، ابنِ ہشام اور ابنِ سعد مؤرخ تھے۔ واقدی اور ابنِ سعد نے ۱۲ ربیع الاوّل (۱۱ھ) کا ذکر آپؐ کی تاریخِ وفات کے طور پر کیا۔ابنِ ہشام نے نہیں کیا۔اب ان آٹھوں بزرگوں کا مختصر ذکر ہوجائے۔

امام جعفر صادقؒ فقہِ جعفریہ کے بانی ہیں۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے سگے سکڑ نواسے اور حضرت علیؓ کے سگے سکڑ پوتے تھے۔ وہ مدینے میں پیدا ہوئے، تقریباً پوری زندگی وہیں گزار دی اور وہیں دفن ہیں۔ وہ پہلے فقیہ ہی نہیں بلکہ معلم، محدث اور مصنف بھی تھے۔ رسول کریم ﷺ

سے ان کا جو گہرا تعلق اور قریبی رشتہ تھا اور انھیں آپؐ سے جو محبت ہوسکتی ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے ننھیال اور ددھیال دونوں میں چار نسلوں سے رسول کریم ﷺ کا مستقل ذکر ہوتا ہوگا۔ کیا ان کے مدینے میں ۶۲ سالہ طویل قیام کے دوران، کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ کے جدِ امجد اور ہمارے نبی ﷺ کی تاریخِ وفات پر کوئی مستند بات، اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود، کیوں موجود نہیں ہے۔ اس بارے میں آپ کے عظیم خانوادے سے زیادہ کون جاسکتا ہے؟ براہِ کرم ہماری رہنمائی کریں۔ اگر یہ بات نہیں بھی پوچھی گئی تو کیا امام جعفر صادقؒ نے خود اس خلا کو پُر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، جو ایک صدی سے زیادہ عرصے سے موجود تھا؟ یہ ایک معمہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ فقۂ حنفیہ کے بانی ہیں۔ ان کا قیام مدینے سے دور ضرور تھا لیکن وہ تاجدارِ مدینہ سے دور نہیں تھے۔ ان کے زمانے میں مدینے میں امام جعفر صادقؒ دین اور علم کی روشنی پھیلا رہے تھے، امام مالکؒ ''مؤطا'' ترتیب دے رہے تھے، ابنِ اسحاق ''سیرتِ رسول اللہؐ'' کا مواد جمع کرنے اور مسودہ تیار کرنے میں مشغول تھے۔ کیا امام ابوحنیفہؒ کے ہزاروں معتقدین میں سے کسی نے ان سے آپؐ کی تاریخِ وفات کے بارے میں نہیں پوچھا؟ کیا انھیں خود کبھی اس کا خیال نہیں آیا کہ اپنی اور اپنے عظیم محقق مریدوں کی محققانہ صلاحیتوں کو اس بارے میں استعمال کریں؟ بلاشبہ ''کتاب الآثار'' کا موضوع صرف ''احادیثِ احکام'' تھیں جن سے فقہ اخذ کیا جاتا ہے لیکن تاریخِ وفات کی جستجو کی ضرورت اپنی جگہ ہے۔

ابنِ اسحاق مدینے میں پیدا ہوئے اور خاصے عرصے وہاں رسول کریمؐ کی سوانح عمری کے لیے بہت محنت اور محبت سے مواد جمع کرتے رہے۔ ان کی کتاب **المبتدا والمبعث والمغازی** آپؐ کی پہلی مفصل سوانح عمری ہے۔ ابنِ اسحاق رسول کریم ﷺ کی وفات کے پون صدی بعد پیدا ہوئے۔ جب انھوں نے ''سیرۃ'' لکھنا شروع کی ہوگی تو آپؐ کو اس جہانِ فانی سے گزرے ہوئے ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزر گیا ہوگا۔ آپؐ سے منسوب لاکھوں احادیث کی طرح، آپؐ کی تاریخِ ولادت اور تاریخِ وفات کے بارے میں بھی مدینے میں بہت

سی روایات، ممکن ہے کہ گردش کر رہی ہوں۔ اگر باہمی تعلقات میں کشیدگی کی وجہ سے، ابنِ اسحاق کو امام مالکؒ سے بات کرنے میں تامل تھا، تو امام جعفر صادقؒ سے پوچھ لینے میں کیا امر مانع تھا، جب کہ ابنِ اسحاق آپؐ کے بارے میں، مرد ہو یا عورت، ہر ایک سے پوچھتے تھے۔

ثانیاً جب ابنِ اسحاق نے، ماخذ یا راوی کا ذکر کیے بغیر، ۱۲ ربیع الاوّل کو آپؐ کی تاریخِ پیدایش کے طور پر لکھ دیا، تو کیا وجہ ہے کہ آپؐ کا یومِ وفات (پیر) لکھنے کے باوجود، اس کے ساتھ ہی آپؐ کی تاریخِ وفات نہیں لکھی؟ یومِ وفات کے ساتھ ہی تاریخِ وفات کا لکھا ہونا فطری ہوتا، اور لکھا نہ ہونا حیرت انگیز ہے۔ یاد رہے کہ ابنِ اسحاق نے آپؐ کے یومِ وفات کے ساتھ وقتِ وصال بھی لکھا ہے۔

کیا اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ابنِ اسحاق کو آپؐ کی تاریخِ وفات کے بارے میں، کوشش کے باوجود، کوئی مستند روایت نہیں ملی؟ یہ عین ممکن ہے، لیکن اس کا اطلاق تو آپؐ کی تاریخِ وفات سے کہیں زیادہ آپؐ کی تاریخِ ولادت پر ہونا چاہیے تھا جس کی ابنِ اسحاق نے کوئی سند نہیں لکھی۔ آپؐ کی اولین مفصل سوانح عمری میں، آپؐ کی تاریخِ ولادت، یومِ ولادت اور یومِ وفات (بلکہ وقتِ وفات) کا اندراج، اور صرف تاریخِ وفات کا عدم اندراج، تاریخ کا زیادہ بڑا معمہ ہے۔

اب امام مالکؒ کی بات ہوجائے۔ وہ فقۂ مالکیہ کے بانی ہیں۔ دوسری صدی ہجری کا وہ نادر مجموعۂ حدیث جو تیرہ سو سال کا انتہائی طویل، غیر محفوظ اور دشوار گزار سفر طے کرنے کے بعد، آج بھی ہمارے پاس ہے، وہ امام مالکؒ کی مرتب کردہ ''مؤطا'' [۶] ہے جس کے بارے میں فقۂ شافعیہ کے بانی امام شافعیؒ سے یہ قول [۷] منسوب ہے کہ آسمان کے نیچے، قرآن کے بعد ''مؤطا'' سے زیادہ صحیح کتاب کوئی نہیں ہے۔ یہ پہلا مجموعۂ حدیث ہے جس میں پیر کو آپؐ کے یومِ وفات کے طور پر درج کیا گیا ہے، تاہم تاریخِ وفات کا ذکر اس میں بھی نہیں ہے۔

مؤطا کا زمانۂ تالیف ۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ (۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) ہے۔ یہ احادیث ہی نہیں بلکہ فقہ کا بھی مجموعہ اور منبع ہے، اور ایک حد تک تاریخ کا ماخذ بھی۔ اس کی تالیف کا پسِ

منظر یہ بتایا گیا ہے کہ عباسی خلیفہ منصور کے دورِ حکومت (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) میں عباسی خلافت ایشیا کے بہت بڑے حصے پر پھیل چکی تھی۔ اس وسیع و عریض سلطنت کے مختلف صوبوں (جو آج آزاد ممالک ہیں) میں عدالتی فیصلوں کو شرعی احکام کے سانچے میں ڈالنے کے لیے ایک مستند اور جامع کتاب کی اشد ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ ''مؤطا'' کی وجۂ تالیف یہ بنی۔

مؤطا میں مختلف عنوانات کے تحت بہت سے ابواب ہیں لیکن رسول کریم ﷺ کی وفات کے بارے میں کوئی علیحدہ باب نہیں ہے، جب کہ آپؐ کی وفات کے موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر، صحیح بخاری میں آپؐ کی علالت،[۸] آخری کلمات اور وفات کے بارے میں علیحدہ علیحدہ ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

مؤطا کے دو ابواب، جنھیں ''کتاب'' کا عنوان دیا گیا ہے، یہ ہیں:

(۱) ''کتاب الجنائز''[۹] (ماجاء فی دفن المیت)۔ اس میں درج ہے کہ آپؐ کی وفات پیر کے روز ہوئی۔

(۲) ''کتاب الجامع''[۱۰] (ماجاء فی اجلاءِ الیھود من المدینہ)۔ اس میں آپؐ کے یہ آخری کلمات درج ہیں کہ اللہ یہود و نصاریٰ کو تباہ کرے جنھوں نے اپنے انبیا کی قبور کو سجدہ گاہ بنا دیا اور پھر یہ فرمایا کہ عرب کی زمین پر دو دین نہ رہیں۔

اپنے ہم عصر ابنِ اسحاق کی طرح، امام مالکؒ نے بھی مؤطا میں صرف یومِ وفات کا ذکر کیا ہے، تاریخِ وفات کا نہیں۔ امام مالکؒ کی پوری زندگی مدینے میں گزری اور امام جعفر صادقؒ کی طرح وہ بھی مدینے میں مدفون ہیں۔ اگر اپنی ۸۴ سالہ طویل مدنی زندگی کے دوران میں، امام مالکؒ نے آپؐ کی تاریخِ وفات کے بارے میں کوئی حدیث سنی ہوتی تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ آپؐ کے یومِ وفات (پیر) کی روایت تو موطا میں درج کر دیتے لیکن یومِ وفات کے ساتھ ہی تاریخِ وفات نہ لکھتے۔

امام شافعیؒ فقۂ شافعیہ کے بانی ہیں اور ایک علیحدہ مکتبِ فقہ کے بانی ہونے کے باوجود، وہ اپنے بزرگ ہم عصر اور فقۂ مالکیہ کے بانی امام مالکؒ کے انتہائی عقیدت مند شاگرد

تھے۔ امام شافعیؒ کی عقیدت ان کے اس قول سے ظاہر ہے کہ آسمان کے نیچے قرآن کے بعد، مؤطا سے زیادہ صحیح کتاب کوئی نہیں۔ یہ عقیدت اور شاگردی امام شافعیؒ کے لڑکپن سے شروع ہوئی اور امام مالکؒ کی وفات تک جاری رہی۔ امام شافعیؒ کی والدہ فاطمہ امام حسینؓ کی سگی پڑپوتی تھیں۔ امام شافعیؒ کی زندگی مکے، مدینے، بغداد اور قاہرہ میں گزری، جو علمِ حدیث کے ممتاز مراکز تھے۔ ''کتاب الام'' ان کی تصانیف کا مجموعہ ہے، اور ایک صدی قبل سات جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ یہاں اس دلچسپ حقیقت کا ذکر ہوجائے کہ جیسے فقۂ شافعیہ کے بانی ہونے کے باوجود، امام شافعیؒ فقۂ مالکیہ کے بانی امام مالکؒ کے شاگرد اور مداح تھے، اسی طرح فقۂ حنبلیہ کے بانی ہونے کے باوجود، امام احمد حنبلؒ، امام شافعیؒ کے شاگرد اور مداح تھے، اور مداحوں کی فہرست میں امام غزالیؒ اور امام رازیؒ جیسے نابغۂ روزگار بھی شامل ہیں۔ امام شافعیؒ سے رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات کے بارے میں کوئی روایت منسوب نہیں۔ اسی طرح امام احمدؒ بن حنبل نے بھی اپنی کئی جلدوں پر مشتمل ''مسند'' میں، جو تقریباً ۳۰ ہزار احادیث پر مشتمل ہے، آپؐ کی تاریخِ وفات کے بارے میں کوئی روایت درج نہیں کی۔ دوسرے الفاظ میں، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل میں سے کسی نے بھی آپؐ کی تاریخِ وفات کے بارے میں کوئی روایت نہیں لکھی۔ امام احمدؒ بن حنبل کا مزید ذکر تیسری صدی ہجری کے ضمن میں آئے گا۔

اب مشہور مورخ واقدی کا ذکر ہوجائے۔ امام جعفر صادقؒ، امام مالکؒ اور ابنِ اسحاق کی طرح، ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی بھی مدینے میں پیدا ہوئے۔ ان کی بہت سی تصانیف، جن میں سے ایک کا نام ''وفات النبیؐ''[۱۱] ہے، صدیوں سے ناپید ہیں۔ ان کی واحد کتاب جو زمانے کی دست برد سے نہ جانے کیسے بچ گئی، ''المغازی'' ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اس کا عربی میں ایڈٹ کیا ہوا اڈیشن اکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن[۱۲] نے تین جلدوں میں شائع کیا۔ ۱۹۸۴ء میں اس کا یہی عربی اڈیشن تیسری بار بیروت (لبنان) سے تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔ اس عربی ترجمے کی تیسری جلد کے صفحہ ۱۲۰۱ پر، آپؐ کی تاریخِ وفات کے بارے میں یہ فقرہ ہے:[۱۳]

"فتوفی رسول اللہ حین زاغت الشمس یوم الاثنین لاثنتی عشرہ خلت من ربیع الاول"

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے پیر کے روز بارہ ربیع الاوّل کو ''زاغت الشّمس'' کے وقت وفات پائی۔''

''زاغت الشّمس'' دن کی کون سی گھڑی ہوتی ہے؟ اس کی وضاحت صحیح بخاری میں موجود ہے، اور موجود بھی ہے رسول کریم ﷺ کے نوجوان ذاتی خادم حضرت اَنسؓ بن مالک کے الفاظ میں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت کا حساب لگانے کے یہ الفاظ رسول کریم ﷺ کی حیات میں رائج تھے۔ صحیح بخاری کی پہلی جلد میں، ''کتاب مواقیت صلوٰۃ'' میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہے: ''نمازِ ظہر کا وقت سورج ڈھلتے ہوئے۔'' اس میں حضرت اَنسؓ بن مالک کے یہ الفاظ درج ہیں:

"اخبرنی انس بن مالک ان رسول ﷺ خرج حین زاغت الشمس فصلی الظھر"

اس فقرے کا انگریزی ترجمہ یہ ہے:

"Narrated Anas bin Malik: Allah's Apostle (PBUH) came out as the sun declined at mid-day, and offered the Zuhur Prayer." [۱۴]

اس فقرے کا اردو ترجمہ یہ کیا گیا ہے:

''حضرت اَنسؓ بن مالک نے خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ سورج ڈھلے برآمد ہوئے اور ظہر کی نماز پڑھائی۔'' [۱۵]

اس طرح رسول کریم ﷺ کی وفات کے دوصدی بعد، تاریخ میں پہلی بار واقدی کے قلم سے رسول کریم ﷺ کی وفات کے بارے میں ایک ایسا مکمل بیان سامنے آیا جس میں وقتِ وفات، یومِ وفات، تاریخِ وفات اور ماہِ وفات سب ایک ساتھ ایک فقرے میں درج تھے۔ واقدی کا یہ فقرہ حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کے لشکر کے شام کی طرف کوچ کرنے کے ذکر میں لکھا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ بہت اختصار سے لکھا گیا ہے اور اس ذکر کے بعد کتاب ختم ہوگئی ہے۔ اگر واقدی کی کتاب ''وفات النبیؐ'' موجود ہوتی تو ممکن ہے کہ اس میں پوری تفصیلات

درج ہوتیں، اور معلوم ہوتا کہ دوصدی بعد یہ روایت کس طرح واقدی کو ملی۔

یہاں ایک فطری سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر دوسری صدی ہجری کے اواخر میں، ۱۲ ربیع الاوّل (۱۱ھ) کے یومِ وفات ہونے کے بارے میں کوئی ایسی مستند روایت موجود تھی، جس کی بنا پر واقدی نے ''مغازی'' میں یہ تاریخ درج کی، تو یہ بات ان کے ہم عصر اور اسی شہر مدینہ کے باسی امام مالکؒ کے علم میں کیوں نہیں آئی؟ اگر امام مالکؒ کے علم میں آئی، تو مؤطا میں کیوں نہیں آئی؟ علاوہ ازیں اس بات سے مدینے میں پیدا ہونے اور رہایش رکھنے والے ابنِ اسحاق مرتے دم تک کیسے بےخبر رہے؟ اگر باخبر ہوتے تو جس طرح انھوں نے، اسناد دیئے بغیر، بارہ ربیع الاوّل کو آپؐ کی تاریخِ ولادت کے طور پر لکھ دیا تھا، اسی طرح اس بار (اور اس بار پوری اسناد کے ساتھ) بارہ ربیع الاوّل کو آپؐ کی تاریخِ وفات کے طور پر کیوں نہیں لکھ دیا؟ یہ بھی تاریخ کا ایک معمہ ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں، ''زاغت الشّمس'' کی چودہ سو سال پہلے کی ہوئی توضیح اس مشہور اور مستند ''عربی، انگریزی لغت'' سے مطابقت رکھتی ہے، جو تقریباً ڈیڑھ صدی قبل، ۱۸۶۳ء میں، آٹھ جلدوں میں، لندن سے شائع ہوئی اور جس کے مؤلف ایڈورڈ ولیم لین ہیں۔ تیسری جلد میں، صفحہ ۱۲۷۷ پر، ''زاغت الشّمس'' کے یہ معنی دیئے گئے ہیں:

"The sun declined from the meridian so that the shade turned from one side to the other". [۱۶]

وقتِ وفات اور وقتِ ظہر کی قربت کی ایک واقعاتی شہادت یہ ہے کہ احادیث اور تواریخ دونوں میں یہ روایت موجود ہے کہ یومِ وفات پیر کو، نمازِ فجر کے دوران میں، آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے حجرے کے دروازے پر لٹکا ہوا پردہ ہٹایا اور دروازے میں کھڑے ہو کر اپنے صحابہ کو حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے رہے۔ [۱۷] اس کے بعد، اس روز نہ نمازِ ظہر کا ذکر ملتا ہے اور نہ اس دن نمازِ ظہر سمیت باقی چار نمازوں میں حضرت ابوبکرؓ کی امامت کا۔

اب تک جن چار اصحاب (امام جعفر صادقؒ، امام مالکؒ، ابنِ اسحاق، واقدی) کا ذکر ہوا ہے، ان سب کا تعلق مدینے سے تھا، اور پہلے دو بزرگ مدینے میں مدفون ہیں۔ پانچویں بزرگ جن کا اب ذکر ہو رہا ہے، ان کا تعلق کوفے سے تھا اور وہ بغداد میں مدفون ہیں، جہاں ابنِ اسحاق اور واقدی بھی مدفون ہیں۔ یہ حضرت امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ چھٹے بزرگ امام شافعیؒ فلسطین میں پیدا ہوئے اور قاہرہ میں دفن ہیں۔ ان چھے اصحاب میں سے صرف واقدی نے آپؐ کی تاریخِ وفات لکھی اور اس طرح دوسری صدی ہجری ختم ہوگئی۔

دوسری صدی ہجری کا اواخر/ تیسری صدی ہجری کا آغاز:

مشہور مورخ ابنِ سعد ۱۶۸ھ/۷۸۴ء میں بصرے میں پیدا ہوئے۔ ۲۳۰ھ/۸۴۵ء میں بغداد میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔ ان کا دورِ حیات دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسرے صدی ہجری کے آغاز پر محیط ہے، تاہم ان کی معروف کتاب ''طبقات الکبیر'' تیسری صدی ہجری کے آغاز میں قلم بند ہوئی۔ اس کا جدید اڈیشن پندرہویں صدی ہجری (۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء) میں قاہرہ سے شائع ہوا ہے۔ اس کی پہلی دو جلدیں، جنھیں بعض حضرات نے ایک زمانے میں ''کتاب النبیؐ'' کا نام دیا تھا، رسول کریم ﷺ کے آباواجداد کے ذکر کے بعد، آپؐ کی ولادت سے وفات تک کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہیں۔

طبقاتِ ابن سعد کی دوسری جلد میں، ابنِ سعد نے آپؐ کی تاریخِ وفات کے بارے میں چار مختلف راویوں سے منسوب تین روایتیں درج کی ہیں، جو یہ ہیں: [۱۸]

(۱) حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ۲۹ر صفر (۱۱ھ) بروز بدھ بیمار ہوئے، اور ۱۲ر ربیع الاوّل (۱۱ھ) بروز پیر آپؐ کی وفات ہوئی۔

(۲) حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ۱۲ر ربیع الاوّل (۱۱ھ) بروز پیر ہوئی۔

(۳) محمد بن قیس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ۱۹ر صفر ۱۱ھ بروز بدھ بیمار ہوئے۔

آپؐ تیرہ راتیں بیمار رہے، اور آپؐ کی وفات ۲ر ربیع الاوّل ۱۱ھ بروز پیر ہوئی۔ (یہ واحد روایت ہے جس میں سنہِ وفات کا بھی ذکر ہے)

تاہم ان روایات کو درج کرنے سے بہت پہلے، ابنِ سعد آپؐ کی تاریخِ وفات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کر چکے تھے:

''وھو یموت فتوفی صلی اللّٰہ علیہ صلاۃ یحبھا وبرضاھا، حین زاغت الشمس یوم الاثنین لاثنتی عشرۃ لیلۃ خلت من شھر ربیع الاول'' [۱۹]

ترجمہ: ''۱۲ر ربیع الاول (۱۱ھ) بروز پیر جب آفتاب ڈھل چکا تھا، آپؐ کی وفات ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ آپ پر ایسی رحمت نازل کرے، جس سے آپؐ خوش ہوں اور جسے آپؐ پسند کریں۔''

ابنِ سعد کے مندرجہ بالا فقرے کا موازنہ ان کے استاد واقدی کے فقرے سے کریں، جو یہ تھا:

''فتوفی رسول اللّٰہ حین زاغت الشمس یوم الاثنین لاثنتی عشرہ خلت من ربیع الاول'' [۱۳]

دوسری صدی ہجری (اور تیسری صدی ہجری کے اوائل) کے مندرجہ بالا مختصر جائزے کا نچوڑ یہ ہوا کہ تین بزرگ فقہا یعنی امام جعفر صادقؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے نہ تو آپؐ کے یومِ وفات کا ذکر کیا، اور نہ ہی تاریخِ وفات کا۔ تین بزرگوں یعنی امام مالکؒ، ابنِ اسحاق اور ابنِ ہشام نے صرف یومِ وفات (پیر) کا ذکر کیا۔ پہلی بار واقدی نے، دوسری صدی ہجری میں، آپؐ کے وقتِ وفات، یومِ وفات، تاریخِ وفات اور ماہِ وفات کا ایک ساتھ ذکر کیا، اور واقدی کے کاتب ابنِ سعد نے، جن کی بات واقدی کے مقابلے میں زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہے، یہی بات اپنی تاریخ میں دہرائی۔

یہاں دو نکات کا ذکر ضروری ہے۔ اولاً اگر ابنِ سعد کے مطابق، حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ تینوں نے ۱۲ر ربیع الاوّل (۱۱ھ) کی بطور تاریخِ وفات

روایت کی، تو یہ روایت ابنِ سعد سے پہلے، امام مالکؒ نے مؤطا میں کیوں درج نہیں کی؟ اور ابنِ سعد کے بعد آنے والے محدثین نے بھی جن کا ذکر آگے آرہا ہے، اپنے مجموعہ ہائے حدیث میں کیوں درج نہیں کی؟ ثانیًا جب امام مالکؒ یا امام بخاریؒ نے یہ روایت لکھی کہ آپؐ نے پیر کو وفات پائی، تو اس روایت کو مستند حدیث کا درجہ حاصل ہے، جب کہ واقدی اور ابنِ سعد کی تحریر (تاریخِ وفات: ۱۲/ربیع الاوّل) کی حیثیت ایک تاریخی روایت کی ہے، اور یہ تاریخی روایت نہ ابنِ اسحاق نے لکھی، نہ ابنِ ہشام نے۔

تیسری صدی ہجری:

اب تیسری صدی ہجری آتی ہے۔ رسولِ کریم ﷺ کی وفات ہونے کے بعد تقریبًا دو صدیاں گزر چکی تھیں، اور آپؐ سے منسوب لاکھوں احادیث عالمِ اسلام میں گردش کر رہی تھیں۔ بیشتر احادیث غیر مستند یا گھڑی ہوئی تھیں۔ ستم یہ ہے کہ ایک قول کے مطابق ''مسلمانوں ہی میں نیک دل لوگوں کا ایک طبقہ فضائل کے بارے میں احادیث وضع کرنا نیکی اور عبادت تصور کرتا تھا۔''

امام بخاریؒ جب تقریبًا چھے لاکھ احادیث جمع کرنے کے بعد، ان میں سے صحیح احادیث کا انتخاب صحیح بخاری کے لیے کرنے بیٹھے، تو ایک اندازے کے مطابق ساڑھے سات ہزار احادیث قابلِ اعتماد پائیں، جن میں سے دو تہائی سے زیادہ مکررات کے زمرے میں آتی تھیں۔ مکررات نکال دیں تو صحیح احادیث کی تعداد تقریبًا ڈھائی ہزار رہ جاتی ہے۔ پہلی صدی ہجری میں، جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے احادیث جمع کرنے کی سخت حوصلہ شکنی کی، اور ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے تو اپنے مرض الموت کے دوران میں، اپنا عقیدت اور احتیاط سے جمع کیا ہوا مجموعۂ حدیث حضرت عائشہؓ کے سامنے جلا ڈالا،[۲۰] تو ان کے پیشِ نظر شاید یہی خطرہ ہو، جو دوسری صدی ہجری میں اتنے خوفناک طریقے سے ظاہر ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود تیسری صدی ہجری کے اولین نصف حصے تک تدوینِ حدیث کا کام جاری رہا، جس کا

ثبوت ''مُسندِ ابن حنبل'' ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ ۱۶۴ھ (۷۸۰ء) میں بغداد میں پیدا ہوئے اور ۷۵ سال کی عمر میں، ۲۴۱ھ (۸۵۵ء) میں بغداد میں ہی انتقال کر گئے۔ ان کے مجموعۂ حدیث ''مسند ابن حنبل'' میں تقریبًا ۳۰ ہزار احادیث ہیں، جن میں جا بجا مکررات ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں احادیث کو مضامین کے اعتبار سے ترتیب دینے کی بجائے، ''سب سے پہلے راوی'' کے عنوان کے تحت ترتیب دیا۔ اس طرح ایک ہی مضمون کی کئی احادیث جن کی روایت مختلف صحابہ سے ہے، پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی (جلد ۲) کے مطابق، ''مسند (امام حنبلؒ) کے متعلق اب غالب رائے یہ ہے کہ اس میں ''صحیح'' احادیث کے ساتھ ساتھ..... ''غریب'' احادیث بھی موجود ہیں۔''[۲۱]

واضح رہے کہ تیسری صدی ہجری میں، جب وہ چھے مجموعہ ہائے حدیث مرتب ہوئے، جنھیں ''صِحاحِ سِتّہ'' یعنی ''چھے سب سے صحیح مجموعہ ہائے حدیث'' کہا جاتا ہے، تو ''چھے'' کی تعداد بڑھا کر نہ تو اس میں ساتویں ''سب سے صحیح مجموعۂ حدیث'' کے طور پر ''مؤطا امام مالک'' کو شامل کیا گیا جو دوسری صدی ہجری میں مدون ہو چکی تھی، اور نہ ہی آٹھویں ''سب سے صحیح مجموعۂ حدیث'' کے طور پر ''مسند ابن حنبل'' کو شامل کیا گیا، جو تیسری صدی ہجری میں ہی ''صحاحِ سِتہ'' سے پہلے شائع ہو چکی تھی۔ خود ''صحاح ستہ'' میں شامل ''سنن ابنِ ماجہ'' جو ان چھے ''سب سے صحیح'' مجموعہ ہائے حدیث میں سے ایک ہے، اس کی ۴۳۴۱ حدیثوں میں سے ۶۱۳ حدیثیں (یعنی ۱۴ فی صد) کم زور قرار دی گئی ہیں، اور ۹۹ حدیثیں (یعنی ۲ فی صد) ناقابلِ اعتبار گردانی گئی ہیں۔[۲۲]

تیسری صدی ہجری میں، محدثین کا اصل کام حدیث کی ''تدوین'' نہیں بلکہ ''صحیح'' احادیث کا ''تعین'' تھا۔ ''صحاح'' کا لفظ اسی وجہ سے سامنے آیا، جو آج تک بدستور رائج ہے۔ ''صحاح ستہ'' کے یہ چھے مرتبین صرف بیس سال کے مختصر دورانیے میں یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے۔ کسی کی جائے پیدایش مدینہ، مکہ، بغداد، بصرہ یا قاہرہ نہ تھی جو اس وقت عالمِ اسلام کے

سب سے بڑے علمی مراکز تھے۔ ان میں سے ایک افغانستان، دو ایران اور تین ترکستان میں پیدا ہوئے۔ ترکستان آج کئی ملکوں میں بٹ چکا ہے۔ ''صحاح ستہ'' اور ان کے مرتبین کے کوائف یہ ہیں:

نمبر شمار	نام/عرف	مرتب کا معروف نام	جائے پیدایش	ملک	سالِ پیدایش	سالِ وفات	عمر
۱۔	صحیح بخاری	امام بخاری	بخارا	اُزبکستان	۱۹۴ھ (۸۱۰ء)	۲۵۶ھ (۸۷۰ء)	۶۰ سال
۲۔	صحیح مسلم	امام مسلم	نیشاپور	ایران	۲۰۴ھ (۸۲۰ء)	۲۶۱ھ (۸۷۵ء)	۵۵ سال
۳۔	سُنَنِ ابوداؤد	امام ابوداؤد	سجستان	افغانستان	۲۰۲ھ (۸۱۷ء)	۲۷۵ھ (۸۸۹ء)	۷۲ سال
۴۔	جامعِ ترمذی	امام محمد بن عیسیٰ ترمذی	ترمذ	اُزبکستان	۲۰۹ھ (۸۲۴ء)	۲۷۹ھ (۸۹۲ء)	۶۸ سال
۵۔	سُنَنِ نَسائی	امام احمد بن علی نسائی	نَسا	ترکمانستان	۲۱۵ھ (۸۳۰ء)	۳۰۳ھ (۹۱۵ء)	۸۵ سال
۶۔	سُنَنِ ابنِ ماجہ	امام ابنِ ماجہ	قزوین	ایران	۲۰۹ھ (۸۲۴ء)	۲۷۳ھ (۸۸۷ء)	۶۳ سال

(نوٹ: اکثر کتابوں میں ''نَسا'' کو ایران میں، اور بعض کتابوں میں ''ترمذ'' کو بھی ایران میں بتایا گیا ہے، جو درست نہیں)

صحاح ستہ میں صحیح بخاری ہر اعتبار سے سرِفہرست ہے۔ اسے ''اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب'' کا لقب دیا گیا ہے، جو اس سے پہلے امام شافعیؒ مؤطا کے بارے میں کہہ چکے تھے۔ امام بخاریؒ رسول کریم ﷺ کی وفات کے ۱۸۳ سال بعد پیدا ہوئے۔ اس وقت اموی دور کو بھی ختم ہوئے ۶۰ سال گزر چکے تھے۔ عباسی سلسلے کا چھٹا خلیفہ امین، جو ہارون الرشید کا بیٹا تھا، خلیفہ تھا۔ جب امام بخاریؒ کا انتقال ہوا تو عباسی خاندان کا پندرھواں خلیفہ معتمد تختِ خلافت

پر بیٹھا تھا۔ صحیح بخاری سمیت، صحاح ستہ میں کہیں رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات نظر نہیں آتی۔ ''بخاری'' میں حضرت اَنَسؓ بن مالک کی روایت سے آپؐ کے وقتِ وفات اور یومِ وفات کا ذکر ملتا ہے۔ مؤطا میں صرف یومِ وفات کا ذکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری میں، امام بخاریؒ کو وقتِ وفات کے بارے میں جو روایت پہنچی، وہ دوسری صدی ہجری میں امام مالکؒ کو کیوں نہیں پہنچی، جب کہ مؤطا اور صحیح بخاری دونوں اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتابیں مانی گئی ہیں۔ یہی وہ سوال ہے جو پچھلے صفحات میں بار بار اٹھایا گیا ہے۔ مزید برآں ایک سوال یہ بھی ہے کہ مؤطا کو ''صحاح ستہ'' میں کیوں شامل نہیں کیا گیا؟

تیسری صدی ہجری کا ذکر، مشہور مورخ ابوجعفر محمد بن جریر طبری پر ختم کرتے ہیں، جنھوں نے صحاح ستہ کے سب مرتبین کے بعد، ۳۱۰ھ (۹۲۳ء) میں وفات پائی۔ ان کا سنِ پیدائش ۲۲۵ھ (۸۳۹ء) ہے۔ طبری نے کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک تاریخ لکھی جس کا نام ''تاریخ الرسل والملوک'' ہے۔ یہ ایک جامع تاریخ اور اسلامی تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے الفاظ میں، اس کا ایک اچھوتا وصف یہ ہے کہ ''طبری نے اپنی فراہم کردہ معلومات کو تاریخی واقعات کے مسلسل بیان کی شکل میں مرتب نہیں کیا، بلکہ یہ دیکھا کہ جو مختلف بیانات بھی مل جائیں، خواہ وہ باہم متناقص ہی کیوں نہ ہوں، انھیں اسی شکل میں، جس میں وہ ان تک پہنچے تھے، لکھ دیا جائے، چنانچہ اسی لیے وہ ان روایات کی صحت کی کوئی ذمے داری لینے سے منکر ہیں، جو انھوں نے جمع کر دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بے لوث اور غیر مرتب مجموعۂ روایات کی تکرار ہی میں موجودہ زمانے کی تاریخی تحقیق و جستجو کے سلسلے میں اس تصنیف کی اصل قدر و قیمت مضمر ہے، بالخصوص اس وقت جب اسلام کے ابتدائی زمانے کے واقعات کو ازسرِنو مرتب کرنے کا سوال درپیش ہو۔'' [۲۳]

رسول کریم ﷺ کی وفات کی تاریخ کی تاریخی تحقیق و جستجو کے لیے ہمیں اسلام کے بالکل ابتدائی زمانے کے صرف دو مہینوں یعنی ذی الحج ۱۰ھ، اور ربیع الاوّل ۱۱ھ کی تاریخوں کو ازسرِنو مرتب کرنے کا سوال درپیش ہے۔

اس مقصد کے لیے دیکھتے ہیں کہ تاریخِ طبری میں ربیع الاول ۱۱ھ کے بارے میں کیا درج ہے؟ تاریخِ طبری سے چار متعلقہ اقتباسات یہ ہیں:

(۱) ابوجعفر (مراد ابوجعفر محمد بن جریر طبری ہیں) کا قول ہے کہ علمائے تاریخ کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ربیع الاوّل میں پیر کو ہوئی، مگر.....اس ماہ کے کس پیر میں ہوئی، اس میں.....اختلاف ہے.....بعض اربابِ سیر نے فقہائے حجاز کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ربیع الاوّل کی دوسری تاریخ، پیر کے روز، دوپہر سے قبل، رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی۔[۲۴]

(نوٹ: طبری نے نہ اربابِ سیر کے نام لکھے، نہ فقہائے حجاز کے، یاد رہے کہ ۲/ربیع الاوّل کے بارے میں ابنِ سعد نے صرف ایک راوی محمد بن قیس کا نام لکھا تھا، جو گزشتہ صفحات میں درج ہے۔ یہ نام نہ کسی سیرت نگار کا ہے، نہ فقیہ کا)

(۲) واقدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ۱۲/ربیع الاوّل پیر کے دن وفات پائی۔[۲۵]

(۳) عبداللہ بن ابی بکر.....اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ۱۲/ ربیع الاوّل پیر کے دن وفات پائی۔[۲۶]

(۴) حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ.....۱۲/ربیع الاوّل ٹھیک اس روز جب آپؐ مدینے میں ہجرت کر کے آئے تھے، آپؐ نے وفات پائی۔[۲۷]

طبقاتِ ابن سعد کی تین روایات کی طرح، طبری کی تاریخ کے چار مندرجہ بالا اقتباسات میں بھی، آپؐ کی تاریخِ وفات کے طور پر، صرف دو تاریخوں یعنی ۲/ربیع الاوّل اور ۱۲/ربیع الاوّل کا ذکر ہے، لیکن اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ آپؐ کا انتقال ماہ ربیع الاوّل (۱۱ھ) میں ہوا، اور پیر کے روز ہوا، چنانچہ سب سے پہلے یہ تحقیق وجستجو کرنی ہوگی کہ ربیع الاوّل ۱۱ھ میں پیر کا دن کتنی بار آیا؟ اور کس کس تاریخ کو آیا؟

اس مقصد کے لیے ہمیں کوئی مستند تقویم دیکھنی ہوگی۔ ابوالنصر محمد خالدی کی مرتب کردہ ''ہجری عیسوی تقویم''[۲۸]، جسے حوالے کی کتاب کے طور پر اکثر استعمال کیا جاتا ہے،

کے مطابق ماہ ربیع الاوّل میں پیر کا روز چار بار آیا، اور اس دن قمری اور عیسوی مہینوں (اور عیسوی سنہ) کی تاریخیں یہ نکلتی ہیں:

(۱) پہلا پیر = ۶/ربیع الاوّل ۱۱ھ = یکم جون ۶۳۲ء

(۲) دوسرا پیر = ۱۳/ربیع الاوّل ۱۱ھ = ۸ جون ۶۳۲ء

(۳) تیسرا پیر = ۲۰/ربیع الاوّل ۱۱ھ = ۱۵/جون ۶۳۲ء

(۴) چوتھا پیر = ۲۷/ربیع الاوّل ۱۱ھ = ۲۲/جون ۶۳۲ء

ابوالنصر محمد خالدی کی تقویم میں، قمری مہینوں کے دنوں کی میکانکی سی ترتیب یوں رکھی گئی ہے کہ یکم سنہ ہجری سے ۱۵۰۰ سنہ ہجری تک کے پورے پندرہ سو برسوں میں، ماہِ محرم کے دنوں کی تعداد ہمیشہ ۳۰، اور اس کے اگلے ماہ صفر کے دنوں کی تعداد ہمیشہ ۲۹ رکھی گئی ہے اور صفر کے بعد ماہِ ذی قعدہ تک کے نو مہینوں میں، ۳۰ دن اور ۲۹ دن کی یہ ترتیب ہر متبادل مہینے میں جاری رہتی ہے۔ اس طرح پندرہ سو برس تک ماہِ رمضان ہمیشہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے، کبھی ۲۹ دن کا نہیں۔ آخری مہینے ذی الحجہ میں دنوں کی تعداد اگر ایک سال ۲۹ تو اس کے اگلے سال ۳۰ شمار کی گئی ہے۔ مثلاً ایک سنہ ہجری میں ماہِ ذی الحج کے دنوں کی تعداد ۲۹، اور دوسنہ ہجری میں دنوں کی تعداد تیس دکھائی گئی ہے۔ یہ خود ساختہ ترتیب بھی ہر متبادل ہجری سال میں ۱۵۰۰ھ تک اسی طرح قائم رکھی گئی ہے۔

قمری تاریخوں کا حساب لگانے کے لیے یہ فارمولا آسان تو ضرور ہے لیکن حقیقت پر مبنی نہیں۔ یہ کوئی سائنسی فارمولا بھی نہیں۔ قمری مہینوں کے دن ابوالنصر محمد خالدی کی تقویم کے مطابق نہیں چلتے۔ نہ محرم کا مہینا ہمیشہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے، نہ صفر کا مہینا سدا/ ۲۹ روز کا اور نہ رمضان ہمیشہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ بعض اوقات دو، دو مہینے لگاتار ۲۹، دن یا ۳۰، ۳۰ دن کے بھی ہوتے ہیں، بلکہ بات اس سے بڑھ کر ہے۔

فروری ۱۹۶۹ء میں، بیسویں صدی کے مشہور عالم اور اسلامی مورخ ڈاکٹر حمیداللہ کا ایک مضمون[۲۹] لندن کے ماہوار انگریزی جریدے ''اسلامک ریویو'' میں شائع ہوا۔ انھوں

نے لکھا کہ مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض اوقات لگاتار تین ماہ تک قمری مہینے ۲۹، ۲۹ دن کے ہوتے ہیں۔[۳۰] ثبوت کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ پاکستانی کی سرکاری رویتِ ہلال کمیٹی کے مطابق (۲۰۱۲ء میں) ذی قعد اور ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ اور محرم ۱۴۳۴ھ کے تینوں مہینے ۲۹، ۲۹ دن کے ہوئے۔ اس سے حالیہ شہادت کیا ہوسکتی ہے؟

انھوں نے مزید لکھا کہ ماہرینِ فلکیات کے مطابق متواتر چار ماہ تک قمری مہینے ۳۰، ۳۰ دن کے بھی ہوئے ہیں۔[۳۱] اس کے ثبوت کے لیے بھی دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء میں، پاکستان کی سرکاری رویتِ ہلال کمیٹی کے مطابق، چار متواتر قمری مہینے یعنی صفر، ربیع الاوّل، ربیع الثانی اور جمادی الاول ۳۰، ۳۰ دن کے ہوئے۔ اس آسمانی حقیقت کو زمینی حقیقت تسلیم کرنے کے بعد اس کا تعین کس طرح ہوگا کہ چودہ سو سال پہلے، ایک مخصوص مہینے میں کسی قمری مہینے کی کس تاریخ کو کیا دن تھا؟ اور کس ماہ میں کتنے دن تھے؟

ہجری اور عیسوی سنین کی تاریخوں میں مطابقت پیدا کرنے والی کوئی معیاری تقویم یہ تو قطعی طور پر بتاسکتی ہے کہ ''عیسوی'' تقویم کے مطابق، کسی سال کے کسی ماہ کی کسی تاریخ کو کیا دن ہوگا، لیکن تاحال دنیا کی کوئی تقویم کسی دن کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں بتاسکتی کہ اس روز قمری مہینے کی کیا تاریخ تھی۔ کسی موجودہ تقویم کے مطابق نکالی ہوئی قمری تاریخ میں، ایک دو دن آگے پیچھے ہوجانا معمولی بات ہے اور تین چار دن آگے پیچھے ہوجانا بھی غیر معمولی بات نہیں۔

اگر چودہ صدیاں گزرنے کے بعد، ہمارے پاس تقویم کے علاوہ یہ معلوم کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ ہوتا کہ ربیع الاوّل ۱۱ھ کے دوسرے پیر کو ربیع الاوّل ۱۱ھ کی کیا تاریخ تھی (جو تقویم کے مطابق ۱۳/ربیع الاول نکلتی ہے) تو پھر یہ کہنے کا جواز بنتا تھا کہ جب پہلی صدی ہجری میں بھی روایۃً ۱۲/ربیع الاوّل (۱۱ھ) کا بطور تاریخِ وفات ذکر ہوا، جو طبقاتِ ابن سعد اور تاریخِ طبری میں درج ہے، اور دوسری صدی ہجری میں مشہور مورخ واقدی نے اسے مغازی میں باضابطہ تحریر بھی کردیا، اور ابنِ سعد نے اسے دہرا بھی دیا، جو طبقاتِ ابن سعد میں موجود ہے، تو ۱۲/ربیع الاول (۱۱ھ) کا بطور تاریخِ وفات مضبوط جواز بنتا ہے۔

اس صورت میں واقدی کی تحریر پر یہ اعتراض تو ہوسکتا تھا کہ یہ تاریخ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بہت بعد کیوں معلوم، اور بیان، ہوئی، اور نیز یہ کہ دوسروں نے اس سے پہلے کیوں اپنی مستند کتابوں میں بیان نہیں کی، لیکن بارہ ربیع الاوّل (۱۱ھ) کے مقابلے میں تاریخِ وفات کے طور پر کوئی اور تاریخِ وفات مضبوط استدلال کے ساتھ، پیش نہیں کی جاسکتی تھی، کیوں کہ کوئی ایسی تاریخ ضبطِ تحریر میں نہیں آئی تھی۔

واقدی کا انتقال ۲۰۷ھ/۸۲۲ء میں ہوا۔ اس کے تقریباً تین صدی بعد، اور آج سے نو صدی پہلے، سپین میں پیدا ہونے والے مشہور اسلامی مورخ عبدالرحمان سہیلی اندلسی (۵۰۸ھ/ ۵۸۱ھ) (بمطابق ۱۱۱۴ء۔۱۱۸۵ء) نے واقدی کی روایت کی رَد میں ایک تاریخی شہادت مدلل انداز میں بھی پیش کی، جس پر بات کرنے کے لیے ہم درمیان کی صدیاں چھوڑ کر، چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی پر آتے ہیں جب برِصغیر پاک و ہند کے دو مشہور سیرت نگاروں اور مورخین یعنی سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر حمیداللہ نے سہیلی کا نام لے کر سہیلی کے ''موقف'' کی تائید کی، جس کی تردید یا جس سے مدلل انداز میں اختلافِ رائے، ہماری نظر سے نہیں گزری۔ یہ ''موقف'' کیا ہے؟ اختلافِ رائے کا یہ مدلل انداز کیا ہوسکتا ہے؟ یہ ذیل میں درج ہے۔

ڈاکٹر حمیداللہ نے، فروری ۱۹۶۹ء کے اپنے مضمون[۲۹] میں لکھا ہے کہ آٹھ صدی پہلے، عظیم مورخ سہیلی نے زور دے کر لکھا ہے کہ اس بارے میں ''عملی طور پر اتفاق'' ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حجِ وداع کے موقع پر، ۱۰ھ میں، میدانِ عرفات میں جو دن گزارا، وہ جمعے کا روز تھا اور نو ذی الحج تھا۔ ڈاکٹر حمیداللہ لکھتے ہیں:

> ''اس صورت میں، ذی الحج ۱۰ھ، محرم ۱۱ھ اور صفر ۱۱ھ میں سے کسی بھی ماہ میں خواہ دنوں کی تعداد ۲۹ ہو یا ۳۰، اور دنوں کی اس تعداد کو خواہ کسی طرح ترتیب دیا جائے، پیر کے روز کسی طرح ۱۲/ربیع الاوّل نہیں ہوسکتا۔''

اکیسویں صدی عیسوی کے قاری کے لیے یہ بات واضح کرنے کے لیے، راقمِ

حروف نے ایک تاریخ وار ضمیمہ منسلک کر دیا ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر تینوں مہینے ۳۰، ۳۰ دن کے ہوں تو بارہ ربیع الاوّل کو اتوار ہوگا۔ اگر کوئی سے دو مہینے ۳۰ دن کے ہوں، اور ایک مہینا ۲۹ دن کا ہو تو بارہ ربیع الاوّل مزید ایک دن پہلے آئے گا اور اس روز ہفتے کا دن ہوگا۔ اگر کوئی سا ایک مہینا ۳۰ دن کا ہو اور دو مہینے ۲۹ دن کے ہوں تو بارہ ربیع الاوّل مزید ایک دن پہلے جمعے کو ہوگا۔ اگر تینوں مہینے متواتر ۲۹ دن کے ہوں تو بارہ ربیع الاوّل کو جمعرات ہوگی۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر نو ذی الحج ۱۰ھ کو جمعہ تھا تو پیر، نیز منگل اور بدھ کے روز کسی طرح ۱۲ ربیع الاوّل (۱۱ھ) نہیں ہو سکتا۔ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ جمعرات سے اتوار تک کسی روز ہوگا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے محولہ بالا مضمون میں مزید لکھا ہے کہ دو صورتوں میں سے صرف ایک صورت ممکن ہے، یا ۹ ذی الحج ۱۰ھ کو جمعہ نہیں تھا، اور یا ۱۲ ربیع الاوّل کو پیر نہیں تھا۔ (آج تک سارا زور مؤخر الذکر متبادل پر رہا ہے)

یہی بات سید سلیمان ندوی نے سیرت النبیؐ (جلد دوئم) کے زیریں حاشیئے میں ان الفاظ میں لکھی ہے:

> ''سب سے پہلے امام مذکور (سہیلی) ہی نے درایتہً اس نکتہ کو دریافت کیا تھا کہ بارہ ربیع الاوّل (۱۱ھ) کی روایت قطعًا ناقابلِ تسلیم ہے کیوں کہ دو باتیں یقینی طور پر ثابت ہیں۔ روزِ وفات دوشنبہ (پیر) کا دن تھا..... اس سے تقریبًا تین مہینے پہلے ذی الحجہ ۱۰ھ کی نویں تاریخ کو جمعہ کا دن تھا۔ (صحاح قصہ حجۃ الوداع، صحیح بخاری تفسیر ''**الیوم اکملت لکم دینکم**''۔[۳۲]

یہ لکھنے کے بعد، سید سلیمان ندوی نے اپنی تحریر میں جو بعض مقامات پر گنجلک، اور ایک جگہ درست نہیں ہے، اور جسے اکیسویں صدی عیسوی کے قاری کو خود پڑھنا، سمجھنا اور اس پر فیصلہ کرنا ہے، اور اس کے لیے وہ ہماری مندرجہ بالا رائے پر انحصار نہ کرے، اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ''وفاتِ نبوی کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک یکم ربیع الاوّل (۱۱ھ) ہے۔''[۳۳]

اس کے برعکس، ڈاکٹر حمید اللہ نے فروری ۱۹۶۹ء کے اپنے مقالے[۲۹] میں، جو علامہ شبلی کے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کے بعد شائع شدہ سیرت النبیؐ کی جلد اول کی اشاعتِ اول (۱۹۱۸ء) کے تقریبًا نصف صدی بعد شائع ہوا، یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ کا سرسری سا ذکر کرنے کے بعد یکم ربیع الاوّل (۱۱ھ) کو یکسر نظر انداز کر کے، ۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ کی بطور تاریخِ وفات روایت کو معتبر ترین قرار دیا ہے۔ اور یہی بات صراحتًا اپنی انگریزی کتاب ''محمد رسول اللہ'' میں بھی لکھی۔[۳۴]

علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور دوسرے سیرت نگار اپنی رائے کی تائید میں قدیم راویوں کی روایات کا حوالہ دیتے رہے ہیں، جب کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے ۲ ربیع الاوّل (۱۱ھ) کی تائید میں کسی راوی کا نام دینے کی بجائے، اپنا وہ نوترتیب کیلنڈر پیش کیا ہے، جس کی رو سے آپؐ کی تاریخِ وفات صرف ۲ ربیع الاوّل (۱۱ھ) ہی ہو سکتی ہے، تاہم انھوں نے خود اپنے اس کیلنڈر کو عارضی قرار دیا اور آخری فیصلہ مستقبل کے ماہرِ فلکیات پر چھوڑا ہے۔

جب بھی ۹ ذی الحج ۱۰ھ کو جمعے کا روز ہونے کی بات ہوتی ہے تو ذکر نہ یکم ربیع الاوّل (۱۱ھ) کا ہوتا ہے، نہ ۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ کا، بلکہ اس بات اس سے شروع اور اس پر ختم ہوتی ہے کہ آپؐ کا یومِ وفات ۱۲ ربیع الاوّل (۱۱ھ) نہیں ہو سکتا۔ (اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت کتنی مشہور تھی) اکیسویں صدی عیسوی میں اس پر ایک اور زاویے سے نظر ڈالتے ہیں۔ حقائق وہی ہیں جو ضمیمے میں تاریخ وار درج ہیں، صرف دیکھنے کا زاویہ مختلف ہے۔

چونکہ رسول کریم ﷺ کی وفات ربیع الاوّل (۱۱ھ) میں پیر کے روز ہوئی، اس لیے آغاز دو باتیں معلوم کرنے سے ہونا چاہیے:

(۱) ربیع الاوّل (۱۱ھ) میں پیر کا روز ممکنہ طور پر کتنی بار آ سکتا ہے؟ چار بار یا پانچ بار؟

(۲) ہر ممکنہ پیر کے دن ربیع الاوّل ۱۱ھ کی ممکنہ تاریخ کیا ہو سکتی ہے؟

یہ دونوں باتیں ضمیمے پر صرف ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتی ہیں، تاہم قارئین کی سہولت کے لیے ضمیمے میں دی ہوئی یہ قمری تاریخیں (اور ان قمری تاریخوں سے مطابقت رکھنے والی

عیسوی کیلنڈر کی تاریخیں) نیچے درج کی جارہی ہیں۔ابتدا یکم ربیع الاوّل (۱۱ھ) سے کی گئی ہے۔

۱۔ اگر تینوں مہینے (یعنی ذی الحج، محرم اور صفر) ۳۰، ۳۰ دن کے ہوں:

یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ	بدھ	۲۷ر مئی ۶۳۲ء	(ضمیمہ دیکھیں)
۶ر // //	پیر	یکم جون ۶۳۲ء	(//)
۱۳ر // //	//	۸ر // //	(//)
۲۰ر // //	//	۱۵ر // //	(//)
۲۷ر // //	//	۲۲ر // //	(//)

اتفاق دیکھیں کہ مندرجہ بالا حساب ابوالنصر محمد خالدی کی تقویم سے مطابقت رکھتا ہے، حالانکہ ہم نے اپنے مندرجہ بالا حساب میں تینوں قمری مہینوں کے ۳۰، ۳۰ دن شمار کیے ہیں، جب کہ اپنی تقویم میں ابوالنصر محمد خالدی نے، یکم ہجری سے ۱۵۰۰ سنہ ہجری تک، ماہ صفر کو ۲۹ دن کا شمار کیا ہے۔

۲۔ اگر کوئی سے دو مہینا ۳۰، ۳۰ دن کے اور ایک مہینہ ۲۹ دن کا ہو:

یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ	منگل	۲۶ر مئی ۶۳۲ء	(ضمیمہ دیکھیں)
۷ر // //	پیر	یکم جون ۶۳۲ء	(//)
۱۴ر // //	//	۸ر // //	(//)
۲۱ر // //	//	۱۵ر // //	(//)
۲۸ر // //	//	۲۲ر // //	(//)

۳۔ اگر کوئی ایک مہینا ۳۰ دن کا ہو، اور باقی دو مہینا ۲۹، ۲۹ دن کے ہوں:

یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ	پیر	۲۵ر مئی ۶۳۲ء	(ضمیمہ دیکھیں)
۸ر // //	//	یکم جون ۶۳۲ء	(//)
۱۵ر // //	//	۸ر // //	(//)
۲۲ر // //	//	۱۵ر // //	(//)
۲۹ر // //	//	۲۲ر // //	(//)

۴۔ اگر تینوں مہینے ۲۹، ۲۹ دن کے ہوں:

یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ	اتوار	۲۴ر مئی ۶۳۲ء	(ضمیمہ دیکھیں)
۲ر // //	پیر	۲۵ر // //	(//)
۹ر // //	//	یکم جون ۶۳۲ء	(//)
۱۶ر // //	//	۸ر // //	(//)
۲۳ر // //	//	۱۵ر // //	(//)
۳۰ر // //	//	۲۲ر // //	(//)

اس طرح مندرجہ بالا چاروں جدولوں کے مطابق، ماہ ربیع الاوّل ۱۱ھ میں، ''پیر'' کے روز مندرجہ ذیل اٹھارہ تاریخیں ہوسکتی ہیں:

۱۔	یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ	=	۲۵ر	مئی	۶۳۲ء
۲۔	۲ر // //	=	//	//	//
۳۔	۶ر // //	=	یکم	جون	۶۳۲ء
۴۔	۷ر // //	=	//	//	//
۵۔	۸ر // //	=	//	//	//
۶۔	۹ر // //	=	//	//	//
۷۔	۱۳ر // //	=	۸ر	جون	۶۳۲ء

۸۔	۱۴/	//	//	=		//	//
۹۔	۱۵/	//	//	=		//	//
۱۰۔	۱۶/	//	//	=		//	//
۱۱۔	۲۰/	//	//	=	۱۵/	جون	۶۳۲ء
۱۲۔	۲۱/	//	//	=		//	//
۱۳۔	۲۲/	//	//	=		//	//
۱۴۔	۲۳	//	//	=		//	//
۱۵۔	۲۷/	//	//	=	۲۲/	جون	۶۳۲ء
۱۶۔	۲۸/	//	//	=		//	//
۱۷۔	۲۹/	//	//	=		//	//
۱۸۔	۳۰/	//	//	=		//	//

اب سوال یہ ہے کہ ان اٹھارہ امکانی تاریخوں میں (جن میں ۱۲/ربیع الاوّل نہیں آتا)، رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات کون سی ہے؟ اور کس بنیاد پر؟ یہ بنیاد، ''کسی مستند حدیث کی عدم موجودگی میں''، کوئی ''روایت'' ہی ہوسکتی ہے جو کم از کم مندرجہ ذیل چار شرائط پر پوری اترے:

(۱) روایت نقل کرنے والا مؤرخ معتبر ہو۔ (حدیث اور تاریخ کے مابین ثقاہت کا معیار یکساں نہیں۔ ضروری نہیں کہ معتبر مؤرخ مستند محدث بھی ہو)

(۲) روایت کسی مستند تاریخ یا تحریر میں درج ہو۔

(۳) اگر روایات ایک سے زیادہ ہوں اور پہلی دو شرائط پر پوری اترتی ہوں تو قریب العہد راوی یا تحریر کو بعید العہد راوی یا تحریر پر ترجیح دینی چاہیے۔

(۴) اگر مختلف روایات کے پایۂ استناد میں فرق نہ ہو اور کوئی روایت دوسری روایات کے مقابلے میں بہت مشہور اور صدیوں سے مقبول عام چلی آرہی ہو، اور ثقہ علما اور معتبر سیرت

نگاروں نے بھی اسے صدیوں سے قبول کیا ہو، تو اسے دوسری روایات پر ترجیح ملنی چاہیے لیکن اس سے پہلے اس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے کہ یہ روایت کب سے رائج ہے اور معروضی بنیاد پر اس کے صحیح ہونے کے امکانات کیا ہیں؟ نیز یہ کہ ثقہ علما اور سیرت نگاروں کی قبولیت صرف ان کی، یا ان سے منسوب زبانی روایات پر مبنی ہے، یا ان کی مستند تحریروں میں بھی موجود ہے۔

مندرجہ بالا چار رہنما اصولوں کو سامنے رکھ کر، یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ سے آغاز کرتے ہیں۔

یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ:

یہ امکانی طور پر پیر کا روز تھا، تاہم جب تیسری صدی ہجری کے آغاز میں ابنِ سعد (وفات ۲۳۰ھ) اور اسی صدی کے آخر میں طبری (وفات ۳۱۰ھ) نے اپنی اپنی مشہورِ زمانہ تاریخ لکھی تو ان میں کسی راوی کے حوالے سے یکم ربیع الاوّل (۱۱ھ) کی بطور تاریخِ وفات کسی روایت کا ذکر نہیں کیا۔ چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی میں ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے محولہ بالا[۲۹] مضمون (فروری ۱۹۶۹ء) میں یکم ربیع الاول ۱۱ھ کا انتہائی سرسری ذکر کرنے کے بعد اسے نظر انداز کر دیا، حالاں کہ ان کے سامنے سیرت النبیؐ (جلد دوئم) میں سید سلیمان ندوی کا لکھا ہوا مفصل زیریں حاشیہ موجود تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔

چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی میں اس تاریخ کے سب سے بڑے مؤیّد علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی ہیں۔ علامہ شبلی کے بارے میں اس بات کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ۱۸۹۸ء میں جب انھوں نے حضرت عمرؓ کی سوانح حیات ''الفاروق'' مکمل کی، تو اس میں رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات ۱۲/ربیع الاوّل[۳۵] ہی لکھی، جواب تک یہی کتابت ہورہی ہے۔ لیکن اپنی وفات (۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء) سے پہلے، سیرت النبیؐ کی پہلی دو جلدوں کا مسودہ مرتب کرتے وقت ان کی سوچ تبدیل ہوگئی۔ جب ۱۹۲۰ء میں سیرت النبیؐ (جلد دوئم) پہلی بار شائع ہوئی تو اس میں شبلی نے لکھا کہ آپؐ کے مرض الموت کی ابتدا ۱۸/ یا ۱۹/صفر ۱۱ھ سے ہوئی، اور جہاں آپؐ کی تدفین کا ذکر آتا ہے، وہاں شبلی نے لکھا کہ ''تجہیز و تکفین کا کام دوسرے

دن سہ شنبہ (منگل) دو[۳۶] ربیع الاوّل کو شروع ہوا۔ پاکستان سے شائع ہونے والے بعض اڈیشنوں میں ''دو'' ربیع الاوّل کو غلطی سے ''تین'' ربیع الاوّل چھاپ دیا گیا ہے۔[۳۷]

یکم ربیع الاوّل کی تائید میں، اصل کام سید سلیمان ندوی کا ہے، جنھوں نے اس کے بارے میں سیرت النبیؐ (جلد دوئم) میں ایک تفصیلی زیریں حاشیہ لکھا[۳۲] جس کے بارے میں ہم قارئین کو خود پڑھنے کی تجویز پہلے ہی دے چکے ہیں۔

سید سلیمان ندوی نے لکھا کہ اربابِ سیر کے ہاں تین روایتیں ہیں: یکم ربیع الاوّل، دوئم ربیع الاوّل اور بارہ ربیع الاوّل۔ یہ بتا کر وہ لکھتے ہیں کہ بارہ ربیع الاوّل کی روایت تو قطعًا ناقابلِ تسلیم ہے۔[۳۸] رہی دوئم ربیع الاوّل تو اس کی روایت ہشام بن محمد بن سائب کلبی اور ابومخنف کے واسطے سے ہے، اور گو اس روایت کو اکثر قدیم مؤرخوں (مثلاً یعقوبی اور مسعودی وغیرہ) نے قبول کیا ہے لیکن محدثین کے نزدیک یہ دروغ گو اور غیر معتبر ہیں،[۳۹] لیکن یکم ربیع الاوّل کی روایت ثقہ ترین اربابِ سیر موسیٰ بن عقبہ اور مشہور محدث امام لیث مصری سے مروی ہے۔ امام سہیلی نے روض الانف میں اسی روایت کو اقرب الی الحق لکھا ہے۔[۴۰]

۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ کی روایت کو مزید رد کرتے ہوئے، سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ''دوئم ربیع الاوّل کو حساب سے اس وقت دوشنبہ (پیر) پڑ سکتا ہے، جب تینوں مہینے انتیس کے ہوں، اور اسے نہ جانے کس حساب اور اصول کی بنیاد پر مولانا سید سلیمان ندوی نے ''خلافِ اصول''[۴۱] قرار دیا ہے، جب کہ (۲۰۱۲ء میں) ذی قعد اور ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ اور محرم ۱۴۳۴ھ کے تین متواتر مہینے ۲۹، ۲۹ دن کے ہوئے اور اسی طرح (۲۰۱۳ء میں) صفر، ربیع الاوّل اور ربیع الثّانی ۱۴۳۴ھ کے تین متواتر مہینے ۳۰، ۳۰ دن کے ہوئے۔ گویا یکے بعد دیگرے آنے والے چھ مہینوں میں سے پہلے تین مہینے لگاتار ۲۹، ۲۹ دن کے، اور بقیہ تین مہینے تواتر سے ۳۰، ۳۰ دن کے ہوئے۔ ۲۰۱۳ء/۱۴۳۴ھ میں جمادی الثانی، رجب اور شعبان کے تینوں متواتر مہینے بھی ۳۰، ۳۰ دن کے ہی ہوئے۔ یہ اس تواتر کی تازہ ترین مثال ہے۔

یہ کہہ کر وہ لکھتے ہیں کہ جب دو پہلی صورتیں صحیح نہیں ہیں تو اب صرف تیسری صورت رہ

گئی ہے جو کثیر الوقوع ہے، یعنی یہ کہ دو مہینے انتیس کے اور ایک مہینا تیس کا لیا جائے۔ اس حالت میں یکم ربیع الاوّل کو دوشنبہ (پیر) کا روز واقع ہوگا اور یہی ثقہ اشخاص کی روایت ہے۔[۴۲] سید سلیمان ندوی کے اس بیان میں جو بدیہی غلطی ہے وہ ضمیمے سے واضح ہے اور اس کا تعلق تینوں مہینوں کے ۲۹، ۲۹ دن ہونے سے ہے۔

۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ:

۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ کی بات کا آغاز، ہم تاریخِ طبری کے ان الفاظ سے کرتے ہیں:

''بعض اربابِ سیر نے فقہائے حجاز کے حوالے سے یہ بات بیان کی ہے کہ ۲/ربیع الاوّل بروز پیر دوپہر سے قبل رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی۔''[۴۳]

اس سے معلوم ہوا کہ دوسری صدی ہجری کے اختتام، یا تیسری صدی ہجری کے آغاز پر، ۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ کی روایت زبانوں پر تھی اور یہ بعض اربابِ سیر نے فقہائے حجاز کے حوالے سے بیان کر رکھی تھی۔ یہ فقہائے حجاز کون تھے؟ تاریخِ طبری اس بارے میں خاموش ہے۔ یہ اربابِ سیر کون تھے؟ تاریخِ طبری نے ان کے نام بھی نہیں دیئے لیکن ظاہر ہے کہ یہ اربابِ سیر ابنِ اسحاق اور ابنِ ہشام تو نہیں تھے کیوں کہ یہ دونوں رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات کا ذکر نہیں کرتے۔ کہیں یہ اربابِ سیر یا فقہائے حجاز ابومخنف اور ہشام بن محمد بن سائب کلبی تو نہیں تھے؟ جن کے اوصاف ہم پچھلے صفحات میں سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں پڑھ چکے ہیں، یا یہ حضرات وہ تو نہیں جن کا ذکر سید سلیمان ندوی نے ہی اپنی اس تحریر میں یوں کیا ہے:

''یہ روایت (۲/ربیع الاوّل) واقدی سے بھی ابنِ سعد وطبری نے نقل کی ہے (جز روفات) لیکن واقدی کی مشہور ترین روایت جس کو اس نے متعدد اشخاص سے نقل کیا ہے وہ بارہ ربیع الاوّل کی ہے۔ البتہ بیہقی نے دلائل میں مسند صحیح سلیمان التیمی سے دوئم ربیع الاوّل کی روایت نقل کی ہے۔''[۴۴]

سیرت النبیؐ کی جلد دوئم، سید سلیمان ندوی کے مندرجہ بالا خیالات کے ساتھ پہلی بار

۱۹۲۰ء کے وسط میں شائع ہوئی، اور اپنی سات جلدوں کے ساتھ پورے برِصغیر پاک و ہند میں مقبول اور مشہور ہوگئی۔ اگلی نصف صدی میں اس کے کئی اڈیشن نکلے۔ جلد دوئم کی اشاعت کے تقریباً نصف صدی بعد، ۱۹۶۹ء میں جب اسلامک ریویو لندن میں ڈاکٹر حمیداللہ کا محولہ بالا مقالہ[۴۴] شائع ہوا تو انھوں نے سید سلیمان ندوی کی یہ تحریر ضرور پڑھی ہوگی۔ سید سلیمان ندوی نے تین قمری مہینوں کے متواتر ۲۹، ۲۹ دن ہونے کو ''خلافِ اصول''[۴۵] کہا تھا جب کہ ڈاکٹر حمیداللہ نے اسے ''عام مشاہدے''[۴۶] کی بات بتایا۔ سید سلیمان ندوی نے دو ربیع الاوّل کو ''غیر معتبر'' رواۃ سے نسبت کی بنا پر مسترد اور یکم ربیع الاوّل کو ''ثقہ اشخاص'' کی روایت پر قبول کیا۔ ڈاکٹر حمیداللہ نے رواۃ کا سہارا لیے بغیر اپنے نوترتیب شدہ کیلنڈر کو اپنی تحقیق کی واحد بنیاد بنایا، جس کی تفصیلات اسلامک ریویو لندن کے فروری ۱۹۶۹ء کے شمارے میں پڑھی جاسکتی ہیں، اور اپنے اس کیلنڈر کی بنیاد پر ۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ کو آپؐ کی تاریخِ وفات کے طور پر ''معتبر ترین'' قرار دیا۔ ڈاکٹر حمیداللہ کے اس کیلنڈر کی اب تک کسی قابلِ اعتماد اور آزاد ذریعے سے تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ اپنے انگریزی مضمون میں[۴۷] خود ڈاکٹر صاحب نے اسے تحقیق طلب اور عارضی قرار دیا اور اس کی تصدیق ماہرینِ فلکیات کی مستقبل میں ہونے والی تحقیقات سے منسلک کی ہے۔[۴۸] یہ رشتہ جوڑنا کتنا صحیح ہے؟ اس پر بعد میں بات ہوگی۔

ڈاکٹر حمیداللہ نے ''نقوش'' لاہور کے رسولؐ نمبر (جلد دوئم) کے اپنے خصوصی مضمون[۴۹] کے علاوہ، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں چھپنے والے اپنے مرکزی مقالہ سیرت[۵۰] اور اپنی انگریزی کتاب ''محمد رسول اللہ''[۵۱] میں بھی ۲/ربیع الاوّل (۱۱ھ) کو ہی آپؐ کی تاریخِ وفات بتایا ہے۔ اس کتاب اور اپنے دونوں اردو مضامین میں انھوں نے اپنی دریافت کی تصدیق ماہرینِ فلکیات کی تحقیق سے منسلک کرنے کا ذکر بھی نہیں کیا، جو وہ اس سے پہلے اپنے انگریزی مضمون میں کر چکے تھے۔

اس طرح جن لاکھوں قارئین نے صرف علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ پڑھی، انھیں یہ یقین ہوگا کہ آپؐ کی وفات یکم ربیع الاوّل کو ہوئی اور جنھوں نے انگریزی

میں ڈاکٹر حمیداللہ کا فروری ۱۹۶۹ء کا مضمون اور/یا ان کی انگریزی کتاب ''محمد رسول اللہ'' پڑھی ہوگی، یا پھر اردو میں ان کے وہ دو طویل مضامین پڑھے ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، وہ یہی سمجھیں گے کہ آپؐ کی وفات دو ربیع الاوّل کو ہوئی۔ بیسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف حصے سے ہم اس دوارہے پر کھڑے ہیں۔ چوں کہ یکم ربیع الاوّل اور دو ربیع الاوّل ۱۱ھ، دونوں تاریخوں میں امکانی طور پر پیر کا روز ہوسکتا ہے، اس لیے دونوں کے صحیح ہونے کے امکانات مساوی ہیں لیکن دونوں میں سے ایک ہی صحیح ہوسکتی ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ دونوں میں سے ایک بھی صحیح نہ ہو کیوں کہ پیر کا روز تو ماہِ ربیع الاوّل کی اٹھارہ ممکنہ تاریخوں میں پڑ رہا ہے۔ صرف یکم اور دو ربیع الاوّل کو نہیں۔

سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر حمیداللہ رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات پر تو اختلاف رائے رکھتے ہیں لیکن ان میں دو باتیں مشترک ہیں:

(۱) دونوں اپنے اپنے موقف کو اتنا درست سمجھتے ہیں کہ وہ صرف ایک تاریخ کے علاوہ (جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں) کسی متبادل تاریخ کو امکانی تاریخِ وفات تک ماننے کو تیار نہیں۔ مثلاً اگرچہ یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ کو پیر کا روز ہونے کا امکان ہے اور ۱۹۶۹ء سے پچاس برس پہلے سید سلیمان ندوی یہ امکان ثابت کر چکے تھے (اور ہمارے ضمیمے سے بھی یہ عیاں ہے) لیکن اپنے فروری ۱۹۶۹ء کے مضمون میں ڈاکٹر حمیداللہ نے اسے قطعاً نظرانداز کر دیا اور صرف ۲/ربیع الاوّل کو آپؐ کی تاریخِ وفات کی معتبر ترین روایت قرار دیا، اور اس موقف پر وہ اپنی انگریزی کتاب اور اپنے دو اردو مقالوں میں بھی قائم رہے۔ انھوں نے اپنی کسی تحریر میں یہ وجہ نہیں بتائی کہ وہ ایک متبادل تاریخ کے طور پر یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ کو کیوں نظرانداز کر رہے ہیں؟ انھوں نے علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کا ذکر تک نہیں کیا، حالاں کہ سیرت النبیؐ اس وقت تک بہت مشہور اور مقبول ہو چکی تھی۔ ادھر سید سلیمان ندوی ۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ کو ''خلافِ اصول'' کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''وفاتِ نبویؐ کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ ہے۔''

(۲) عبدالرحمٰن سہیلی کے آٹھ نو سو سالہ قدیم استدلال کا حوالہ دیتے ہوئے، دونوں کا

موقف ہے کہ ۱۲/ ربیع الاوّل ۱۱ھ رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات نہیں ہوسکتی۔ ان کے اس موقف کو اس تحریر میں نہ صرف پوری شرح وبسط سے پیش کیا گیا ہے، بلکہ اس موقف کی مکمل وضاحت کے لیے، اپنی طرف سے، ایک ضمیمہ بھی منسلک کردیا گیا ہے، جس میں ۹/ ذی الحج ۱۰ھ سے ۳۰/ ربیع الاوّل ۱۱ھ تک، ۹/ ذی الحج ۱۰ھ کو جمعہ قرار دیتے ہوئے، ہر دن کے سامنے اس کی امکانی قمری تاریخ لکھ دی گئی ہے، تاکہ یہ ''موقف'' اس سے زیادہ وضاحت اور قطعیت سے پیش ہوجائے جتنا کہ اسے سید سلیمان ندوی نے سیرت النبیؐ میں پیش کیا تھا۔

اب ہم اس ''موقف'' پر اکیسویں صدی عیسوی کی سوچ سے نظر ڈالتے ہیں اور بات کا آغاز ڈاکٹر حمید اللہ کے فروری ۱۹۶۹ء والے مضمون کے اس فقرے سے کرتے ہیں کہ یا ۹/ ذی الحج ۱۰ھ کو جمعہ نہیں تھا، ورنہ ۱۲/ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو پیر نہیں تھا۔ اب تک بحث صرف اس پر مرتکز رہی کہ ۱۲/ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو پیر نہیں تھا۔ کیا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ۹/ ذی الحج ۱۰ھ کو جمعہ نہیں تھا؟ کیا بقول سید سلیمان ندوی، یہ بات ''یقینی طور پر ثابت'' ہے کہ ۹/ ذی الحج ۱۰ھ کو جمعے کا دن تھا؟[۵۲]

۹/ ذی الحج ۱۰ھ کو جمعہ کا دن ہونے کے ثبوت کے بارے میں، سید سلیمان ندوی نے سیرت النبیؐ (جلد دوئم) کی اپنی تحریر میں دو حوالے دیئے ہیں:

(۱) صحاح قصہ حجۃ الوداع

(۲) صحیح بخاری کی تفسیر "**الیوم اکملت لکم دینکم**"

صحیح بخاری کے باب ''حجۃ الوداع'' میں، اس موضوع سے تعلق رکھنے والی جو دو حدیثیں ہیں، ہم پہلے ان کا انگریزی ترجمہ اور پھر دو اردو تراجم پیش کریں گے تاکہ تقابل اور تصدیق میں قاری کو سہولت رہے۔ انگریزی ترجمہ اسلامی یونیورسٹی مدینہ کے ڈاکٹر محمد محسن خان کا ہے، جو نو جلدوں میں شائع ہوا ہے، اور جس میں عربی متن اور انگریزی ترجمہ آمنے سامنے دیا گیا ہے۔ اس ترجمے کی جلد نمبر ۵ میں، صفحہ ۴۷۸[۵۳] پر محولہ بالا باب ''حجۃ الوداع'' ہے، جس کا نمبر ۷۶ ہے۔ پہلا اردو ترجمہ جس کے مترجم ظہور الباری اعظمی ہیں، مفتی محمد شفیع کے خاندان سے تعلق رکھنے والے ادارے دارالاشاعت، اردو بازار کراچی سے شائع ہوا ہے، جو مکتبہ دارالعلوم

کورنگی کراچی سے بھی دستیاب ہے۔ اس میں بھی ترجمے کے سامنے عربی متن موجود ہے۔ اس ترجمے کی جلد دوئم کے صفحہ ۷۸۳[۵۴] پر باب ''حجۃ الوداع'' ہے، جس کا نمبر ۵۴۵ ہے۔ دوسرا اردو ترجمہ علامہ وحید الزمان کا ہے، جس کی جلد دوئم کے صفحہ ۷۴۰ پر ''باب حجۃ الوداع'' ہے، جس کا نمبر ۵۴۸ ہے۔[۵۵]

دونوں کتابوں کے اس باب میں درج شدہ کسی حدیث میں یہ لکھا ہوا نہیں ملتا کہ ۹/ ذی الحج ۱۰ھ کو (جو حجۃ الوداع تھا) جمعے کا دن تھا۔ اکیسویں صدی عیسوی کے قاری کی سہولت کے لیے، اس بات کو واضح کرنے کے لیے، دو احادیث کے انگریزی اور اردو تراجم سے متعلقہ اقتباسات پیش ہیں۔ پہلی حدیث یومِ عرفات نہیں بلکہ یومِ نحر (قربانی کے دن) کے بارے میں ہے۔ باب ''حجۃ الوداع'' کی دوسری حدیث جو آگے چل کر صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں بھی آتی ہے، سورۃ مائدہ (سورۃ:۵) کی تیسری آیت کے اس حصے سے تعلق رکھتی ہے: "**الیوم اکملت لکم دینکم و انعمت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام ددینا**"

(۱) باب حجۃ الوداع کی پہلی حدیث (**یوم النحر**) کے انگریزی ترجمے سے ''اقتباس''، جلد۵، صفحہ:۴۸۶، حدیث نمبر:۶۸۸

"Then he said, "Which day is today?" We replied, "Allah and His Apostle know better." He kept quiet so long that we thought that he might name it with another name. Then he said, "Isn't it the day of An-Nahr (i.e, Sacrifice)?" We replied, "Yes."

مترجم: ظہور الباری اعظمی، باب حجۃ الوداع کی پہلی حدیث (**یوم النحر**) کے اردو ترجمے سے ''اقتباس''، جلد دویم، صفحہ:۷۸۷، حدیث نمبر:۱,۵۳۰

''پھر آپؐ نے دریافت فرمایا اور یہ دن کون سا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ بہتر علم ہے۔ پھر آپؐ خاموش ہوگئے اور ہم نے سمجھا (کہ) شاید

آپؐ اس کا نام اس کے مشہور نام کے سوا کوئی اور رکھیں گے لیکن آپؐ نے فرمایا: کیا یہ یوم النحر (قربانی کا دن) نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ کیوں نہیں۔''

(علامہ وحیدالزمان کے ترجمے میں یہ جلد دوئم کے صفحہ ۷۴۴ پر، حدیث نمبر ۱,۵۲۵ میں ہے)

(۲) باب حجۃ الوداع کی دوسری حدیث کا انگریزی ترجمہ، جلد ۵، صفحہ نمبر ۴۸۷، حدیث نمبر: ۶۸۹

"Some Jews said, Had this verse (یوم اکملت لکم دینکم) been revealed to us, we would have taken that day as Eid (festival)". Umar said, "What verse?" They said, "This day I have perfected your religion for you, completed My favour upon you, and have chosen for you Islam as your religion" (S:3). Umar said, "I know the place where it was revelaed. It was revealed while Allah's Apostle was staying at Arafat."

مترجم: ظہورالباری اعظمی، باب حجۃ الوداع کی دوسری حدیث کا اردو ترجمہ، جلد دوئم، صفحہ نمبر: ۷۸۸، حدیث نمبر: ۱,۵۳۱

''چند یہودیوں نے کہا کہ اگر یہ آیت (**یوم اکملت لکم دینکم**) ہمارے یہاں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن عید منایا کرتے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''کون سی آیت؟'' انھوں نے کہا ''**الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی**'' (آج میں نے تم پر اپنے دین کو کامل کیا اور اپنی نعمت پوری کردی) اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ آیت کہاں نازل ہوئی تھی؟ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ میدان عرفہ میں کھڑے تھے۔''

(علامہ وحیدالزمان کے ترجمے میں، یہ جلد دوئم کے صفحہ ۷۴۵ پر ہے اور حدیث نمبر: ۱,۵۲۶ ہے)

باب حجۃ الوداع کی ان احادیث (جن میں دوسری حدیث متعلقہ ہے) میں کہیں جمعے کا ذکر نہیں۔ سید سلیمان ندوی نے ''حجۃ الوداع'' کے علاوہ صراحتاً صحیح بخاری کی تفسیر ''**الیوم**

اکملت لکم دینکم'' کا ذکر کیا ہے۔[۵۲] اس آیت کے بارے میں ابھی جس حدیث کا ذکر ہوا تھا وہ صحیح بخاری کے باب ''حجۃ الوداع'' میں ہے۔ اب مزید وضاحت کے لیے، اسی آیت کے بارے میں جس حدیث کا ذکر ہو رہا ہے، اس کی تفسیر صحیح بخاری کی ''کتاب التفسیر'' میں ہے، جس میں قرآن کی سورتوں کی چیدہ چیدہ آیات کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ یہاں متعلقہ سورۃ ''المائدۃ'' ہے۔''

(۳) ''کتاب التفسیر'' میں ''سورۃ المائدۃ'' کی تفسیر سے انگریزی ترجمہ، جلد: ۶، صفحہ: نمبر ۱۰۳، حدیث نمبر: ۱۰۰

"The Jews said to Umar, You (i.e, Muslims) recite a verse, and had it been revealed to us, we would have taken the day of its revelation as a day of celebration." Umar said, "I know very well when and where it was revealed, and where Allah's Apostle was when it was revealed. (it was revealed on) the day of Arafat (Hajj Day), and by Allah, I was at Arafat." Sufyan, a sub-narrator said, I am in doubt whether the Verse: "This day I have perfected your religion for you" was revealed on a Friday or not."

مترجم: ظہورالباری اعظمی، کتاب التفسیر میں سورۃ المائدہ کی تفسیر سے اردو ترجمہ، جلد دوئم، صفحہ نمبر: ۸۸۰، حدیث نمبر: ۱,۷۱۹

''یہودیوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ لوگ ایک ایسی آیت تلاوت کرتے ہیں کہ اگر ہمارے یہاں وہ نازل ہوئی ہوتی تو ہم (جس دن وہ نازل ہوئی ہوتی) اس دن خوشی منایا کرتے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ آیت کہاں اور کب نازل ہوئی تھی اور جب عرفہ کے دن نازل ہوئی تو حضور اکرمؐ کہاں تشریف رکھتے تھے؟ خدا گواہ ہے ہم اس وقت میدان عرفہ میں

تھے۔ (ایک درمیان کے راوی) سفیان نے کہا کہ مجھے شک ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا یا نہیں ''آج میں نے تمہارے لیے دین کامل کر دیا۔''

(علامہ وحیدالزمان کے ترجمے میں یہ جلد دوئم کے صفحات ۸۴۰، ۸۴۱ پر ہے، اور حدیث نمبر ۱۴۷۱ ہے)

صحیح بخاری کے باب ''حجۃ الوداع'' اور صحیح بخاری کی ''کتاب التفسیر'' دونوں میں آیت ''**اکملت لکم دینکم**'' کے بارے میں جو احادیث درج ہیں، ان سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت عمرؓ نے صرف یہ کہا کہ یہ آیت یومِ عرفات کو نازل ہوئی (جو ذی الحج کے مہینے کی نو تاریخ ہوتی ہے)۔ دونوں مقامات پر حضرت عمرؓ نے یہ نہیں کہا کہ یہ جمعے کا دن تھا۔ صحیح بخاری کی ''کتاب التفسیر'' میں درج شدہ حدیث میں جہاں صرف ایک بار جمعے کا ذکر آیا ہے تو وہ بھی درمیان کے ایک راوی کے ان الفاظ میں آیا ہے کہ انھیں شک ہے کہ وہ جمعے کا دن تھا یا نہیں؟

اب اگر کسی کو صدیوں پہلے یہ شک تھا کہ ۹/ذی الحج ۱۰ھ کو جمعے کا دن تھا یا نہیں، تو پھر ۹/ذی الحج کو وہ کون سا دن ہونا چاہیے جو صدیوں کے اس (غیر مدلل) استدلال کو رد کر دے کہ بارہ ربیع الاوّل کی روایت ''قطعًا ناقابلِ تسلیم'' ہے۔[۵۲] سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اگر ۹/ذی الحج ۱۰ھ کو ہفتے کا دن ہوتا اور ذی الحج ۱۰ھ، محرم ۱۱ھ اور صفر ۱۱ھ کے تینوں مہینے ۳۰، ۳۰ دن کے ہوں (۲۰۱۳ء/ ۱۴۳۴ھ میں صفر، ربیع الاوّل اور ربیع الثّانی کے تینوں مہینے ۳۰، ۳۰ دن کے تھے، جب کہ ماہرینِ فلکیات کے مطابق متواتر چار قمری مہینے ۳۰، ۳۰ دن کے ہو سکتے ہیں اور ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء میں ہو چکے ہیں) تو بارہ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو پیر کا روز ہوگا۔ ابوالنصر محمد خالدی کی تقویم کے مطابق ۹/ذی الحج ۱۰ھ کو ہفتے کا دن تھا اور مارچ ۶۳۲ء کی سات تاریخ تھی، لیکن ہم کسی تقویم کو بنیاد نہیں بنائیں گے، جس کی وجہ ہم لکھ آئے ہیں، لیکن ہم اس پر ضرور غور کریں گے کہ کیا ۹/ذی الحج ۱۰ھ کو ہفتے کا دن ہو سکتا ہے؟

ڈاکٹر حمیداللہ نے اپنے فروری ۱۹۶۹ء کے مقالے میں،[۲۹] اپنے مرتب کردہ کیلنڈر کے مطابق ۹/ذی الحج ۱۰ھ کو جمعہ اور اپنے حساب سے ۶/ مارچ ۶۳۲ء قرار دیا ہے،

جس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر مغربی کیلنڈر سے مطابقت کی جائے تو یہ تاریخ ۷/ مارچ بنتی ہے۔ اب اگر مغربی کیلنڈر کے مطابق تاریخ سات مارچ (۶۳۲ء) بنتی ہے، تو پھر مغربی کیلنڈر کے مطابق دن ہفتہ ہوگا، جمعہ نہیں، اور یہی ہفتہ کا دن ابوالنصر محمد خالدی کی تقویم میں بھی درج ہے۔ جب خود ڈاکٹر حمیداللہ نے اپنے مجوزہ کیلنڈر کو حتمی نہیں سمجھا، اور نہ ابھی اس کی آزادانہ تصدیق ہوئی ہے، تو ہم اسے کیسے حتمی قرار دے سکتے ہیں؟ اہم بات یہ ہے کہ نو صدیوں سے جاری رہنے والی وہ ''قطعیت'' کہ بارہ ربیع الاوّل کی روایت ''قطعًا ناقابلِ تسلیم'' ہے، اب ''قطعی'' نہیں لگتی۔ اس پر معروضی انداز میں غور کرنے کی گنجائش موجود ہے، جو صدیوں سے بند رکھی گئی۔ آیئے اب اکیسویں صدی عیسوی میں اس پر غور کریں۔

پچھلے صفحات میں جب ہم نے روایات کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کی بات کی تھی تو لکھا تھا کہ اگر مختلف روایات کے پایۂ استناد میں فرق نہ ہو، اور کوئی روایت دوسری روایات کے مقابلے میں بہت زیادہ مشہور اور صدیوں سے مقبولِ عام چلی آ رہی ہو، اور ثقہ علما اور معتبر سیرت نگاروں نے بھی اسے صدیوں سے قبول کیا ہو، تو اسے دوسری روایات پر ترجیح ملنی چاہیے لیکن سب سے پہلے اس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے کہ یہ روایت کب سے رائج ہے اور ثقہ علما اور سیرت نگاروں کی قبولیت ان کی یا ان سے منسوب، صرف زبانی کلامی روایات پر مبنی ہے، یا ان ثقہ علما اور سیرت نگاروں کی مستند تحریروں میں درج ہے۔ مؤخرالذکر صورت میں اس کے صحیح ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

جہاں تک بارہ ربیع الاوّل ۱۱ھ کی شہرت اور مقبولیت کا تعلق ہے، تو اکثر مسلمانوں نے اس کے علاوہ کوئی اور تاریخِ وفات سنی ہی نہیں۔ اگر نو صدیوں سے عبدالرحمان سہیلی اور ان کے مؤیدین، استدلال کے ساتھ، یہ کہہ رہے تھے کہ بارہ ربیع الاوّل ''قطعًا ناقابلِ تسلیم'' ہے، تو سوال یہ ہے کہ یہ بات نو صدیوں تک پڑھتے رہنے کے باوجود، ثقہ علما اور معتبر سیرت نگار، صدیوں سے، بارہ ربیع الاوّل ہی کو آپؐ کی تاریخِ وفات کیوں لکھتے چلے آ رہے ہیں؟ نام تو بہت سے ہیں لیکن فی الحال مثال کے طور پر صرف دس ناموں کا ذکر ہو جائے۔ ان میں سے

پانچ ناموں کا تعلق تیسری صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک ہے، اور بقیہ پانچ کا تعلق چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی سے ہے۔

تیسری صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک، مندرجہ ذیل مؤرخین اور سیرت نگاروں نے ۱۲ر ربیع الاوّل ۱۱ھ کو آپؐ کی تاریخِ وفات قرار دیا ہے:

نمبر شمار	نام	کتاب کا نام	ہجری سنین میں	عیسوی سنین میں
۱۔	ابنِ سعد	طبقاتِ کبیر	۱۶۸ھ۔۲۳۰ھ	۷۸۴ء۔۸۴۵ء
۲۔	بلاذری	انساب الاشراف	؟۔۲۷۹ھ	؟۔۸۹۲ء
۳۔	ابنِ حزم	جوامع السیرۃ	۳۸۴ھ۔۴۵۶ھ	۹۹۴ء۔۱۰۶۴ء
۴۔	ابن الجوزی	الوفا	۵۱۰ھ۔۵۹۷ھ	۱۱۱۶ء۔۱۲۰۰ء
۵۔	ابنِ کثیر	السیرۃ النبویہؐ	۷۱۰ھ۔۷۷۴ھ	۱۳۱۰ء۔۱۳۷۳ء

یہ پانچوں نام پنجاب یونیورسٹی کی اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کی جلد نمبر ۱۹ (شائع شدہ: پہلی بار ۱۹۸۶ء/ دوسری بار ۲۰۰۸ء) کے صفحہ ۶۷ پر درج ہیں، اس کے علاوہ یہی پانچوں نام اس ادارے کی کتاب ''سیرۃ خیرالانام'' (شائع شدہ: ۱۹۹۹ء) کے صفحہ ۱۶۷ پر، ڈاکٹر حمیداللہ کے مرکزی مقالہِ سیرت میں بھی اسی طرح سے پیش کیے گئے ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں انہی صفحات پر ان پانچ ناموں سے پہلے یہ فقرہ (جس کی تائید میں یہ پانچ نام دیئے گئے ہیں) درج ہے:

''جمہور کے نزدیک آں حضرت ﷺ نے ہجرت کے دس سال پورے ہونے کے بعد پیر کے دن ربیع الاوّل ۱۱ھ کو اس دنیا سے رحلت فرمائی۔''

یہاں تاریخِ طبری کی وہ روایت یاد آتی ہے، جس کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے، جو حضرت عائشہؓ سے منسوب ہے، اور جسے قارئین کی سہولت کے لیے ہم نیچے لکھ رہے ہیں:

''۱۲ر ربیع الاوّل ٹھیک اس روز جب آپؐ مدینے میں ہجرت کر کے آئے تھے، آپؐ نے وفات پائی۔[۱۷] اور یہی بات اس سے پہلے ابنِ سعد، نہ صرف حضرت عائشہؓ بلکہ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے بیان کر چکے تھے۔''[۱۸]

آٹھویں صدی ہجری سے اب ہم چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی کی

طرف آتے ہیں اور یہاں بھی ۱۲ر ربیع الاوّل ۱۱ھ کی روایت کی تائید میں پانچ مؤرخین اور سیرت نگاروں کے ناموں پر اکتفا کرتے ہیں:

نمبر شمار	نام	کتاب کا نام	صفحہ	سالِ اشاعت
۱۔	مولانا ابوالکلام آزاد	رسول کریمؐ اور خلفائے راشدین کے آخری لمحات	۳۸	۲۰۰۸ء
۲۔	قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری	رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)	۲۷۷	۱۹۹۰ء
۳۔	سید ابوالحسن علی ندوی	نبی رحمتؐ (عربی سے ترجمہ)	۵۴۵	نامعلوم
۴۔	صفی الرحمٰن مبارک پوری	الرحیق المختوم (عربی سے ترجمہ)	۶۳۰	۲۰۰۳ء
۵۔	مارٹن لنگز (ابوبکر سراج الدین)	Muhammad	۳۴۰	۱۹۸۵ء

نوٹ: ناشرین کے نام اور پتے حواشی کے صفحے پر دیئے گئے ہیں۔[۵۶]

یہاں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں ایک چھوٹی سی وضاحت ضروری ہے۔ مولانا آزاد کی مندرجہ بالا کتاب میں مصنف یا کاتب/ کمپوزر کی ایک بدیہی غلطی نظر آتی ہے جو مندرجہ ذیل تقابلی جائزے سے بخوبی واضح ہو جائے گی:

قاضی سلیمان سلمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمینؐ'' (جلد اول) میں یہ فقرہ ہے:

''۱۲ر ربیع الاوّل ۱۱ ہجری یوم دوشنبہ وقتِ چاشت تھا کہ جسمِ اطہر سے روحِ انور نے پرواز کیا۔ اس وقت عمر مبارک ۶۳ سال قمری پر ۴ دن تھی۔''

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب میں فقرہ یہ ہے: ''یہ ربیع الاوّل ۱۱ھ دوشنبہ کا دن اور چاشت کا وقت تھا۔ عمر مبارک قمری حساب سے ۶۳ سال اور چار دن ہوئی۔''

صاف معلوم ہوتا ہے کہ موخر الذکر فقرے میں، ربیع الاوّل کی تاریخ کسی وجہ سے رہ گئی (ورنہ ''چار دن'' کا ذکر نہ ہوتا) اور اس فقرے سے پہلے بھی مولانا آزاد کی اس کتاب کے بعض صفحات میں جہاں ایک دوجگہ ''۱۲'' ربیع الاوّل کی بجائے ''۹'' ربیع الاوّل لکھ دیا گیا ہے، وہ بھی اگر مولانا کے قلم کی لغزش نہیں تو کاتب یا کمپوزر کی غلطی ہے۔

اگر صدیوں پہلے ابن الجوزی اور ابنِ کثیر جیسے جیّد علما اور بیسویں صدی عیسوی میں

مولانا ابوالکلام آزاد، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، صفی الرحمٰن مبارک پوری اور مارٹن لنگز نے سہیلی اور سید سلیمان ندوی کے تفصیلی استدلال کو قطعًا نظر انداز کر کے ۱۲/ربیع الاوّل کو ہی آپؐ کی تاریخِ وفات کے طور پر لکھا تو وہ بلا وجہ اور بلا جواز تو نہ ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے جواز بیان نہیں کیا جس کی وجہ سے بعض سکہ بند مؤرخ اور سیرت نگار بھی عبدالرحمٰن سہیلی، شبلی اور سید سلیمان ندوی کے ہم خیال ہوگئے۔ صرف ایک مثال کافی ہے۔

مولانا غلام رسول مہر بیسویں صدی عیسوی میں، غیر منقسم ہندوستان کے ایک مشہور صحافی، ادیب اور مورخ ہونے کے علاوہ، مولانا ابوالکلام آزاد کے شیدائی تھے۔ انھوں نے بہت محنت اور محبت سے سیرتِ طیبہؐ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے بکھرے ہوئے مقالات، بہ ترتیب و اضافۂ مطالب، ایک کتاب میں جمع کر دیئے جس کا نام ہے، ''رسولِ رحمت ﷺ''۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ انھوں نے ''رسول کریمؐ کے آخری لمحات'' مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ''رسولِ رحمت ﷺ'' میں جگہ نہیں دی اور اسے خارج کرنے کی وجہ بھی نہیں لکھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس خود پیدا کردہ خلا کو پُر کرنے کے لیے خود ایک نیا مضمون لکھا اور اسے ''رسول اللہ ﷺ کی وفات'' کے عنوان سے ''رسولِ رحمت ﷺ'' میں شامل کر دیا اور وضاحت کر دی کہ یہ مضمون ان کا اپنا ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ مولانا غلام رسول مہر کے اس مضمون سے ایک مختصر اقتباس ہر بات واضح کر دے گا۔ اقتباس یہ ہے:

> ''عمومًا سمجھا جاتا ہے کہ وفات ۱۲/ربیع الاوّل کو ہوئی، اور تاریخِ ولادت بھی ۱۲/ربیع الاوّل ہی مانی جاتی ہے، لیکن چھان بین کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں تاریخیں محلِ نظر ہیں..... اس سلسلے میں مولانا شبلی مرحوم نے جو کچھ تحریر فرما دیا ہے، اس میں تاحال کسی اضافے کی گنجائش محسوس نہیں ہوئی اور مرحوم جس نتیجے پر پہنچے (یعنی یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ) وہی صحیح معلوم ہوتا ہے..... یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ صرف یہی صحیح ہے، تاہم بظاہر حساب کے مطابق یہ تاریخ اس وقت تک مسلّم رہے گی جب تک قوی تر دلیل سے اس کا نقص واضح نہ ہو جائے۔''[۵۷]

شاید وہ وقت آ گیا ہے۔

یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ ان اٹھارہ امکانی تاریخوں میں سے ایک تاریخ ہے جب بارہ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو پیر کا روز ہوسکتا ہے۔ یہ تمام اٹھارہ تاریخیں اس ''واحد بنیاد'' پر نکالی گئی تھیں کہ ۹/ذی الحج کو جمعے کا دن تھا، اور اکیسویں صدی عیسوی کی تحقیق کا ایک مرکزی نکتہ یہی ہے کہ کیا یہ ''بنیاد'' درست ہے؟ اس بارے میں صحیح بخاری کی متعلقہ احادیث کا مستند انگریزی اور اردو ترجمہ پیش کیا جا چکا ہے۔ علما اس پر مزید تحقیق کریں۔ ہم اکیسویں صدی عیسوی کے نقطۂ نظر کو اس بحث میں الجھانے کی بجائے، اللہ کا نام لے کر، ایک قدم آگے چلتے ہیں اور اکیسویں صدی عیسوی کے ہر مسلمان سے اصل مسئلے پر غور کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔

اصل مسئلہ:

اصل مسئلہ رویتِ ہلال کا ہے اور رویتِ ہلال، چودہ سو سال پہلے انسانی آنکھ سے ہوتی تھی۔ انسانی آنکھ سے غلطی یا غلط فہمی بھی ہوسکتی ہے۔ اس کا بھرپور ثبوت ۱۴۳۲ھ/ ۲۰۱۱ء میں ۱۵/اور ۱۶/جون ۲۰۱۱ء کی درمیانی شب کو ملا، جو تیرہ اور چودہ رجب کی درمیانی شب ہونی چاہیے تھی لیکن پورے پاکستان میں یہ بارہ اور تیرہ رجب کی درمیانی شب قرار دی گئی کیوں کہ یہ سرکاری رویتِ ہلال کمیٹی کا وہ فیصلہ تھا، جو اس نے یکم رجب ۱۴۳۲ھ کے ہلال کے بارے میں پورے ملک سے شرعی شہادتیں حاصل کرنے، ان پر کمیٹی میں شامل مختلف فقہوں سے تعلق رکھنے والے علما سے مشورہ کرنے، اور ان کے علاوہ ماہرینِ فلکیات کی رائے لینے کے بعد متفقہ طور پر کیا تھا اور پاکستان کے کسی کونے سے اس وقت اس فیصلے کے خلاف آواز نہیں اٹھی تھی، اس کے بموجب ۱۵/جون ۲۰۱۱ء بروز بدھ، پاکستان میں ۱۲/رجب ۱۴۳۲ھ تھا۔ رویت کا فیصلہ خواہ اس میں تمام علما اور سب ماہرینِ فلکیات شامل ہو جائیں، ضروری نہیں کہ قدرتی نظام کے مطابق ہو۔

۱۵/جون اور ۱۶/جون کی درمیانی شب جب اس طرح گزر گئی، تو اگلے دن ۱۶/جون ۲۰۱۱ء (جمعرات) کو (جو اس حساب سے تیرہ رجب تھا) پاکستان کے ایک معروف قومی

اخبار نوائے وقت کے کراچی اڈیشن کے صفحۂ اول پر اس بارے میں یہ خبر شائع ہوئی:

سرخی: ''کیا چاند کی تاریخ پاکستان میں غلط چل رہی ہے؟''

''شہریوں کے فون، گرہن مکمل چاند کو لگتا ہے''

''آج ۱۳؍رجب ہے (جب کہ آج) قمری ماہ کی ۱۴ تاریخ بنتی ہے''

''علمائے کرام اور محکمۂ موسمیات کے فون بند نکلے، رویت کے مسئلے پر بحث چھڑ گئی''

خبر کا متن: ''کراچی (وقائع نگار) چاند گرہن نے پاکستان بھر میں رویت کے مسئلے پر بحث چھیڑ دی ہے۔ ماہرینِ فلکیات کے مطابق چاند کو گرہن قدرتی طور پر اس وقت لگتا ہے، جب وہ مکمل ہوتا ہے جو قمری ماہ کی ۱۴ تاریخ بنتی ہے (جب کہ) پاکستان میں آج ۱۳؍رجب ہے۔ اس لحاظ سے ملک میں ایک دن پہلے ہی چاند مکمل ہوگیا..... اس ضمن میں جب متعدد علمائے کرام اور محکمۂ موسمیات سے رابطے کی کوشش کی گئی تو تمام نے اپنے فون بند کر رکھے تھے۔''

قدرت کی طرف سے ۱۵؍جون ۲۰۱۱ء کی شب کو یہ حتمی ثبوت ملنے کے بعد کہ پاکستان میں ماہِ رجب ۱۴۳۲ھ کا قمری کلینڈر ایک دن پیچھے چل رہا ہے، پاکستان میں ماہِ رجب ۱۴۳۲ھ کا مہینہ ۲۹ دن کا ہونا چاہیے تھا، تاہم پاکستان کی سرکاری رویتِ ہلال کمیٹی نے پورے ملک سے حاصل کردہ شرعی شہادتوں، تمام مسالک کے علما کی مشاورت اور ماہرینِ فلکیات کی مشترکہ رائے کے مطابق ماہِ رجب ۱۴۳۲ھ کا مہینہ ۳۰ دن کا قرار دیا (جو نظامِ فلکی کے مطابق ۳۱ دن کا ہوگیا)۔ پاکستان کے کسی کونے سے اس فیصلے کے خلاف آواز نہ اٹھی۔ اکیسویں صدی عیسوی کا مسلمان غور کرے کہ ویسے تو تقریباً ہر سال، رمضان کے پہلے اور آخری روزے کے موقع پر، رویتِ ہلال کو ایک ایسا مسئلہ بنا دیا جاتا ہے، جو سمجھ سے باہر ہوتا ہے، لیکن جب چار محترم قمری مہینوں میں سے ایک مہینے یعنی رجب (۱۴۳۲ھ) میں رویتِ ہلال واقعی ایک مسئلہ بنی، تو نہ پاکستان کی سرکاری رویتِ ہلال کمیٹی نے اس پر کوئی تبصرہ کیا، اور نہ رویتِ ہلال کو مسئلہ بنانے والوں نے اسے مسئلہ سمجھا، جو سمجھ سے باہر ہے۔

دو ہفتے بعد، شعبان ۱۴۳۲ھ کا مہینہ آیا۔ یہ گزرا تو اس بار انہونی ہوگئی۔ ۲۸؍شعبان ۱۴۳۲ھ (بروز اتوار) پشاور میں مقامی شرعی شہادتوں کی بنیاد پر رمضان کے چاند کا اعلان ہوگیا۔ نوائے وقت کراچی اڈیشن کے صفحۂ اول پر اس بار یہ خبر شائع ہوئی:

سرخی: ''۲۸؍شعبان کو پشاور میں چاند دیکھے کا اعلان''

خبر کا متن: ''پشاور اور شمالی وزیرستان میں ۲۸؍شعبان کو رمضان المبارک کا چاند دیکھنے اور آج بروز پیر (۲۹؍شعبان) پہلے روزے کا اعلان کر دیا گیا..... شمالی وزیرستان میں بھی بارہ افراد کی طرف سے چاند نظر آنے کی شہادتیں آئیں جس کے بعد شمالی علاقوں میں مساجد سے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے اعلانات کیے گئے..... شمالی وزیرستان کے علاوہ (صوبہ) خیبر پختونخوا کے علاقوں مردان، نوشہرہ، چارسدہ، بنوں، ہنگو، پشاور اور بعض دیگر علاقوں میں آج (پیر ۲۹؍شعبان) کو پہلا روزہ ہوگا۔''

مہینے بھر بعد، ۳۰؍اگست ۲۰۱۱ء بمطابق ۲۹؍رمضان ۱۴۳۲ھ بروز منگل، نوائے وقت کے کراچی اڈیشن کے صفحۂ اول پر جو خبر شائع ہوئی، اب اس کا اقتباس پیش ہے:

سرخی: ''پشاور، مسجد قاسم علی خان سے چاند نظر آنے اور آج عید کا اعلان''

خبر کا متن: ''پشاور کی مسجد قاسم علی خان کے خطیب مفتی شہاب الدین پوپل زئی نے منگل ۳۰؍اگست (۲۹؍رمضان) کو عیدالفطر منانے کا اعلان کر دیا۔ اس بار بھی دو عیدیں منائی جائیں گی..... کیوں کہ سرکاری رویت ہلال کمیٹی کی جانب سے شوال کا چاند دیکھنے کے لیے (۳۰؍اگست) منگل (۲۹؍رمضان) کو اجلاس طلب کر لیا۔''

اس طرح ۱۶؍جون ۲۰۱۱ء سے ۳۰؍اگست ۲۰۱۱ء تک کے ڈھائی مہینوں میں رویتِ ہلال کے بارے میں تین بار ایک دن کا اختلاف ہوا اور جون ۲۰۱۱ء/ رجب ۱۴۳۲ھ میں تو قدرت نے ثابت کر دیا کہ یکم رجب ۱۴۳۲ھ کو چاند دیکھے میں ایک دن کی غلطی ہوئی تھی حالاں کہ پاکستان میں یکم رجب کی تاریخ پر سب متفق تھے۔

رسول کریم ﷺ نے ذی قعدہ ۱۰ھ ختم ہونے سے چار دن [۵۸] پہلے ۲۶؍فروری

۶۳۲ء کو مدینے سے مکے کی طرف سفرِ حج کا آغاز کیا اور ہفتہ بھر بعد، ۴/ذی الحج ۱۰ھ/ ۳/مارچ ۶۳۲ء کو آپؐ مکے پہنچ گئے۔[۵۹] جب ذی الحج ۱۰ھ کا چاند نکلا تو مکے اور مدینے کا بدرِ کامل مکے اور مدینے کے درمیان تھا۔ آپؐ نے یومِ عرفات (۹/ذی الحج ۱۰ھ) مدینے کی رویتِ ہلال کے مطابق نہیں بلکہ مکے والوں کی رویتِ ہلال کے مطابق منایا۔

اگر ۲۰۱۱ء/۱۴۳۲ھ میں پاکستان میں ماہِ رجب کے چاند کے بارے میں ایک دن کی ایسی ناقابلِ تردید غلطی ہوسکتی ہے، جو قدرت نے مکمل چاند گرہن ایک رات پہلے کرکے ثابت کردی تو کیا رسول اللہ ﷺ کی ۴/ذی الحج ۱۰ھ کو مکے میں آمد سے پہلے، مکے والوں سے بھی یکم ذی الحج ۱۰ھ کا چاند دیکھنے میں ایک دن کی غلطی نہیں ہوسکتی؟ کیا مکے میں ۹/ذی الحج ۱۰ھ کو جمعے کی بجائے ہفتہ کا دن ہونا خارج از امکان ہے؟

بات اس سے بھی آگے جاتی ہے۔

بات صرف غلطی کی نہیں بلکہ رویتِ ہلال کے اس اہم پہلو کی ہے کہ اگر دو مقامات کے درمیان سیکڑوں میل کا فاصلہ ہو تو اکثر یہ ہوا ہے کہ ایک جگہ چاند نظر آیا اور دوسری جگہ نہیں۔ بالائی سطور میں ہم ڈھائی مہینے کے مختصر عرصے میں پاکستان میں اس کی مثال دوبار دیکھ چکے ہیں۔ مکے اور مدینے کے درمیان تقریباً ۴۳۵ کلومیٹر یا ۳۰۰ میل کا فاصلہ ہے۔

اگر یکم ذی الحج ۱۰ھ کو مکے اور مدینے میں رویتِ ہلال یعنی چاند کے انسانی آنکھ سے نظر آنے میں ایک دن کا فرق ہوگیا ہو تو مکے میں ۹/ذی الحج ۱۰ھ کو جمعے کا دن اور مدینے میں ۹/ذی الحج ۱۰ھ کو ہفتے کا روز ہوگا۔ اس کے بعد اگر مکے اور مدینے میں ذی الحج ۱۰ھ، محرم ۱۱ھ اور صفر ۱۱ھ کے تینوں مہینے متواتر ۳۰، ۳۰ دن کے ہوئے ہوں، تو ۱۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ کو مکے میں اتوار اور مدینے میں پیر کا دن ہوگا۔ اس طرح ۱۲/ربیع الاوّل (۱۱ھ) بھی آپؐ کی تاریخِ وفات کی ایک امکانی تاریخ بن جاتی ہے۔

پچھلے صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ طبقاتِ ابنِ سعد اور تاریخِ طبری میں رسول کریم ﷺ کی تاریخِ وفات کی صرف دو روایات کا ذکر کیا گیا ہے: ۲/ربیع الاوّل اور ۱۲/

ربیع الاوّل۔ ۲/ربیع الاوّل کی روایت میں کسی راوی کا نام درج نہیں، اس کے برعکس ۱۲/ربیع الاوّل کے بارے میں ایک سے زیادہ رُواۃ کے نام ہیں، جن میں حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ شامل ہیں۔

ان روایات کی روشنی میں گو آپؐ کی تاریخِ وفات کے طور پر ۲/ربیع الاوّل اور ۱۲/ربیع الاوّل دونوں تاریخیں ممکن ہیں لیکن ۱۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ کو ۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ سمیت دیگر روایات پر یوں فوقیت حاصل ہے کہ تاریخ کی قدیم اور مستند کتابوں میں یہی تاریخ سب سے پہلے نظر آتی ہے۔ واقدی نے بطور مؤرخ سب سے پہلے یہ لکھی۔ ابنِ سعد نے فوراً بعد اسے دہرایا۔ صدیوں سے اس تاریخ کو نہ صرف عوام بلکہ خواص میں مقبولیت حاصل ہے۔ خلقِ خدا نے اس پر کبھی شک نہیں کیا، لیکن خواص میں سے جن بزرگوں نے بارہ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو ''قطعًا ناقابلِ تسلیم'' سمجھا، اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ یومِ عرفہ ۱۰ھ کی اس روایت کو نہ صرف تحقیق بلکہ تفکر سے ماورا سمجھا گیا کہ اولاً ۹/ذی الحج کو جمعہ تھا اور ثانیًا چوں کہ مکے میں جمعہ تھا، اس لیے مدینے میں بھی جمعہ تھا۔

ڈاکٹر حمیداللہ نے کہا کہ یا تو ۹/ذی الحج ۱۰ھ کو جمعہ نہیں تھا، یا ۱۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ کو پیر نہیں تھی۔ اس بیان میں دو امکانات بتائے گئے ہیں لیکن آٹھ صدیوں تک صرف پہلے امکان کو یقینی سمجھا گیا، اور دوسرے کو غور کے قابل ہی نہیں سمجھا گیا۔

ڈاکٹر حمیداللہ نے اپنے فروری ۱۹۶۹ء[۲۹] کے مضمون میں اپنی عارضی رائے کے اظہار کے بعد آخری فیصلہ ماہرینِ فلکیات[۶۰] پر چھوڑا ہے۔ اکیسویں صدی کے ماہرینِ فلکیات اپنے علم اور سپر کمپیوٹر کے زعم، اور ڈاکٹر حمیداللہ کی مندرجہ بالا رائے کو رہنما بنا کر، یہ نہ بھولیں کہ اکیسویں صدی کے علم اور سپر کمپیوٹر کے ذریعے قمری تاریخوں کا تعین تو ہوجائے گا، لیکن اس تعین کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے جزیرہ نمائے عرب کے دو مقدس شہروں میں بسنے والی پاک ہستیوں نے پہلی کا چاند اپنی آنکھوں سے اسی روز دیکھا تھا جو آج کمپیوٹر کی آنکھ دکھا رہی ہے۔ ان کی آنکھوں نے تب جو دیکھا تھا وہ کمپیوٹر کی آنکھ اب نہیں دیکھ سکتی۔

سپر کمپیوٹر ہمیں شاید یہ بتا دے کہ ایک خاص طول بلد اور عرض بلد پر واقع ایک شہر میں چودہ صدیاں پہلے، پہلی کا چاند مغربی افق پر کس دن نظر آنا چاہیے تھا لیکن رہتی دنیا تک نہ ایسا کوئی ماہرِ فلکیات پیدا ہوگا، اور نہ ایسا کمپیوٹر ایجاد ہوگا جو یہ بتا سکے کہ یکم ذی الحج ۱۰ھ، یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ اور ان کے درمیان پڑنے والے دو مہینوں میں مکے اور مدینے والوں نے اسی شام کو واقعتاً ہلال دیکھا تھا یا نہیں، جو ماہرِ فلکیات آج بتا رہا ہے۔

۹/ذی الحج ۱۰ھ کے دن اور ۱۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ کے روز کا فیصلہ ماہرِ فلکیات پر چھوڑ نا تحقیق کو غلط سمت موڑ نا ہوگا۔ یہ فیصلے رسول کریم ﷺ کر چکے ہیں۔ اس عرض کے ساتھ یہ تحریر دربارِ رسالت مآب ﷺ میں پیش کرنے کی جسارت اس مصرع کے ساتھ ہے:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اللّٰھم صلّ علیٰ محمد النبی الاُمّی واٰلہٖ واصحابہٖ وسلم

❁ ❁ ❁

ضمیمہ

اگر ذی الحج ۱۰ھ، محرم ۱۱ھ اور صفر ۱۱ھ کے:

نمبر	دن	تینوں مہینے ۳۰،۳۰ دن کے ہوں		دو مہینے ۳۰،۳۰ دن اور ایک مہینا ۲۹ دن		ایک مہینا ۳۰ دن اور دو مہینے ۲۹،۲۹ دن		تینوں مہینے ۲۹، ۲۹ دن کے ہوں		ریمارکس
۱	جمعہ	۹/ذی الحج ۱۰ھ		۹/ذی الحج ۱۰		۹/ذی الحج ۱۰ھ		۹/ذی الحج ۱۰ھ		
۲	ہفتہ	۱۰/	//	۱۰/	//	۱۰/	//	۱۰/	//	
۳	اتوار	۱۱/	//	۱۱/	//	۱۱/	//	۱۱/	//	
۴	پیر	۱۲/	//	۱۲/	//	۱۲/	//	۱۲/	//	
۵	منگل	۱۳/	//	۱۳/	//	۱۳/	//	۱۳/	//	
۶	بدھ	۱۴/	//	۱۴/	//	۱۴/	//	۱۴/	//	
۷	جمعرات	۱۵/	//	۱۵/	//	۱۵/	//	۱۵/	//	
۸	جمعہ	۱۶/	//	۱۶/	//	۱۶/	//	۱۶/	//	
۹	ہفتہ	۱۷/	//	۱۷/	//	۱۷/	//	۱۷/	//	
۱۰	اتوار	۱۸/	//	۱۸/	//	۱۸/	//	۱۸/	//	
۱۱	پیر	۱۹/	//	۱۹/	//	۱۹/	//	۱۹/	//	
۱۲	منگل	۲۰/	//	۲۰/	//	۲۰/	//	۲۰/	//	
۱۳	بدھ	۲۱/	//	۲۱/	//	۲۱/	//	۲۱/	//	

۱۴	جمعرات	۲۲/ //	۲۲/ //	۲۲/ //	۲۲/ //
۱۵	جمعہ	۲۳/ //	۲۳/ //	۲۳/ //	۲۳/ //
۱۶	ہفتہ	۲۴/ //	۲۴/ //	۲۴/ //	۲۴/ //
۱۷	اتوار	۲۵/ //	۲۵/ //	۲۵/ //	۲۵/ //
۱۸	پیر	۲۶/ //	۲۶/ //	۲۶/ //	۲۶/ //
۱۹	منگل	۲۷/ //	۲۷/ //	۲۷/ //	۲۷/ //
۲۰	بدھ	۲۸/ //	۲۸/ //	۲۸/ //	۲۸/ //
۲۱	جمعرات	۲۹/ //	۲۹/ //	۲۹/ //	۲۹/ //
۲۲	جمعہ	۳۰/ //	۳۰/ //	☆ ۳۰/ //	☆ ۱/محرم ۱۱ھ

☆ حساب کو سہل رکھنے کے لیے یہاں ذی الحج ۱۰ھ کو ۳۰ روز پر مشتمل دکھایا گیا ہے۔ یہ ۲۹ روز کا بھی ہوسکتا ہے اور اس صورت میں محرم اور صفر ۱۱ھ ۳۰، ۳۰ روز کے ہوں گے اور علی ہذا القیاس۔ تاہم یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ اسی روز پڑے گی جس روز وہ متعلقہ کالم میں دکھائی گئی ہے۔

۲۳	ہفتہ	۱/محرم ۱۱ھ	۱/محرم ۱۱ھ	۱/محرم ۱۱ھ	۲/محرم ۱۱ھ
۲۴	اتوار	۲/ //	۲/ //	۲/ //	۳/ //
۲۵	پیر	۳/ //	۳/ //	۳/ //	۴/ //
۲۶	منگل	۴/ //	۴/ //	۴/ //	۵/ //
۲۷	بدھ	۵/ //	۵/ //	۵/ //	۶/ //
۲۸	جمعرات	۶/ //	۶/ //	۶/ //	۷/ //
۲۹	جمعہ	۷/ //	۷/ //	۷/ //	۸/ //
۳۰	ہفتہ	۸/ //	۸/ //	۸/ //	۹/ //
۳۱	اتوار	۹/ //	۹/ //	۹/ //	۱۰/ //

۳۲	پیر	۱۰/ //	۱۰/ //	۱۰/ //	۱۱/ //
۳۳	منگل	۱۱/ //	۱۱/ //	۱۱/ //	۱۲/ //
۳۴	بدھ	۱۲/ //	۱۲/ //	۱۲/ //	۱۳/ //
۳۵	جمعرات	۱۳/ //	۱۳/ //	۱۳/ //	۱۴/ //
۳۶	جمعہ	۱۴/ //	۱۴/ //	۱۴/ //	۱۵/ //
۳۷	ہفتہ	۱۵/ //	۱۵/ //	۱۵/ //	۱۶/ //
۳۸	اتوار	۱۶/ //	۱۶/ //	۱۶/ //	۱۷/ //
۳۹	پیر	۱۷/ //	۱۷/ //	۱۷/ //	۱۸/ //
۴۰	منگل	۱۸/ //	۱۸/ //	۱۸/ //	۱۹/ //
۴۱	بدھ	۱۹/ //	۱۹/ //	۱۹/ //	۲۰/ //
۴۲	جمعرات	۲۰/ //	۲۰/ //	۲۰/ //	۲۱/ //
۴۳	جمعہ	۲۱/ //	۲۱/ //	۲۱/ //	۲۲/ //
۴۴	ہفتہ	۲۲/ //	۲۲/ //	۲۲/ //	۲۳/ //
۴۵	اتوار	۲۳/ //	۲۳/ //	۲۳/ //	۲۴/ //
۴۶	پیر	۲۴/ //	۲۴/ //	۲۴/ //	۲۵/ //
۴۷	منگل	۲۵/ //	۲۵/ //	۲۵/ //	۲۶/ //
۴۸	بدھ	۲۶/ //	۲۶/ //	۲۶/ //	۲۷/ //
۴۹	جمعرات	۲۷/ //	۲۷/ //	۲۷/ //	۲۸/ //
۵۰	جمعہ	۲۸/ //	۲۸/ //	۲۸/ //	۲۹/ //
۵۱	ہفتہ	۲۹/ //	۲۹/ //	۲۹/ //	☆ ۱/صفر ۱۱ھ

☆ یہ حساب کو سہل رکھنے کے لیے کیا گیا ہے، تاہم یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ اسی روز پڑے گی جس روز وہ متعلقہ کالم میں دکھائی گئی ہے۔

۵۲	اتوار	۳۰/ //	۳۰/ // ☆	۱/صفر ۱۱ھ	۲/ //
۵۳	پیر	۱/صفر ۱۱ھ	۱/صفر ۱۱ھ	۲/ //	۳/ //
۵۴	منگل	۲/ //	۲/ //	۳/ //	۴/ //

۵۵	بدھ	۳/	//	۳/	//	۴/	//	۵/	//
۵۶	جمعرات	۴/	//	۴/	//	۵/	//	۶/	//
۵۷	جمعہ	۵/	//	۵/	//	۶/	//	۷/	//
۵۸	ہفتہ	۶/	//	۶/	//	۷/	//	۸/	//
۵۹	اتوار	۷/	//	۷/	//	۸/	//	۹/	//
۶۰	پیر	۸/	//	۸/	//	۹/	//	۱۰/	//
۶۱	منگل	۹/	//	۹/	//	۱۰/	//	۱۱/	//
۶۲	بدھ	۱۰/	//	۱۰/	//	۱۱/	//	۱۲/	//
۶۳	جمعرات	۱۱/	//	۱۱/	//	۱۲/	//	۱۳/	//
۶۴	جمعہ	۱۲/	//	۱۲/	//	۱۳/	//	۱۴/	//
۶۵	ہفتہ	۱۳/	//	۱۳/	//	۱۴/	//	۱۵/	//
۶۶	اتوار	۱۴/	//	۱۴/	//	۱۵/	//	۱۶/	//
۶۷	پیر	۱۵/	//	۱۵/	//	۱۶/	//	۱۷/	//
۶۸	منگل	۱۶/	//	۱۶/	//	۱۷/	//	۱۸/	//
۶۹	بدھ	۱۷/	//	۱۷/	//	۱۸/	//	۱۹/	//
۷۰	جمعرات	۱۸/	//	۱۸/	//	۱۹/	//	۲۰/	//
۷۱	جمعہ	۱۹/	//	۱۹/	//	۲۰/	//	۲۱/	//
۷۲	ہفتہ	۲۰/	//	۲۰/	//	۲۱/	//	۲۲/	//
۷۳	اتوار	۲۱/	//	۲۱/	//	۲۲/	//	۲۳/	//
۷۴	پیر	۲۲/	//	۲۲/	//	۲۳/	//	۲۴/	//
۷۵	منگل	۲۳/	//	۲۳/	//	۲۴/	//	۲۵/	//
۷۶	بدھ	۲۴/	//	۲۴/	//	۲۵/	//	۲۶/	//
۷۷	جمعرات	۲۵/	//	۲۵/	//	۲۶/	//	۲۷/	//
۷۸	جمعہ	۲۶/	//	۲۶/	//	۲۷/	//	۲۸/	//
۷۹	ہفتہ	۲۷/	//	۲۷/	//	۲۸/	//	۲۹/	//

۸۰	اتوار	۲۸/	//	۲۸/	//	۲۹/	//	☆ ۱/ربیع الاوّل ۱۱ھ		☆ یہ حساب کو سہل رکھنے کے لیے کیا گیا ہے، تاہم یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ اسی روز پڑے گی جس روز وہ متعلقہ کالم میں دکھائی گئی ہے۔
۸۱	پیر	۲۹/صفر ۱۱ھ		۲۹/صفر ۱۱ھ☆		۱/ربیع الاوّل ۱۱ھ		۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ		
۸۲	منگل	۳۰/	//	۱/ربیع الاوّل ۱۱ھ		۲/	//	۳/	//	
۸۳	بدھ	۱/ربیع الاوّل ۱۱ھ		۲/	//	۳/	//	۴/	//	
۸۴	جمعرات	۲/	//	۳/	//	۴/	//	۵/	//	
۸۵	جمعہ	۳/	//	۴/	//	۵/	//	۶/	//	
۸۶	ہفتہ	۴/	//	۵/	//	۶/	//	۷/	//	
۸۷	اتوار	۵/	//	۶/	//	۷/	//	۸/	//	
۸۸	پیر	۶/	//	۷/	//	۸/	//	۹/	//	
۸۹	منگل	۷/	//	۸/	//	۹/	//	۱۰/	//	
۹۰	بدھ	۸/	//	۹/	//	۱۰/	//	۱۱/	//	
۹۱	جمعرات	۹/	//	۱۰/	//	۱۱/	//	۱۲/	//	
۹۲	جمعہ	۱۰/	//	۱۱/	//	۱۲/	//	۱۳/	//	
۹۳	ہفتہ	۱۱/	//	۱۲/	//	۱۳/	//	۱۴/	//	
۹۴	اتوار	۱۲/	//	۱۳/	//	۱۴/	//	۱۵/	//	
۹۵	پیر	۱۳/	//	۱۴/	//	۱۵/	//	۱۶/	//	
۹۶	منگل	۱۴/	//	۱۵/	//	۱۶/	//	۱۷/	//	
۹۷	بدھ	۱۵/	//	۱۶/	//	۱۷/	//	۱۸/	//	
۹۸	جمعرات	۱۶/	//	۱۷/	//	۱۸/	//	۱۹/	//	
۹۹	جمعہ	۱۷/	//	۱۸/	//	۱۹/	//	۲۰/	//	
۱۰۰	ہفتہ	۱۸/	//	۱۹/	//	۲۰/	//	۲۱/	//	
۱۰۱	اتوار	۱۹/	//	۲۰/	//	۲۱/	//	۲۲/	//	
۱۰۲	پیر	۲۰/	//	۲۱/	//	۲۲/	//	۲۳/	//	

۱۰۳	منگل	۲۱/	//	۲۲/	//	۲۳/	//	۲۴	//	
۱۰۴	بدھ	۲۲/	//	۲۳/	//	۲۴/	//	۲۵/	//	
۱۰۵	جمعرات	۲۳/	//	۲۴/	//	۲۵/	//	۲۶/	//	
۱۰۶	جمعہ	۲۴/	//	۲۵/	//	۲۶/	//	۲۷/	//	
۱۰۷	ہفتہ	۲۵/	//	۲۶/	//	۲۷/	//	۲۸/	//	
۱۰۸	اتوار	۲۶/	//	۲۷/	//	۲۸/	//	۲۹/	//	
۱۰۹	پیر	۲۷/	//	۲۸/	//	۲۹/	//	۳۰/	//	
۱۱۰	منگل	۲۸/	//	۲۹/	//	۳۰/	//		-	
۱۱۱	بدھ	۲۹/	//	۳۰/	//	-			-	
۱۱۲	جمعرات	۳۰/	//	-		-			-	

حواشی وحوالہ جات:

۱ (i) سیرۃ النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی (اضافہ وتکمیلہ)، ص:۱۷۰، مطبع معارف، اعظم گڑھ، بھارت، ۱۹۳۳ء

(ii) ایضاً، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۲ The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء (پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

۳ رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص:۴۳، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

۴ The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ)، ابنِ اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۶۹، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء (پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

۵ صحیفہ ہمام بن منبہ عن ابی ہریرہؓ (عربی متن اور ترجمہ) تحقیق وترجمہ: ڈاکٹر حمید اللہ، (۱) بیکن بکس، میاں چیمبرز، ۳ٹمپل روڈ، لاہور (۲) بیکن بکس، گل گشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۷ء

۶ (i) مؤطّا (عربی متن اور اردو ترجمہ)، امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحید الزماں، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

(ii) AL-Muwatta (انگریزی ترجمہ) مترجم: Aisha Abdul Rahman Bewley، Kagan Paul International, London WC1B 3, SW, U.K، ۱۹۸۹ء

۷ مؤطّا (عربی متن اور اردو ترجمہ)، امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحید الزماں، ص:۱۹، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

۸ (i) The Translation of the meanings of "Sahih Al Bukhari"

(Vol V)، مرتب:امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص:۵۰۹ تا ۵۳۰، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers Ganpat Road, Lahore.، ۱۹۷۹ء

(ii) صحیح بخاری شریف مترجم (جلد دوئم)، مترجم: علامہ وحید الزماں، ص:۵۹۷ تا ۷۱۷، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

(iii) صحیح البخاری (جلد دوئم) (عربی متن بمعہ اردو ترجمہ)، مترجم: ظہور الباری اعظمی، ص:۸۰۱ تا ۸۱۴، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۸۵ء

۹؎ (i) مؤطّا (عربی متن اور اردو ترجمہ)، امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحید الزماں، ص:۲۲۰ تا ۲۳۵، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

(ii) AL-Muwatta (انگریزی ترجمہ) مترجم: Aisha Abdul Rahman Bewley، ص:۸۵ تا ۹۲، Kagan Paul International, London WC1B 3, SW, U.K، ۱۹۸۹ء

۱۰؎ (i) مؤطّا (عربی متن اور اردو ترجمہ)، امام مالکؒ بن انس، مترجم: علامہ وحید الزماں، ص: ۷۰۶، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

(ii) AL-Muwatta (انگریزی ترجمہ) مترجم: Aisha Abdul Rahman Bewley، ص:۳۷۷، Kagan Paul International, London WC1B 3, SW, U.K، ۱۹۸۹ء

۱۱؎ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (جلد۲۲)، زیرِ اہتمام: پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، لاہور (بار دوئم ۲۰۱۰ء)

۱۲؎ The Kitab Al Maghazi of Al-Waqidi، مصنف: محمد بن عمر بن واقد، تحقیق: ڈاکٹر مارسڈن جونز، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ۱۹۶۶ء

۱۳؎ المغازی (عربی) (جلد۳)، محمد بن عمر بن واقد، تحقیق: ڈاکٹر مارسڈن جونز، ص:۱۱۲۰، عالم الکتب، بیروت، لبنان (تیسرا اڈیشن ۱۹۸۴ء)

۱۴؎ The Translation of the Meanings of Sahih Al Bukhari (Vol.I)، مرتب:امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص:۳۰۵، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore.، ۱۹۷۶ء

۱۵؎ صحیح بخاری شریف مترجم (جلد اول)، مترجم: علامہ وحید الزماں، ص:۳۰۴، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۶؎ Arabic-English Lexicon (Part:3)، مؤلف: ایڈورڈ ولیم لین، ص:۱۲۷۷، ولیمز اینڈ نورگیٹ، ہنریٹا سٹریٹ، کوونٹ گارڈن، لندن، ۱۸۶۳ء

۱۷؎ The Translation of the Meanings of Sahih Al Bukhari (Vol. I) مرتب:امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص:۳۶۶، ''کتاب الاذان'' باب: ''**اهل العلم والفضل حق بالامامة**''، حدیث نمبر:۶۴۸، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers Ganpat Road, Lahore.، ۱۹۷۶ء

۱۸؎ (i) الطبقات الکبیر (عربی میں) (جلد دوئم)، مصنف: محمد بن سعد، تحقیق: ڈاکٹر علی محمد عمر، ص:۲۳۴ تا ۲۳۵، مکتبہ الخانجی، الشرکہ الدولیہ للطباعۃ، منطقہ صناعیہ ثانیہ قطعہ ۱۳۹، شارع ۳۹، مدینہ ۶/اکتوبر، قاہرہ، pic@6oct.ie-eg.com، ۲۰۰۱ء

(ii) طبقاتِ ابن سعد (اردو ترجمہ) (حصہ دوئم)، مصنف: محمد بن سعد، مترجم: عبداللہ العمادی، ص:۳۱۷، نفیس اکیڈمی، سٹریچن روڈ، کراچی (چھٹا اڈیشن ۱۹۸۲ء)

۱۹؎ (i) الطبقات الکبیر (عربی میں) (جلد دوئم)، مصنف: محمد بن سعد، تحقیق: ڈاکٹر علی محمد عمر، ص:۱۷۱، مکتبہ الخانجی، الشرکہ الدولیہ للطباعۃ، منطقہ صناعیہ ثانیہ قطعہ ۱۳۹، شارع ۳۹، مدینہ ۶/اکتوبر، قاہرہ، pic@6oct.ie-eg.com، ۲۰۰۱ء

(ii) طبقاتِ ابن سعد (اردو ترجمہ) (حصہ اول) مصنف: محمد بن سعد، مترجم: عبداللہ العمادی، ص:۴۷۴، نفیس اکیڈمی، سٹریچن روڈ، کراچی، اشاعت سویم: ۱۹۸۳ء

۲۰ تذکرۃ الحفاظ (ترجمہ) (جلد اول)، مصنف: امام شمس الدین ذہبی، مترجم: شیخ الحدیث حافظ محمد اسحاق، ص:۲۹، اسلامک پبلشنگ ہاؤس، شیش محل روڈ، لاہور، ۱۹۸۱ء

۲۱ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (جلد دوئم)، زیرِ اہتمام: پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص:۷۰، شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۶ء

۲۲ اٹلس سیرتِ نبویؐ (عربی سے اردو ترجمہ) ڈاکٹر شوقی ابوخلیل، مترجم: شیخ الحدیث حافظ محمد امین، ص:۴۸۶، (۱) مکتبہ دارالسلام ریاض، سعودی عرب (۲) مکتبہ دارالسلام، لوئر مال، لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۳ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (جلد۱۲)، زیرِ اہتمام: پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص:۴۰۵، شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۵ء

۲۴ تاریخ الامم والملوک (تاریخِ طبری)، اردو ترجمہ: ابوجعفر محمد بن جریر طبری، مترجم: سید محمد ابراہیم ندوی، جلد دوئم (حصہ اول) ص: ۴۳۸ تا ۴۳۹، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۳ء

۲۵ ایضًا، ص:۴۳۹

۲۶ ایضًا، ص:۴۵۰

۲۷ ایضًا، ص:۴۴۹

۲۸ تقویم ہجری وعیسوی، مرتب: ابوالنصر محمد خالدی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۴ء

۲۹ The Islamic Review (February 1969)، مضمون کا عنوان: The "NASJ"، مصنف: ڈاکٹر محمد حمیداللہ، The Islamic Review, 18, Eccleston Square, London, S.W.1 England، ۱۹۶۹ء

۳۰ ایضًا، ص:۹

۳۱ ایضًا

۳۲ سیرت النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی (اضافہ وتکملہ) ص:۱۷۷ (حاشیہ)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۳۳ ایضًا، ص:۱۷۸ (حاشیہ)

۳۴ (i) The Islamic Review (February 1969)، مصنف: ڈاکٹر حمیداللہ،
(ii) محمد رسول اللہؐ، انگریزی سے اردو ترجمہ: مصنف: ڈاکٹر حمیداللہ، مترجم: خالد پرویز، ص:۳۱۳، (۱) بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور (۲) بیکن بکس، گلگشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۹ء

۳۵ الفاروق، مصنف: شبلی نعمانی، ص:۱۱۱، مدینہ پبلشنگ کمپنی، بندر روڈ، کراچی، ۱۹۷۷ء

۳۶ سیرت النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی (اضافہ وتکملہ)، ص:۱۸۱، مطبع معارف، اعظم گڑھ، بھارت، ۱۹۳۳ء

۳۷ ایضًا، سیرت النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی، ص: ۱۸۸، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۳۸ ایضًا، ص:۱۷۷

۳۹ ایضًا

۴۰ ایضًا

۴۱ ایضًا، ص:۱۷۸

۴۲ ایضًا، ص:۱۷۷

۴۳ تاریخ الامم والملوک (تاریخِ طبری) (اردو ترجمہ) (جلد دوئم، حصہ اول)، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، مترجم: سید محمد ابراہیم ندوی، ص:۴۳۹، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۳ء

۴۴ سیرت النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی، ص:۱۷۷، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۴۵ ایضًا، ص:۱۷۸

۴۶ The Islamic Review (February 1969)، مضمون کا عنوان: The "NASJ"، ص:۹، The Islamic Review, 18, Eccleston Square, London, S.W.1 England، ۱۹۶۹ء

۴۷۔ ایضًا

۴۸۔ ایضًا، ص:۱۰

۴۹۔ نقوش لاہور ((رسولؐ نمبر) جلد دوئم، ڈاکٹر محمد حمیداللہ، ص:۶۷۸، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۸۲ء

۵۰۔ سیرۃ خیرالانامؐ (مرکزی مقالہ سیرت)، ڈاکٹر محمد حمیداللہ، ص:۱۷۱، شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۹ء

۵۱۔ محمد رسول اللہؐ (انگریزی سے اردو ترجمہ)، مصنف: ڈاکٹر محمد حمیداللہ، مترجم: خالد پرویز، ص:۳۱۳، (۱) بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور (۲) بیکن بکس، گل گشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۹ء

۵۲۔ سیرت النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی، ص:۱۷۷، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۵۳۔ The Translation of the Meanings of Sahih Al Bukhari (Vol.V)، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، ص:۴۷۸، باب ''حجۃ الوداع'' Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore., ۱۹۷۹ء

۵۴۔ صحیح البخاری (جلد دوئم) (عربی متن بمعہ اردو ترجمہ)، مترجم: ظہور الباری اعظمی، ص:۷۸۳، باب ''حجۃ الوداع'' دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۸۵ء

۵۵۔ صحیح بخاری شریف مترجم (جلد دوئم) (عربی متن بمعہ اردو ترجمہ)، مترجم: علامہ وحیدالزماں، ص:۷۴۰، باب ''حجۃ الوداع'' مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

۵۶۔ (i) رسول کریمؐ..... کے آخری لمحات، مولانا ابوالکلام آزاد، ص:۳۸، مکتبہ جمال، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۸ء

(ii) رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص:۲۷۷، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

(iii) نبی رحمتؐ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف اور مترجم: سید ابوالحسن ندوی، ص:۵۴۵، مجلس نشریاتِ اسلام، ناظم آباد، کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

(iv) الرحیق المختوم (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف اور مترجم: مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص:۶۳۰، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

(v) Muhammad، مارٹن لنگز (ابوبکر سراج الدین)، ص:۳۴۰، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۵ء

۵۷۔ رسولِ رحمتؐ، مولانا ابوالکلام آزاد، بہ ترتیب و اضافہ مطالب: مولانا غلام رسول مہر، ص:۶۵۳، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور/کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

۵۸۔ الرحیق المختوم (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف اور مترجم: مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص:۶۱۴، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۵۹۔ ایضًا، ص:۶۱۵

۶۰۔ The Islamic Review (February 1969)، مضمون کا عنوان: The "NASJ"، ص:۱۰، The Islamic Review, 18, Eccleston Square, London, S.W.1 England، ۱۹۶۹ء

رسول کریم ﷺ کا وقتِ وصال

علامہ شبلی کے انتقال کے ساڑھے پانچ سال بعد، جب ۱۹۲۰ء کے وسط میں ان کی مرتب کردہ ''سیرت النبیؐ'' کی دوسری جلد شائع ہوئی تو اس کے ایک زیریں حاشیے میں سید سلیمان ندوی نے حیرت سے لکھا کہ ''کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخِ وفات کی مجھ کو کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی۔''[۱]

تاریخِ وفات کی حدیث تو نہیں مل سکی لیکن وقتِ وصال کی معروف حدیث موجود ہے اور ہے بھی رسول کریم ﷺ کے نوجوان ذاتی خادم حضرت اَنَسؓ بن مالک کی روایت سے صحیح بخاری میں، لیکن کسی مشہور سیرت نگار نے اپنی کتاب میں وقتِ وصالِ نبویؐ کے لیے اس مشہور حدیث میں بیان کردہ وقت نقل نہیں کیا۔

رسول کریم ﷺ کے وقتِ وصال کے بارے میں چار مختلف روایات ہیں۔ آغاز اس مشہور حدیث کی روایت سے کرتے ہیں۔

(۱) پہلی روایت: آخرالیوم (دن کی آخری گھڑیاں):

صحیح بخاری کی ''کتاب الاذان'' میں باب بعنوان ''اگر نمازی پر کوئی حادثہ واقع ہوجائے یا نمازی کوئی چیز دیکھے یا قبلے کی دیوار پر تھوک دیکھے'' میں حضرت اَنَسؓ بن مالک سے مروی یہ حدیث ان الفاظ میں درج ہے:

''وتوفی من آخر ذلک الیوم''[۲]

اردو ترجمہ: اور اسی دن شام کو آپؐ نے وفات پائی۔[۳]

انگریزی ترجمہ: He died in the last hours of that day [۴]

صحیح بخاری کی سب سے مشہور اور مستند شرح ''فتح الباری'' ہے، جو حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی نے نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی میں کئی ضخیم جلدوں میں لکھی۔ وہ شعبان ۷۷۳ھ/ فروری ۱۳۷۲ء میں پیدا ہوئے اور ذی الحج ۸۵۲ھ/فروری ۱۴۴۹ء میں وفات پاگئے۔ ۲۰۰۳ء میں دارالکتب العلمیۃ، بیروت نے اس ضخیم شرح کا جو جدید اڈیشن کئی جلدوں میں شائع کیا، اس کی آٹھویں جلد میں ''وتوفی من آخر ذلک الیوم'' کی شرح، (کتاب الاذان کی بجائے) ''کتاب المغازی'' میں درج ہے۔ کتاب المغازی کا یہ باب نمبر ۸۴ رسول کریم ﷺ کی علالت اور وفات سے متعلق ہے اور اس کی حدیث کا نمبر ۴۴۴۸ ہے، جس میں ''وتوفی من آخر ذلک الیوم'' کا قول تو درج نہیں لیکن حدیث کے نیچے اس قول کی تشریح ان الفاظ میں درج ہے:

عربی متن: ''قولہ'': (وتوفی من آخر ذلک الیوم) یخدش في جزم ابن اسحٰق بأنہ مات حین اشتد الضحی، ویجمع بینھما بأن أطلاق الآخر بمعنی ابتداء الدخول في أول النصف الثاني من النھار وذلک عند الزوال، واشتداد الضحی یقع قبل الزوال ویستمر حتی یتحقق زوال الشمس. وقد جزم موسی بن عقبۃ عن ابن شھاب بأنہ ﷺ مات حین زاغت الشمس، وکذا لأبي الأسود عن عروۃ، فھذا یؤیدالجمع الذي أشرت الیہ.[۵]

رواں اردو ترجمہ:

حضرت اَنَسؓ بن مالک نے کہا: (آں حضرت ﷺ اس دن کے آخر میں وفات پاگئے) حضرت اَنَسؓ بن مالک کا یہ قول ابنِ اسحٰق کی وثوق سے بیان کردہ اس بات کو مشکوک بنادیتا ہے کہ آپؐ کی وفات دن چڑھے ہوئی۔ ان دونوں باتوں میں مطابقت یوں کی

جاسکتی ہے کہ حضرت اَنَسؓ بن مالک نے (اپنے قول میں) ''آخر'' کا لفظ دن کے دوسرے آدھے حصے میں سورج کے داخل ہونے کے لیے استعمال کیا اور یہ زوالِ آفتاب کے قریب ہوتا ہے، جب کہ سورج کی انتہائی روشنی اور حدّت زوالِ آفتاب سے پہلے وقوع پزیر ہوتی ہے اور زوالِ آفتاب تک جاری رہتی ہے، اور موسیٰ بن عقبہ نے بھی ابنِ شہاب (زہری) کی روایت سے یہ بات وثوق سے کہی ہے کہ آپؐ نے زوالِ آفتاب کے بعد وفات پائی اور الابی اسود نے عروہ (بن زبیر) سے یہی روایت کی، لہٰذا اجتماعی تائید وہی ہے جس کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے۔

فتح الباری کی مندرجہ بالا حدیث (نمبر ۴۴۴۸) کا عربی متن (اور ترجمے) اردو اور انگریزی تراجم میں مندرجہ ذیل مقامات پر رقم ہے اور دونوں کتابوں میں حدیث کے متن میں اس قول کا ذکر نہیں۔

(الف) اردو ترجمہ (مترجم علامہ وحید الزماں)

صحیح بخاری شریف (مترجم) جلد دوئم، صفحہ ۷۶۵، حدیث نمبر: ۱,۵۶۴، کتاب المغازی، باب مرض النبیؐ و وفاتہٖ، ناشر: مکتبہ رحمانیہ، لاہور، سالِ اشاعت: ۱۹۹۹ء

(ب) انگریزی ترجمہ (مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان)

The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Vol:V), Page: 520, Kitabul Magazi, Chapter: The sickness of the Prophet and his death, Hadith No: 729, Publisher: Kazi Publications, Ganpat Road, Lahore, Year of Publication: 1979.

فتح الباری کے بیروت ایڈیشن (۲۰۰۳ء) میں وقتِ وصالِ نبویؐ کے اس قول کی شرح ''کتاب المغازی'' میں اور وہ بھی وہاں، کیوں طبع ہوئی، جہاں اس کے اوپر درج شدہ حدیث میں وقتِ وصالِ نبویؐ کے قول کا ذکر نہیں، اور ''کتاب الاذان'' میں جہاں حدیث میں

یہ قول درج ہے، اس کے نیچے یہ شرح کیوں درج، یا طبع نہیں کی گئی، اس پر محدثین کی توجہ چاہیے۔ یہ اس مضمون کا موضوع نہیں۔ فتح الباری کی یہ شرح اس مضمون میں درج کرنے کا مقصد قاری کی توجہ فتح الباری کی شرح کے ان آخری الفاظ پر دلانا ہے:

''اور موسیٰ بن عقبہ نے بھی ابنِ شہاب (زہری) کی روایت سے یہ بات وثوق سے کہی ہے کہ آپؐ نے زوالِ آفتاب کے بعد وفات پائی اور الابی اسود نے عروہ (بن زبیر) سے یہی روایت کی، لہٰذا اجتماعی تائید وہی ہے جس کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے۔''

مندرجہ بالا الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس تحریر کے آخری صفحات میں ہوجائے گا۔

(۲) دوسری روایت: سہ پہر:

سیرت النبیؐ (جلد دوئم) میں، علامہ شبلی نے آپؐ کی وفات کا وقت ''سہ پہر'' [۶] لکھا ہے، جس کی سند میں انھوں نے اسی صفحے پر یہ زیریں حاشیہ لکھا ہے:

''ابنِ اسحٰق نے سیرت میں لکھا ہے کہ وفات دوپہر کو ہوئی، لیکن حضرت اَنَسؓ بن مالک سے بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آخرِ یوم یعنی دوشنبہ (پیر) کے آخر وقت وفات فرمائی۔ حافظ ابنِ حجر نے دو روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ دوپہر ڈھل چکی تھی اور سہ پہر کا وقت تھا۔'' [۶]

حافظ ابنِ حجر کی شرح کا عربی متن اور رواں ترجمہ درج کیا جاچکا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ ابنِ اسحاق نے لکھا ہے کہ وفات دوپہر کو ہوئی، شبلی کا یہ بیان یہ مکمل طور پر درست نہیں۔ ابنِ اسحاق نے ''**اشتد الضحیٰ**'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ''الضحیٰ'' کے مختلف معانی پر اگلے صفحات میں تفصیلی بات کی گئی ہے۔ فی الحال اتنا لکھنا کافی ہے کہ ''**اشتد الضحیٰ**'' کے معنی زیادہ تر ''دن چڑھے'' کیے گئے ہیں۔

ثانیاً علامہ شبلی نے وقتِ وصالِ نبویؐ ''سہ پہر'' بتایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ''سہ پہر'' کے کیا معنی یا مطلب ہے؟

''سہ'' اور ''پہر'' دونوں فارسی زبان کے الفاظ ہیں۔ فارسی زبان میں لفظ ''سہ'' بہت سے فارسی الفاظ کے پہلے استعمال ہوا ہے، لیکن ''سہ پہر'' کا مرکب لفظ مروج اور مستند ''فارسی-انگریزی'' یا ''فارسی-اردو'' لغات میں نظر نہیں آتا۔ سہ پہر کا لفظ اردو بول چال میں عام استعمال ہوتا ہے لیکن اردو کی قدیم معیاری لغت ''فرہنگ آصفیہ'' میں بھی نظر نہیں آتا، تاہم ۱۹۹۱ء میں شائع ہونے والی ''اردو لغت بورڈ'' کراچی کی ''اردو لغت (تاریخی اصول پر)'' کی بارھویں جلد کے صفحہ ۲۴۲ پر اس کے معنی یہ دیئے گئے ہیں: ''دوپہر کے بعد اور شام سے پہلے کا وقت۔'' ماہ جون میں یہ دورانیہ دوپہر بارہ بجے کے بعد سے چھے بجے تک ہوسکتا ہے۔ یہ ایک خاصا لمبا دورانیہ ہے اور وقتِ وصالِ نبویؐ کے لیے ''سہ پہر'' کا لفظ پڑھ کر ایک عام قاری کے ذہن میں یہ خیال آنا عین ممکن ہے کہ ۸/جون (۶۳۲ء) کے طویل اور گرم دن رسول کریم ﷺ کا وصال نمازِ عصر کے لگ بھگ ہوا ہوگا۔ عام قاری کی بات چھوڑیں، کیمبرج یونیورسٹی سے ۱۹۶۲ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری یافتہ ایک عربی دان عالم نے تحریر کیا ہے آپ کا وصال ''عصر کے بعد'' ہوا۔ سہ پہر کے اس تاثر کو زائل کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ نہ اس کی کوئی سند ہے، اور نہ ہی حافظ ابنِ حجر نے فتح الباری میں جو تطبیق دی ہے، اس کے معنی یا مطلب ''عصر کے بعد'' ہوسکتے ہیں۔ آپؐ کے بارے میں قیاس آرائیوں سے گریز کرنا چاہیے۔

(۳) تیسری روایت: اشتدالضحا (زوالِ آفتاب سے پہلے؟):

یہ روایت عربی، اردو اور انگریزی کی مختلف کتابوں میں ان الفاظ میں درج ہے:

	سند
(۱) السیرۃ النبویہؐ [۷] از ابنِ ہشام (عربی متن): "اشتدالضحا"	نہیں دی
// سیرت النبیؐ [۸] از ابنِ ہشام (عربی سے اردو ترجمہ): ''چاشت کا وقت خاصا ہوگیا۔''	ایضًا

(۲) رحمۃ للعالمینؐ [۹] از قاضی محمد سلیمان منصور پوری: ''چاشت''	صخرة النهار تاريخ ابو الفداء
(۳) رسول کریمؐ اور خلفائے راشدین کے آخری لمحات [۱۰] از مولانا ابوالکلام آزاد: ''چاشت''	نہیں دی
(۴) الرحیق المختوم از صفی الرحمٰن مبارک پوری (عربی متن): [۱۱] "اشتدت الضحی"	ایضًا
// الرحیق المختوم از صفی الرحمٰن مبارک پوری (اردو ترجمہ): [۱۲] ''چاشت کی شدت کا وقت''	ایضًا
// الرحیق المختوم از صفی الرحمٰن مبارک پوری (انگریزی ترجمہ): [۱۳] "High Morning Time"	ایضًا
(۵) The Life of Muhammad از ابنِ اسحاق (عربی سے انگریزی ترجمہ): [۱۴] "Heat of Noon"	ایضًا

(۴) چوتھی روایت: زاغت الشّمس (زوالِ آفتاب کے بعد):

یہ روایت عربی اور اردو کی مختلف کتابوں میں ان الفاظ میں درج ہے:

	سند
(۱) مغازی [۱۵] رسول اللہ ﷺ لعروہ بن الزبیرؓ (بروایت ابی الاسود اعنہ) (عربی متن) (یعنی حضرت عروہؓ بن زبیرؓ کی روایت جو (یتیم عروہ) ابی الاسود نے کی: ''زاغت الشّمس''	حضرت عروہؓ بن زبیرؓ
(۲) ایضًا [۱۵] (ابن شہاب (الزہری) کی روایت جو موسیٰ بن عقبہ نے کی: ''زاغت الشّمس''	ابن شہاب الزہری

(۳) کتاب المغازی[۱۶] از محمد بن عمر بن واقدی (عربی متن): نہیں دی
''زاغت الشّمس''

(۴) طبقات الکبیر[۱۷] از محمد بن سعد (عربی متن): ''زاغت ایضًا
الشمس''

〃 طبقاتِ ابنِ سعد [۱۸] از محمد بن سعد (عربی سے اردو ایضًا
ترجمہ): ''آفتاب ڈھل چکا تھا۔''

(۵) نبی رحمتؐ[۱۹] از مولانا سید ابوالحسن ندوی: ''زوال کے بعد''☆ ایضًا

☆ (زیریں حاشیئے میں مولانا ندوی نے لکھا ہے کہ ''بعض روایات میں ضحیٰ اور ضحوہ آتا ہے، جو چاشت کا وقت ہے۔'' قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا نے اس کے ساتھ یہ نہیں لکھا کہ ایک روایت میں، جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے، ''آخر الیوم'' کی بھی روایت ہے)

اب تک جو لکھا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ''زاغت الشّمس'' کی روایت پہلی صدی ہجری میں، ''اشتد الضحا'' کی روایت دوسری صدی ہجری میں، ''آخر الیوم'' کی روایت تیسری صدی ہجری میں اور ''سہ پہر'' کی روایت چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی ہجری میں ضبطِ تحریر میں آئیں۔

ذیل میں پہلی دوسری اور تیسری صدی ہجری کی روایات کا مختصر جائزہ مختصر تبصروں کے ساتھ پیش ہے۔

پہلی صدی ہجری:

رسول کریم ﷺ کے وقتِ وصال کی سب سے پہلی روایت جو ضبطِ تحریر میں آئی وہ ''زاغت الشّمس''، یعنی زوالِ آفتاب کے بعد کا وقت ہے۔ یہ روایت حضرت عروہؒ بن زبیرؓ بن العوام (۲۲ھ۔۹۴ھ) سے منسوب ہے۔ وہ حضرت زبیرؓ اور حضرت اسماؓ بنت ابوبکرؓ کے چھوٹے بیٹے، اور حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا سالِ وفات ۵۸ھ[۲۰] بتایا

جاتا ہے۔ اس طرح حضرت عروہؒ کی پیدائش اور حضرت عائشہؓ کی وفات کے درمیان ۳۶ سال کا لمبا وقفہ ہے۔ حضرت عروہؒ نے حضرت عائشہؓ سے سن کر بہت سی احادیث جمع کر لیں۔ انھوں نے اپنے والدین، حضرت علیؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی احادیث روایت کی ہیں۔[۲۱]

حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت اسماؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے بہتر کون جا سکتا تھا کہ رسول کریم ﷺ کا وصال کس وقت ہوا۔ اس قابلِ احترام خاندانی پسِ منظر کے علاوہ، حضرت عروہؒ کا شمار نہ صرف مدینے کے سات عظیم فقہا میں ہوتا تھا بلکہ وہ ایک عظیم محدث بھی مانے جاتے تھے۔[۲۲] ان سے منسوب روایت ''زاغت الشّمس'' کا تفصیلی ذکر اگلے صفحات میں ہے۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے وسط:

اس دور کے تین مشہور سیرت نگاروں کے نام یہ ہیں:

(۱) عبداللہ بن شہاب الزہری (۵۰ھ۔۱۲۴ھ)

(۲) موسیٰ بن عقبہ (۵۵ھ۔۱۴۱ھ)

(۳) محمد بن اسحٰق (۸۵ھ۔۱۵۱ھ)

دوسری صدی ہجری:

اس دور کے دو معروف سیرت نگار یہ ہیں:

(۱) محمد بن عمر واقدی (۱۳۰ھ۔۲۰۷ھ)

(۲) ابنِ ہشام (نامعلوم۔۲۱۳ھ)

عبداللہ بن شہاب الزہری اپنی علمیت کی وجہ سے اس لقب سے مشہور تھے، جس کا مترادف اردو میں علامہ ہوگا۔ وہ حضرت عروہؒ بن زبیرؓ کے عزیز شاگرد، اور ان ہی کی طرح ایک عظیم محدث بھی تھے۔ الزہری نے حضرت عروہؒ بن زبیرؓ سے بہت سی احادیث کی راویت کی

ہے۔ رسول کریم ﷺ کے مغازی پر ان کی کتاب پہلی صدی ہجری کے اختتام پر لکھی گئی، جو اب ناپید ہے۔[۲۳]

موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق (ابنِ اسحاق) دونوں عبداللہ بن شہاب الزہری کے شاگردانِ رشید تھے۔ موسیٰ بن عقبہ نے سیرۃ رسول اللہ ﷺ کے لیے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی کتابوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا، یہ کتابیں حضرت عبداللہ بن عباس کا غلام، موسیٰ بن عقبہ کے پاس رکھوا گیا تھا۔[۲۴] موسیٰ بن عقبہ نے آخری عمر میں کتاب المغازی تصنیف کی، جو دراصل ان کے استاد عبداللہ بن شہاب زہری کی کتاب ''المغازی'' کا مثنیٰ ہے، جس کو انھوں نے آخری عمر میں مزید تحقیق کے بعد مرتب و مدون کیا۔[۲۵] ایک قول کے مطابق ''زہری سے روایت کی ہوئی، موسیٰ بن عقبہ کی کتاب، مغازی کی سب سے صحیح کتاب ہے۔''[۲۶] موسیٰ بن عقبہ کی ''مغازی'' بھی اب ناپید ہے۔ اس کے اقتباسات بعض مستند کتابوں میں ملتے ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ کی ''مغازی'' کو امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے فقہا اور فتح الباری کے مؤلف حافظ ابنِ حجر جیسے علما نے بہت اہمیت دی ہے۔[۲۷] امام مالکؒ نے ان کی مغازی کو ''اصح المغازی'' کہا اور یہی بات سات صدیوں بعد حافظ ابنِ حجر نے دہرائی۔[۲۸] ان کی ''مغازی'' کے اقتباسات کو محققین، جن میں مغربی مستشرقین بھی شامل ہیں، آج بھی بہت اہمیت دیتے ہیں، چنانچہ ۱۹۵۵ء میں جب اکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے The Life of Muhammad شائع کی، تو ایڈیٹر الفرڈ گیوم نے اپنے ابتدائی نوٹ کے صفحات نمبر ۴۳ سے ۴۷ تک موسیٰ بن عقبہ کی گم شدہ کتاب کے انیس اقتباسات کا انگریزی ترجمہ شامل کیا۔[۲۹]

موسیٰ بن عقبہ کی طرح الزہری کے دوسرے شاگرد محمد بن اسحٰق نے رسول کریم ﷺ کی سوانحِ حیات لکھی۔ یہ آپؐ کی پہلی مفصل سوانح حیات ہے، جس میں الزہری کے حوالے سے کئی روایات درج ہیں۔ تاریخ میں ابنِ اسحٰق کا بہت بڑا نام ہے لیکن علمِ حدیث میں وہ اپنے استاد زہری کا مقام نہ پاسکے اور حضرت عروہؓ بن زبیرؓ کا مقام پانا، جو ابنِ اسحٰق کے استاد کے استاد تھے، تو ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

ابنِ اسحٰق کی کتاب کا پورا نام ''کتاب المبتداء والمبعث والمغازی'' ہے۔ پیدایش کے تقریباً تیس سال بعد تک وہ مدینے میں رہایش پزیر رہے اور اس دوران میں بہت محنت، محبت اور یک سوئی سے آپؐ کے بارے میں ہر ممکنہ ماخذ سے مواد جمع کرتے رہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ انھوں نے اپنی ضخیم کتاب تیس سال کی عمر میں مدینے میں مکمل کر لی تھی، لیکن ایسا ہونا مشکل نظر آتا ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ انھوں نے اپنی ضخیم کتاب کا ابتدائی حصہ، یا اس کا بڑا حصہ، مدینہ چھوڑنے سے پہلے لکھ لیا ہو۔

مدینے سے وہ تیس سال کی عمر میں، سکندریہ (مصر) آئے اور اگلے بیس سال مصر، ایران اور عراق میں گزارے، جہاں انھوں نے مختلف اوقات میں، مختلف شاگردوں کو، جن کی تعداد چودہ تھی، اپنی کتاب کا املا کرایا۔ ان چودہ شاگردوں میں جس شاگرد کا خصوصی مقام ہے، ان کا نام زیاد بن عبداللہ بکائی ہے۔

ایک قول کے مطابق ''سیرتِ نبویؐ سے بکائی کے عشق اور شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اس کے حصول کے لیے اپنا گھر بار فروخت کر کے ابنِ اسحٰق کے ساتھ ہو لیے اور ان کے ہمراہ گھومتے رہے تا آں کہ ان سے مغازی کی سماعت مکمل کر لی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی سماع کردہ روایت کو زیادہ سے زیادہ مستند بنانے کے لیے (ابنِ اسحٰق سے) اس کی دوبارہ سماعت کی۔ اسی وجہ سے ان (بکائی) کی روایت کو سیرتِ ابنِ اسحٰق کی دوسری روایتوں پر فوقیت حاصل ہے۔''

ابنِ اسحٰق کی یہ کتاب آٹھویں صدی ہجری تک موجود تھی۔ اس دوران میں اس کی شرحیں لکھی گئیں، خلاصے مرتب ہوئے۔ حتیٰ کہ اسے منظوم بھی کیا گیا۔ پھر یہ کتاب ایسے غائب ہوئی (جس کی وجہ آگے درج ہے) کہ آج اس کا کوئی ایک ایسا نسخہ موجود نہیں جو بیک وقت مستند اور مکمل ہو۔

ابنِ اسحٰق کی کتاب کی اشاعت کے تقریباً نصف صدی بعد، ابنِ ہشام نے ان کی کتاب کو بہت محنت سے ایڈٹ کیا اور درج ذیل وجوہات کی بنا پر، ایڈیٹنگ کے دوران، ابنِ اسحٰق کی کتاب کے بعض حصوں کو کتاب سے خارج کر دیا:

(۱) ان کے مضامین کا رسول کریم ﷺ کی حیات اور سیرت سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔

(۲) ان سے کسی مسئلے کی تشریح نہیں ہوتی تھی۔

(۳) ان کا ذکر لوگوں کی دل آزاری کا سبب بن سکتا تھا۔

(۴) وہ اشعار جو یا تو مستند نہیں تھے، یا مستند تو تھے لیکن ہجو اور فحش کلامی پر مبنی تھے۔

اس ایڈیٹنگ کے بعد، ابنِ ہشام نے ابنِ اسحٰق کے متن کے کئی حصوں پر حواشی اور تعلیقات لکھیں۔ اب لوگوں کو ابنِ اسحٰق کی ضخیم کتاب کا ایک ایڈٹ کیا ہوا، تلخیص شدہ اور اضافہ شدہ اڈیشن دستیاب ہوگیا، جس کا نام ابنِ ہشام نے ''السیرۃ النبویۃ'' رکھا اور ابنِ اسحٰق کی کتاب کے منظر سے غائب ہونے کی بڑی وجہ یہی ہوسکتی ہے۔

۱۹۳۷ء/ ۱۳۵۵ھ میں، ''السیرۃ النبویۃ'' کا جدید اڈیشن، چار جلدوں میں، قاہرہ سے شائع ہوا، جسے مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شبلی نے مرتب کیا تھا۔ ایک انگریز مستشرق الفرڈ گیوم نے قاہرہ ایڈیشن کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۵۵ء میں اکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن نے اسے The Life of Muhammad کے عنوان سے شائع کیا۔ انگریزی ترجمے کے سرورق پر لکھا ہے کہ یہ کتاب ابنِ اسحٰق کی ''سیرت رسول اللہؐ'' کا ترجمہ ہے، جب کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ صرف ایک حد تک یہ بات درست ہے جس کی تشریح ذیل میں درج ہے۔

انگریز مترجم نے ابنِ ہشام کی ''السیرۃ النبویۃ'' کو ابنِ اسحٰق کی ''سیرت رسول اللہؐ'' بنانے کے لیے یہ اہتمام کیا کہ ابنِ ہشام نے ادبی دیانت کا ثبوت دیتے ہوئے، ''السیرۃ النبویۃ'' میں جن باتوں کا اضافہ، فقرے کے آغاز پر، اپنا نام لکھ کر کیا تھا، الفرڈ گیوم نے انھیں ''السیرۃ النبویۃ'' کے متن سے نکال کر ترجمے کے آخر میں ضمیمے کے طور پر درج کردیئے اور سرِ آغاز میں لکھ دیا کہ یہ اضافے ابنِ ہشام کے ہیں۔ ان کی تعداد ۹۲۲ بنتی ہے۔ اس کے بعد ''السیرۃ النبویۃ'' کے متن کا جو حصہ باقی بچا، اس کا انگریزی میں ترجمہ کرکے اسے ابنِ اسحٰق کی ''سیرت رسول اللہؐ'' کا نام دے دیا (گو ابنِ اسحٰق نے اس نام سے کوئی

کتاب نہیں لکھی تھی) کیوں کہ اس بقیہ متن کا کلی انحصار اس املا پر تھا، جو زیاد بکائی نے، دوبار، ابنِ اسحٰق سے لی تھی اور یوں انگریزی ترجمے کا متن ابنِ اسحٰق کا ہے، ابنِ ہشام کا نہیں۔

The Life of Muhammad کے صفحہ ۶۸۲ پر آپؐ کے وصال کا وقت ان الفاظ میں درج ہے:

"The Apostle died with the heat of noon that day". [۳۰]

ابنِ ہشام کی ''السیرۃ النبویۃ'' میں درج شدہ متعلقہ عربی متن (جو ابنِ اسحٰق کا ہے) یہ ہے:

''فتوفی رسول اللّٰہ ﷺ حین اشتدالضحاء من ذلک الیوم'' [۳۱]

چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی میں مولانا غلام رسول مہر اور عبدالجلیل صدیقی نے مندرجہ بالا عربی فقرے کا ترجمہ ''سیرت النبیؐ'' (حصہ دوئم) میں، ان الفاظ میں کیا: [۳۲]

''پھر اسی دن جب چاشت کا وقت خاصا ہوگیا، تو آپؐ کی وفات ہوگئی''

معلوم ہوا کہ چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی میں، وقتِ وصالِ نبویؐ کے جو معروف انگریزی اور اردو تراجم قلم بند ہوئے، ان میں مترجمین کے سامنے ابنِ ہشام کا ایڈٹ کیا ہوا وہی عربی متن تھا، جو اوپر درج ہے۔ [۳۱] ''اشتدالضحا'' کا ترجمہ انگریزی میں "Heat of Noon"، اور اردو میں ''چاشت کا وقت خاصا ہوگیا'' کیا گیا۔

اب واقدی کا ذکر باقی رہتا ہے۔ انھوں نے دوسری صدی ہجری کے اواخر، یا تیسری صدی ہجری کے آغاز میں، اپنی ضخیم ''کتاب المغازی''، لکھی تو وقتِ وصالِ نبویؐ کو ان الفاظ میں بیان کیا: [۳۳]

''فتوفی رسول اللّٰہ حین زاغت الشمس''

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے زوالِ آفتاب کے بعد وفات پائی۔

اس طرح پہلی صدی ہجری کے اختتام پر، وقتِ وصالِ نبویؐ کے بارے میں صرف ایک روایت ''زاغت الشمس''، تھی اور دوسری صدی ہجری کے اختتام پر دو روایات

''زاغت الشّمس'' اور ''اشتدالضحا'' تھیں۔

تیسری صدی ہجری:

تیسری صدی ہجری کی تالیفات میں سے صرف دو کتب کے اقتباسات پیش ہیں:

(۱) طبقات الکبیر از محمد بن سعد (۱۶۸ھ۔۲۳۰ھ)

(۲) صحیح بخاری از امام محمد بن اسماعیل بخاری (۱۹۴ھ۔۲۵۶ھ)

(۱) طبقات الکبیر:

اگرچہ محمد بن سعد کو ''کاتبِ واقدی'' کے لقب سے پکارا جاتا ہے لیکن ان کی روایات اپنے استاد واقدی سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ وقتِ وصالِ نبویؐ کے بارے میں، استاد اور شاگرد کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ محمد بن سعد نے اپنی ضخیم ترکتاب ''طبقات الکبیر'' میں اس موضوع پر لکھا:

''**وھو یموت فتوفی ﷺ یحبھا ویرضاھا حین زاغت الشمس**....''[۳۴]

بیسویں صدی عیسوی میں، عبداللہ العمادی نے اپنے اردو ترجمے بعنوان ''طبقاتِ ابن سعد'' میں اس فقرے کا یہ ترجمہ کیا:

''.....جب کہ آفتاب ڈھل چکا تھا، آپؐ کی وفات ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ آپؐ پر ایسی رحمت نازل کرے جس سے آپؐ خوش ہوں اور جسے آپؐ پسند کریں۔''[۳۵]

(۲) صحیح بخاری:

تیسری صدی ہجری میں، جب محدثین کی توجہ احادیث جمع کرنے کی بجائے، صحیح احادیث کا انتخاب کرنے پر مرکوز ہوئی، تو صرف نصف صدی کے دوران یکے بعد دیگرے احادیث کے چھے مجموعے مرتب ہوئے، جو آج تک ''صحاح ستہ'' یعنی چھے صحیح ترین مجموعہ ہائے

حدیث کے نام سے معروف ہیں۔ ان میں صحیح بخاری نہ صرف سب سے پہلے شائع ہوئی بلکہ ان چھے صحیح ترین کتابوں میں صحیح ترین قرار پائی۔ صحیح بخاری میں وقتِ وصالِ نبویؐ ''**آخر ذلک الیوم**''[۲] بتایا گیا، جو دوسری صدی ہجری میں ابنِ اسحٰق اور ابنِ ہشام نے ''**اشتدالضحا من ذلک الیوم**''[۷] لکھا تھا۔ **آخر ذلک الیوم** کا مطلب ''اس دن کا آخر'' ہوا، اور اس کے راوی رسول کریم ﷺ کے ذاتی نوجوان خادم حضرت اَنسؓ بن مالک ہیں۔

صحیح بخاری کی بارہ صدیوں سے قائم مسلمہ اہمیت کے پیشِ نظر، اگلے صفحات میں صحیح بخاری سے چار احادیث کا عربی متن، ان کے انگریزی اور اردو ترجمے کے ساتھ پیش ہے۔ آغاز ''**آخر ذلک الیوم**'' والی حدیث سے کیا جاتا ہے۔

The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Vol:1), Pages: 402-403, Hadith No: 721, Translator: Dr. M. Mohsin Khan.

(۱) عربی متن (صفحہ ۴۰۲، ۴۰۳):

''**اخبرنی انس قال: ..... وتوفی من آخر ذلک الیوم**'' [۲]

(۲) انگریزی ترجمہ (صفحہ ۴۰۲):

"Narrated Anas.... He died in the last hours of that day". [۴]

(۳) اردو ترجمہ:

''اَنس بن مالک نے خبر دی کہ.....اسی دن شام کو آپؐ نے وفات پائی۔''[۳]

(اردو ترجمے کا ماخذ: صحیح بخاری شریف (مترجم)، جلد اول، ص:۳۸۱، حدیث نمبر:۷۱۷، مترجم: علامہ وحید الزماں)

تیسری صدی ہجری کے وسط میں مرتب ہونے والی صحیح بخاری کی ''آخر الیوم'' والی مندرجہ بالا روایت نہ تو پہلی صدی ہجری میں حضرت عائشہؓ کے بھانجے، حضرت اسماؓ کے بیٹے، حضرت علیؓ کی صحبت سے فیض یاب ہونے والے اور مدینے کے سات ممتاز ترین فقہا میں شمار ہونے والے حضرت عروہؒ بن زبیرؓ کی روایت کے مطابق ہے، نہ دوسری صدی ہجری میں

زہری، ابنِ اسحٰق، واقدی اور ابنِ ہشام کے، نہ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں ابنِ سعد کے، اور نہ چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی میں برِصغیر پاک و ہند کے چار مشہور سیرت نگاروں علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری اور سید ابوالحسن ندوی کے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان چار جید سیرت نگاروں نے ''آخرالیوم'' کو نظرانداز کر کے اور اس کے بجائے دن کے روشن اوقات بیان کر کے، روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ وہ ''آخرالیوم'' کی روایت کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس فہرست میں ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں۔

اب انتخاب دو قدیم روایات ''**اشتدالضحاء**'' اور ''**زاغت الشّمس**'' کے درمیان رہ جاتا ہے، اور ان کے معانی جاننے کے لیے قرآن اور حدیث سے بہتر سند کہاں مل سکتی ہے؟

(الف) اشتدالضحاء:

پہلے ''**اشتدالضحاء**'' کو لیں۔ یہ دو الفاظ ''**اِشتد**'' اور ''**الضحاء**'' پر مشتمل ہے۔ ''**اِشتدت**'' کا لفظ قرآن میں صرف ایک جگہ یعنی سورۃ ابراہیم (نمبر۱۴) کی آیت ۱۸ میں ہے۔ اس کے معنی تیزی، سختی، زور یا شدت ہیں۔ ''**الضحاء**'' کا لفظ قرآن میں تین مقامات پر، یعنی سورۃ اعراف (نمبر۷)، سورۃ طٰہٰ (نمبر۲۰) اور سورۃ الضحیٰ (نمبر۹۳) میں آیا ہے۔ اس لفظ کے دس اردو ترجمے اور پانچ انگریزی ترجمے، جو مشہور مترجمین نے بیسویں صدی میں کیے ہیں، نیچے درج ہیں:

نمبر شمار	مترجم	سورۃ اعراف (سورۃ ۷، آیت ۹۸)	سورۃ طٰہٰ (سورۃ ۲۰، آیت ۵۹)	سورۃ الضحیٰ (سورۃ ۹۳، آیت ۱)
	اردو تراجم:			
۱۔	مولانا اشرف علی تھانوی	دوپہر	دن چڑھے	دن کی روشنی
۲۔	مولانا ابوالکلام آزاد	دن دہاڑے	دن چڑھے	ترجمہ نہیں دیا

۳۔	ڈپٹی نذیر احمد	دن دہاڑے	دن چڑھے	چاشت
۴۔	مولانا امین احسن اصلاحی	دن دہاڑے	چاشت	چاشت
۵۔	سید قطب شہید	دن کے وقت	دن چڑھے	روزِ روشن
۶۔	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	دن کے وقت	دن چڑھے	روزِ روشن
۷۔	مفتی محمد شفیع	دن چڑھے☆	دن چڑھے	دھوپ چڑھتے وقت
	// ایضاً، (تفسیر میں)	☆ (تفسیر میں ''دوپہر'' لکھا ہے)	-	☆ (تفسیر میں ''دن کی روشنی'' لکھا ہے)
۸۔	مولانا احمد رضا خان بریلوی	دن چڑھے	دن چڑھے	☆ چاشت
	// ایضاً (تفسیر میں)	-	-	☆تفسیر میں درج ہے کہ ''بعض مفسرین نے فرمایا کہ دن مراد ہے۔''
۹۔	مولانا فتح محمد جالندھری	دن چڑھے	چاشت	آفتاب کی روشنی
۱۰۔	مولانا عبدالماجد دریابادی	دن چڑھے	دن چڑھے	دن کی روشنی
	انگریزی تراجم:			
۱۱۔	مولانا عبدالماجد دریابادی (انگریزی ترجمہ)	Daylight	Forenoon	Morning Brightness
۱۲۔	آربری	Daylight	High Noon	White Forenoon
۱۳۔	عبداللہ یوسف علی	Broad Daylight	Sun is well up	Glorious Morning
۱۴۔	محمد اسد	Broad Daylight	Sun is risen high	Bright Morning Hours
۱۵۔	پکتھال	Day Time	Sun has risen high	Morning Hours

مندرجہ بالا تراجم میں، ''ضحیٰ'' کے معنی زیادہ تر ''دن چڑھے'' کیے گئے ہیں، چند تراجم میں اس کا ترجمہ ''چاشت'' کیا گیا ہے، اور بعض ترجموں میں اس کے معانی ''دوپہر'' اور ''دن دہاڑے'' بھی درج ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ عربی کے بہت سے الفاظ کی طرح لفظ ''ضحیٰ'' کے بھی واحد متعین معنی نہیں۔ انگریزی تراجم ہوں یا اردو ترجمے، سورۃ اعراف، سورۃ طٰہٰ

اور سورۃ الضحیٰ میں اس لفظ کے ترجمے پر نظر ڈالیں تو کسی مترجم کا ترجمہ بھی تینوں سورتوں میں یکساں الفاظ میں نہیں ہے، گو اکثر اوقات ان مختلف الفاظ کا مفہوم مختلف نہیں، لیکن بعض اوقات مفہوم بھی مختلف ہے، اور یاد رہے کہ ان تراجم کے کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن کہیں بعد کے ترجمے میں تبدیلی، یا حاشیئے میں وضاحت، کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اگر ترجمے میں غلطی ہوتی تو بعد کے اڈیشنوں میں اس کی تصحیح یا وضاحت کر دی جاتی۔

''ضحیٰ'' کا ترجمہ اگر انگریزی تراجم میں کہیں Forenoon اور کہیں High Noon کیا گیا، تو اردو تراجم میں ایک ہی مترجم یعنی مولانا اشرف علی تھانوی نے جن کی قرآن فہمی، علمیت اور ثقاہت مسلم ہے، ''ضحیٰ'' کا ترجمہ سورۃ اعراف میں ''دوپہر''، سورۃ طٰہٰ میں ''دن چڑھے'' اور سورۃ الضحیٰ میں ''دن کی روشنی'' کیا۔ ''دن چڑھے'' کو ''ایک پہر'' تو کہا جا سکتا ہے لیکن ''دوپہر'' نہیں۔ یہ مترجم کا سہو نہیں بلکہ لفظ ''ضحیٰ'' کے معانی کی وسعت ہے، جس میں دن اور دوپہر بھی شامل ہیں اور دن چڑھے کا وقت بھی۔

یہ تو ''ضحیٰ'' کے معنی ہو گئے لیکن جب ''ضحیٰ'' سے پہلے ''اشتد'' کا لفظ بھی لگا ہو اور وصال کا وقت ''اشتدالضحاء'' بتایا گیا ہو، تو ''اشتد'' کا لفظ یا تو دوپہر کی شدت کو ظاہر کرتا ہے، یا ''دن'' کی سختی کو، جو ''دن چڑھے'' کے وقت نہیں ہو سکتی۔

یہاں ایک اور اہم نکتے کا ذکر ہو جائے۔ ''زاغت الشّمس'' کی روایت کا آغاز، پہلی صدی ہجری میں، حضرت عروہؒ بن زبیرؓ سے ہوا۔ ان کے دو مشہور شاگرد ابوالاسود اور زہری تھے۔ ابوالاسود نے حضرت عروہؒ بن زبیر سے ''زاغت الشّمس'' کی روایت کی۔ زہری نے حضرت عروہؒ بن زبیرؓ سے ''زاغت الشّمس'' کی روایت نہیں کی، بلکہ زہری نے (موجودہ معلومات کی بنا پر) اپنے طور پر ''زاغت الشّمس'' کی روایت کی ہے۔ اگر حضرت عروہؒ بن زبیرؓ نے اپنے ایک شاگرد (ابوالاسود) سے یہ روایت کی، تو دوسرے شاگرد رشید (زہری) سے کیوں نہیں کی؟ اگر محققین کسی ایسی مصدقہ تحریری روایت کا پتہ چلا لیں جہاں حضرت عروہؒ بن زبیرؓ نے زہری سے بھی روایت کی ہو تو حضرت عروہؒ بن زبیرؓ، ابن شہاب زہری اور موسیٰ بن

عقبہ کے درمیان مسلسل روایت کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جائے گا۔

اب اسی طرح آگے چلتے ہیں۔ علامہ زہری کے دو مشہور ترین شاگرد موسیٰ بن عقبہ اور ابنِ اسحٰق تھے۔ ایک شاگرد یعنی موسیٰ بن عقبہ نے اپنے استاد علامہ زہری سے ''زاغت الشّمس'' کی ہی روایت کی جس کا حوالہ حافظ ابنِ حجر نے، نویں صدی ہجری میں فتح الباری میں دیا۔ علامہ زہری کے دوسرے مشہور شاگرد ابنِ اسحٰق نے علامہ زہری یا کسی اور ہستی کا حوالہ دیئے بغیر، بلاسند، ''**اشتدالضحاء**'' کے الفاظ استعمال کیے۔ کیوں؟

اب قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ ''زاغت الشّمس'' کے لیے تو تین نسلوں پر مشتمل روایات ہیں، اور رواۃ بھی پہلی صدی ہجری کے حضرت عروہؒ بن زبیرؓ، اور پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے وسط کے عبداللہ بن شہاب الزہری اور موسیٰ بن عقبہ ہیں۔ ابنِ اسحٰق یا ابنِ ہشام کی روایت ''**اشتدالضحاء**'' کی سند کیا ہے؟ اس سند کا ذکر نہ The Life of Muhammad میں ہے، نہ ''**السیرۃ النبویۃ**'' میں۔

وقتِ وصالِ نبویؐ کوئی ایسی غیر اہم بات تو نہ تھی کہ رسول کریم ﷺ کے وصال کے ڈیڑھ سو سال بعد، آپؐ کی پہلی مفصل سوانحِ حیات میں، آپؐ سے بے پناہ محبت رکھنے والے ایک مسلمان مؤرخ کے قلم سے بلاسند اور بلاتحقیق لکھ دی جاتی جب کہ سند اور تحقیق دونوں کے لیے ابنِ اسحٰق کے اپنے استاد اور مدینے کے سات فقہا میں سے ایک عظیم فقیہ اور عظیم محدث عبداللہ بن شہاب الزہری موجود تھے۔

جب کسی کے انتقال کا ذکر ہوتا ہے تو انتقال کے سال کا کبھی ذکر نہیں ہوتا (یہ ذکر مورخین کرتے ہیں، بات چیت میں نہیں ہوتا)، اسی طرح انتقال کے مہینے کا بھی بات چیت میں شاذ و نادر ذکر ہوتا ہے لیکن انتقال کے وقت کا اکثر ذکر ہوتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ۱۱ھ اور اس کے بعد، آپؐ کے عزیزوں اور صحابہ نے وقتِ وصال کا ذکر نہ کیا ہو؟

اگر عبداللہ بن شہاب الزہری نے بھی اپنے شاگرد ابنِ اسحٰق سے ''زاغت الشّمس'' کی روایت اسی طرح بیان نہیں کی، جیسے حضرت عروہؒ بن زبیرؓ نے اپنے شاگردِ

رشید عبداللہ بن شہاب الزہری سے مبینہ طور پر بیان نہیں کی، تو رسول کریم ﷺ کی پہلی اور ضخیم سوانحِ حیات لکھتے وقت ابنِ اسحٰق کو یہ اہم بات علامہ زہری سے پوچھ لینے میں کیا امر مانع تھا؟ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اگر علامہ زہری نے اپنے ذی قدر استاد حضرت عروہؒ بن زبیرؓ سے مبینہ طور زاغت الشّمس کی روایت نہیں کی، تب بھی علامہ زہری نے اپنے طور پر وہی روایت (زاغت الشّمس) کردی، جو ان کے استاد نے کی تھی۔ ابنِ اسحٰق نے تو اپنے استاد کی روایت کو برقرار رکھنے کی بجائے ایک نئی روایت (**اشتدالضحاء**) کردی، جو بلاسند ہے۔ یہ کیوں ہوا جب کہ وہ نہ صرف اپنے استاد بلکہ اپنے ہم عصر موسیٰ بن عقبہ سے یہ بات پوچھ سکتے تھے۔

حضرت عروہؒ بن زبیرؓ، عبداللہ بن شہاب الزہری اور موسیٰ بن عقبہ تینوں ''صاحب المغازی'' ہیں۔ حضرت عروہؒ، حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے اور ان کی پیدائش آپؐ کی وفات کے تقریباً دس سال بعد ہوئی۔ کیا ہم ان کی بات مانیں یا ابنِ اسحٰق/ ابنِ ہشام کی بلاسند روایت؟

اب لفظ ''چاشت'' پر غور کرلیا جائے، جو بیسویں صدی عیسوی میں قرآن کے بعض اردو تراجم اور چند کتب ہائے سیرت میں درج ہے۔ ''چاشت'' فارسی زبان کا لفظ ہے۔ طہران سے شائع شدہ ایک جدید اور مستند ''فارسی-انگریزی لغت'' میں، جس کا فارسی نام ''فرہنگ فارسی انگلیسی نوین'' [۳۶] ہے، چاشت کے یہ معانی دیئے گئے ہیں:

(۱) First of day (فارسی میں: اول روز)

(۲) Morning Time (فارسی میں: ھنگامِ صبح)

(۳) Middle hours of forenoon (فارسی میں: صبحانہ)

فارسی زبان سے یہ لفظ اردو میں داخل ہوا۔ اردو معانی بتانے کے لیے دو مستند لغات کا انتخاب کیا گیا ہے، ایک قدیم اور ایک جدید۔ قدیم لغت (۱۹۰۸ء) فرہنگِ آصفیہ ہے اور جدید لغت (۱۹۸۶ء) اردو لغت بورڈ کراچی کی ''اردو لغت۔ (تاریخی اصول پر)'' ہے۔

''فرہنگِ آصفیہ'' [۳۷] (جلد دوئم) میں، صفحہ ۹۲ پر، چاشت کے معانی یہ دیئے گئے ہیں:

(۱) پہر دن چڑھے کا وقت

(۲) چوتھائی دن گزرنے کا وقت

(۳) سورج نکلنے اور دوپہر کے درمیان کا وقت

''اردو لغت۔ (تاریخی اصول پر)'' [۳۸] (جلد ہفتم) میں، صفحہ ۲۷۶ پر، چاشت کے معانی یہ دیئے گئے ہیں:

(۱) پہر دن چڑھے کا وقت جب کہ آفتاب بلند ہوتا ہے، تقریباً نو بجے

(۲) طلوع اور دوپہر کے وسط کی ساعت

جب ''الرحیق المختوم'' کے عربی متن میں ''**اشتدت الضحیٰ**''، اس کے اردو ترجمے میں ''چاشت کی شدت کے وقت'' اور اس کے انگریزی ترجمے میں High Morning Time کے الفاظ استعمال کیے گئے، اور ماخذ کا ذکر نہیں کیا گیا، تو ان کا ماخذ درحقیقت ابنِ ہشام کی ''**السیرۃ النبویۃ**'' تھی، جس میں ''**اشتدالضحاء**'' کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ ''**اشتدالضحاء**'' اور ''**اشتدت الضحیٰ**'' کے حروف میں معمولی فرق ہے لیکن معنی میں نہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور قاضی سلیمان سلمان منصور پوری دونوں نے اپنی کتابوں میں وقتِ وصالِ نبویؐ کے لیے، شدت کا ذکر کیے بغیر، صرف ''چاشت'' کا لفظ لکھا۔ ظاہر ہے کہ ان فاضل سیرت نگاروں کا ماخذ ابنِ ہشام نہیں ہوسکتے۔ اگر ابنِ ہشام نہیں تو پھر کون ہے، یا ہیں؟ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا، اس لیے اس پر تبصرہ نہیں ہوسکتا۔ مولانا سلیمان سلمان منصور پوری نے متعلقہ صفحے کے زیریں حاشیئے میں، سند کے طور پر، صرف اتنا لکھا ہے: ''**صخرۃ النہار تاریخ ابو الفداء**'' [۳۹] جس سے اکیسویں صدی کے قاری کو مطلوبہ وضاحت حاصل کرنے میں مدد نہیں ملتی۔

مولانا غلام رسول مہر/عبدالجلیل صدیقی نے، ابنِ ہشام کی ''**السیرۃ النبویۃ**'' کا اردو ترجمہ کرتے وقت ''**اشتدالضحاء**'' کا ترجمہ ''چاشت کے خاصے وقت'' سے کیا، جو صفی الرحمٰن مبارک پوری کے ترجمے ''چاشت کی شدت کے وقت'' سے ملتا جلتا ہے۔

اس بارے میں سب سے حیرت ناک اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ جب لاہور کے

ایک خاصے جانے پہچانے اشاعتی ادارے ''ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ'' نے ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی کی ترتیب وتحقیق شدہ ''مغازی رسول اللہ ﷺ لعروۃ بن الزبیر'' (جس کا ذکر پچھلی سطور میں ہو چکا ہے) کا اردو میں ترجمہ کرانے کے لیے اس اشاعتی ادارے کے اپنے الفاظ میں ''پاکستان کے ممتاز عالم مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی'' کا انتخاب کیا، تو ان ''ممتاز عالم'' نے حضرت عروہؓ بن زبیرؓ کی ''مغازی'' میں وقتِ وصالِ نبویؐ کے لیے درج شدہ الفاظ ''زاغت الشّمس'' کا ترجمہ ''زوالِ آفتاب کے بعد'' کرنے کی بجائے، اس کے الٹ ''طلوعِ شمس کے بعد'' [۴۰] کر دیا۔ اس ترجمے کا پہلا اڈیشن ختم ہو گیا تو ۱۹۹۰ء میں اس کا دوسرا اڈیشن [۴۰] شائع ہوا۔ یہ اس بدیہی اور بنیادی غلطی کو دور کرنے کا بہترین موقع تھا۔ حیرت اور افسوس ہے کہ غلط ترجمہ برقرار رہا۔

گزشتہ ربع صدی کے دوران میں، جن ہزاروں اردو دان قاریوں نے اس ترجمے کو ایک حوالے کی مستند کتاب سمجھ کر پڑھا ہوگا، وہ آج تک یہ سمجھتے ہوں گے کہ اللہ کے آخری رسول ﷺ کا وصال طلوعِ شمس کے بعد ہوا، اور یہ کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سلیمان سلمان منصور پوری جیسے جید علما نے جب وقتِ وصالِ نبویؐ کے لیے ''چاشت'' کا لفظ استعمال کیا، تو قاری سمجھے گا کہ اس کی سند حضرت عائشہ کے بھانجے حضرت عروہؓ بن زبیرؓ ہیں۔ اب ''زاغت الشّمس'' پر غور فرمایئے۔

(ب) زاغت الشّمس:

۱۹۸۱ء/ ۱۴۰۱ھ میں، ریاض (سعودی عرب) سے، ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی نے، طویل تحقیق اور تقابل کے بعد، ایک کتاب شائع کی جس کا نام [۱۵] ہے: ''**مغازی رسول اللہ ﷺ لعروۃ بن الزبیر بروایت ابی الاسود اعنہ (النسخۃ المتخرجت)**''۔ عام فہم زبان میں، اسے رسول کریم ﷺ کے غزوات اور سیرت پر پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ کتاب تو ہو ہی نہیں سکتی، جو تیرہ سو سال پہلے، حضرت عروہؓ نے اپنے ہاتھ سے لکھی، یا اپنی زبان سے املا کرائی تھی لیکن یہ اس مخطوطے کی بعینہٖ نقل بھی نہیں ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے حضرت عروہؓ سے منسوب مغازی کے مختلف حصوں کو، بعد کے زمانوں کے مستند مخطوطوں میں درج شدہ عبارات سے، چھان پھٹک کر نکال کر، اور ان استخراج شدہ عبارات کا دوسرے قدیم مستند مخطوطوں سے مقابلہ کرنے، نیز ان کی تصدیق کرنے کے بعد، انھیں اپنی ایڈٹ کی ہوئی کتاب میں درج کر دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شکستہ تاریخی مینار کے مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے پتھر، ایک ایک کر کے احتیاط سے چنے جائیں، ایک جگہ جمع کیے جائیں اور پھر ٹوٹے ہوئے پتھروں کو جوڑ جوڑ کر، اور صحیح سالم پتھروں کو ان کی اصلی حالت میں ایک ایک کر کے اٹھا کر، گرے ہوئے مینار کو، ممکنہ حد تک، اس کی اصلی حالت میں کھڑا کر دیا جائے۔

اس بات کی وضاحت ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی کے اپنے الفاظ کے ترجمے میں پڑھیے۔ درج ذیل یہ دو اقتباسات اس طویل مقدمے کا حصہ ہیں، جو ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے اس کتاب کے آغاز میں لکھا ہے:

(ا) پہلا اقتباس:

''حضرت عروہؓ کے بعد جو (بھی) آیا، وہ نہ صرف آپ کی اس کتاب (مغازی) سے بلکہ دوسری کتابوں سے بھی متاثر ہوا۔ ان میں امام ابن شہاب الزہری اور موسیٰ بن عقبہ کے نام بڑے اہم ہیں..... (تاہم) ہمارے لیے جو چیز بڑی اہم ہے وہ ہے: ''مغازی موسیٰ بن عقبہ'' کی مناسبت ''مغازی عروہ بروایت ابی الاسود'' سے۔ بحث کرنے والے حضرات اور محدثین نے ''مغازی موسیٰ بن عقبہ'' کی بہت تعریف کی ہے اور اس کے اقتباسات (بہت سی) کتب میں موجود ہیں..... ہم نے چھان پھٹک کی تو یہ بات سامنے آئی کہ موسیٰ بن عقبہ کا اعتماد الزہری پر ہے..... یہ درحقیقت عروہ پر اعتماد ہے کیوں کہ الزہری کا مصدر ومنبع وہی (عروہ) ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ کی نصوص کا جب ہم ''مغازی عروہ بہ روایت ابی الاسود'' سے مقارنہ کرتے ہیں، تو عجیب اتفاقات نظر آتے ہیں اور یہ

اتفاقات فقرہ دو فقرے، صفحہ دو صفحے کے نہیں بلکہ دسیوں صفحات پر مشتمل ہیں۔''[۴۱]

(پہلا اقتباس ختم ہوا جس کے ترجمے میں لفظ ''مقارنہ'' کی بجائے ''مقابلہ'' ہوسکتا ہے)۔

''دسیوں صفحات پر مشتمل'' ان ''عجیب اتفاقات'' کو ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے کئی کئی صفحات پر مشتمل دو مثالیں ان دو درج ذیل عنوانات کے تحت دی ہیں، جن میں فقرہ دو فقرے، صفحہ دو صفحے نہیں بلکہ کئی کئی صفحات پر ''مغازی عروہ بہ روایت ابی الاسود'' کے الفاظ ''مغازی موسیٰ بن عقبہ'' میں دہرائے گئے ہیں۔ عنوانات یہ ہیں:

(۱) شعب بنو ہاشم میں بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کا دخول[۴۲]

(۲) (رسول کریم ﷺ کی پھپھی) عاتکہ کا (غزوۂ بدر کے متعلق) خواب[۴۳]

(۲) دوسرا اقتباس:

''میں (ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی) نے مختلف مصادر سے ''**ابن لهيعه عن ابى الاسود عن عروة**'' کی روایات جمع کیں اور ابتدا میں کوشش کی کہ محض اس سند سے روایات جمع کروں اور.....اس کتاب کا ستر فی صد مواد ان ہی اسناد سے جمع ہوا ہے۔ پھر.....میں نے ایسی روایات دیکھیں جو حضرت عروہ کے علاوہ موسیٰ بن عقبہ نے بھی ذکر کی ہیں۔ ان دو روایات کے بعد، جو روایات آئیں، ان کو ان کی روشنی میں جمع و مرتب کیا، یا صرف موسیٰ بن عقبہ کی روایت ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ ابوالاسود نے بھی (حضرت عروہ کی روایت کا) اسی انداز سے ذکر کیا ہے۔''[۴۴] (دوسرا اقتباس ختم ہوا)

یہ ہے وہ انداز فکر اور طرزِ تحریر جس کے مطابق ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے اپنی عربی کتاب کے صفحہ ۲۲۲ پر، یہ تاریخی فقرہ ''مرضِ موت رسول اللہ ﷺ'' کے زیرِ عنوان درج کیا، جس میں ان کا آغاز، اور انحصار، دونوں موسیٰ بن عقبہ پر ہیں:

''**وقال الحافظ: ''وقد جزم موسىٰ بن عقبه عن ابن شهاب بانهٗ صلى الله عليه وسلم مات حين زاغت الشمس وكذ الابى الاسود عن**

عروة'' (فتح الباری ۸:۱۴۴ وانظر ایضاً ۸:۱۴۶)[۴۵]

رواں ترجمہ: اور حافظ (ابن حجر) نے کہا: ''اور موسیٰ بن عقبہ نے بھی ابنِ شہاب (زہری) کی روایت سے یہ بات وثوق سے کہی ہے کہ آپؐ نے زوالِ آفتاب کے بعد وفات پائی اور الاابی اسود نے عروہ (بن زبیر) سے یہی روایت کی۔''

''(ماخذ: حافظ ابنِ حجر کی فتح الباری، جلد نمبر: ۸، صفحہ: ۱۴۴، اور جلد نمبر: ۸، صفحہ: ۱۴۶)''

اس تحریر کے ابتدائی صفحات میں ہم نے لکھا تھا کہ ''مندرجہ بالا الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس تحریر کے آخری صفحات میں ہو جائے گا۔''

امید ہے کہ اب یہ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ یہاں یہ اضافہ بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہی وہ اجتماعی تائید ہے جس کی طرف، اب سے چھے سو سال پہلے حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے یہ اضافی الفاظ لکھ کر مندرجہ بالا فقرے کو ختم کیا تھا: ''**فهذا يؤيد الجمع الذى اشرت اليه**'': ''لہٰذا اجتماعی تائید وہی ہے جس کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے۔''

اس فقرے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ روایت حضرت عروہؒ بن زبیرؓ سے شروع ہوئی، ان سے ان کے لے پالک شاگرد ''یتیم عروہ'' ابوالاسود نے روایت کی، جس کا تحریری ثبوت موجود ہے۔ اس کے بعد یہی بات علامہ ابن شہاب زہری سے موسیٰ بن عقبہ نے وثوق سے روایت کی، اور اس کا بھی تحریری ثبوت موجود ہے۔ دراصل موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی ان کے شیخ ابنِ شہاب زہری کی کتاب المغازی کا ثنیٰ ہے، جسے انھوں (موسیٰ بن عقبہ) نے آخری عمر میں، مزید تحقیق و تلاش کے بعد، مرتب و مدون کیا۔ اگر موسیٰ بن عقبہ کی کتاب علامہ زہری کی کتاب کا ثنیٰ ہے، اور موسیٰ بن عقبہ کی کتاب میں ''مغازی عروہ بہ روایت ابی الاسود'' کے دسیوں صفحات بھی، لفظ بہ لفظ، نظر آتے ہیں تو معلوم ہوا کہ مخرج و منبع و مصدر حضرت عروہؒ بن زبیرؓ ہیں، جن کی مغازی کی روایت، دوسروں کے علاوہ، ابوالاسود نے بھی کی۔

یہاں ابوالاسود اور حضرت عروہؒ بن زبیرؓ کے باہمی تعلق کا بھی مختصر ذکر ہو جائے۔ ابوالاسود کے والد ۷۳ھ کی جنگ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی طرف سے شریک تھے اور اسی

جنگ میں کام آ گئے۔ ان کے والد نے اپنی موت سے پہلے، اپنے اس بچے کو جس کا نام محمد تھا، حضرت عروہؒ کی کفالت میں دینے کی وصیت کی۔ حضرت عروہؒ نے اس وصیت کی ایسی پاسداری کی کہ محمد ''یتیم عروہ'' کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ اس گہری رفاقت اور قربت کی وجہ سے، یتیم عروہ نے حضرت عروہؒ سے ان کی کتاب المغازی کا علم حاصل کیا، اور بعد میں مصر میں جا کر اس کی روایت اس طرح کی کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق، حضرت عروہؒ کی المغازی کا نام، **''کتاب عروہ عن طریق ابی الاسود''** پڑ گیا اور اسے بہت سے محدثین نے نقل کیا۔ حافظ ابنِ حجر کی مثال اوپر دی جا چکی ہے۔

''زاغت الشّمس'' کی روایت رسول کریم ﷺ کے وصال کا وقت نہ گھنٹوں، منٹوں اور سیکنڈوں میں بتاتی ہے اور نہ بتا سکتی تھی، لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ جہاں **''اشتدالضحا''** میں وقت ''دوپہر'' ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا، وہاں ''زاغت الشّمس'' میں یہ وقت صرف ''زوالِ آفتاب کے بعد'' کا ہو سکتا ہے۔ اس لفظ کے معنی اور مفہوم مندرجہ ذیل اسناد سے مزید واضح ہو جائیں گے۔

ایڈورڈ ولیم لین کی ''عربی۔ انگریزی لغت''، ۱۸۶۳ء میں، آٹھ جلدوں میں، لندن سے شائع ہوئی۔ اس کی تیسری جلد میں، صفحہ ۲۷۱ پر، ''زاغت الشّمس'' کے یہ معنی دیئے گئے ہیں:

"The sun declined from the meridian so that the shade turned from one side to the other." [۴۶]

ترجمہ: آفتاب نصف النہار سے یوں زوال پزیر ہوا کہ اس کا سایہ ایک سمت سے دوسری سمت ہو گیا۔

یہ تو ڈیڑھ صدی پرانا ترجمہ ہوا۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ''زاغت الشّمس'' کے الفاظ کی تشریح کے لیے، ہمیں ڈیڑھ صدی پرانی لغت کی بجائے، ساڑھے گیارہ صدی قدیم ''صحیح بخاری'' سے رہنمائی مل رہی ہے۔ صحیح بخاری کے انگریزی ترجمے کے لیے، اس ترجمے سے مدد لی گئی ہے جس کے مترجم ڈاکٹر محمد محسن خان ہیں۔ یہ ترجمہ پہلے ۱۹۷۶ء۔ ۱۹۷۹ء کے

درمیان، لاہور سے، نو جلدوں میں شائع ہوا، اور پھر ۱۹۹۷ء میں دارالسلام نے ریاض اور لاہور سے نو جلدوں میں شائع کیا۔ اردو ترجمہ علامہ وحید الزماں کا ہے۔ ان تراجم سے تین احادیث لی گئی ہیں۔

(۱) پہلی حدیث:

(الف) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Vol:1), 1976, Page No:305, Hadith No:515, Translator: Dr. M. Mohsin Khan [۴۷]

(ب) صحیح بخاری شریف (مترجم)، جلد اول، صفحہ: ۳۰۵، حدیث: ۵۱۱، مترجم: علامہ وحید الزماں، (۱۹۹۹ء) [۴۸]

عربی متن (صفحہ: ۳۰۵)	اردو ترجمہ (صفحہ: ۳۰۵) [۴۸]	انگریزی ترجمہ (صفحہ: ۳۰۵) [۴۷]
باب: وقت الظهر عندالزوال	باب: ظہر کا وقت سورج ڈھلنے پر ہے۔	Chapter: The hour of Zuhur prayer is when the sun declines. (Just after mid-day)
وقال جابر: كان النبى صلى اللّٰه عليه وسلم يصلى بالهاجرة اخبرنى انس بن مالك ان رسول اللّٰه ﷺ خرج حين زاغت الشمس فصلى الظهر.	اور حضرت جابرؓ نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز پڑھتے دوپہر کی گرمی میں۔ حضرت انسؓ بن مالک نے خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ برآمد ہوئے سورج ڈھلے پر اور ظہر کی نماز پڑھائی۔	Jabir said: The Prophet (PBUH) used to offer the Zuhur prayers just after mid-day. Narrated Anas Bin Malik: Allah's Apostle (PBUH) came out as the sun declined at mid-day and offered the Zuhur prayer.

(۲) دوسری حدیث:

اگلی حدیث مندرجہ بالا اردو ترجمے کی جلد اول میں نمبر ۵۱۲، [۴۹] اور انگریزی

ترجمے کی جلد اول میں نمبر ۵۱۶،[۵۰] پر، ان الفاظ میں ہے:

عربی متن	اردو ترجمہ (صفحہ ۳۰۵)[۴۹]	انگریزی ترجمہ (صفحہ ۳۰۶)[۵۰]
وکان یصلی الظهر اذا زالت الشمس.	اور ظہر اس وقت پڑھتے جب سورج ڈھل جاتا۔	He used to offer the Zuhr prayers as soon as the sun declined.
(صحیح بخاری)	(مترجم: علامہ وحیدالزماں)	(مترجم: ڈاکٹر محسن خان)

(۳) تیسری حدیث:

نمازِ ظہر کی جلد ادائیگی کے بارے میں، یہ حدیث اردو ترجمے کی جلد اول میں نمبر ۵۸۶،[۵۲] اور انگریزی ترجمے کی جلد اول میں نمبر ۵۸۹[۵۱] پر ہے:

عربی متن	اردو ترجمہ (صفحہ ۳۳۰)[۵۲]	انگریزی ترجمہ (صفحہ ۳۳۹)[۵۱]
عن ابو هريره ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال..... ولو يعلمون مافى التهجير لاسبقتو اليه.	ابو ہریرہ نے خبر دی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: .....اگر (لوگ) جانتے جو (ثواب) نمازِ ظہر کے لیے سویرے جانے میں ہے، تو ایک دوسرے سے آگے بڑھتے۔	Narrated Abu Huraira: Allah's Apostle (PBUH) said..... if they knew the reward of Zuhur prayer (in the early moments of its stated time) they would race for it (go early).
(صحیح بخاری)		

پہلی اور دوسری حدیث میں نمازِ ظہر کے وقت کے لیے، سورج کے ''زاغت'' یا ''زالت'' کی پوزیشن میں آنے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جب کہ تیسری حدیث میں، نمازِ ظہر کی ادائیگی سورج ڈھلتے ہی کر لینے کی فضیلت کے لیے رسول کریم ﷺ کا فرمودہ سند کے طور پر درج ہے۔

اکیسویں صدی عیسوی کا قاری ان احادیث پر غور کرے، پھر حافظ ابنِ حجر کی طرح اس پر غور کرے کہ ''اشتدالضحاء'' کا مطلب ''زاغت الشّمس'' کا اول وقت بھی نکل سکتا ہے، اور آخر میں اس واقعاتی شہادت پر غور کرے کہ جس دن (پیر)، رسول کریم ﷺ کا وصال ہوا، اور یہ دن تاریخ کا ایک اہم ترین دن ہے، اس روز فجر کی باجماعت نماز کا ذکر تاریخ اور

حدیث دونوں میں خاصی تفصیل سے ملتا ہے (اور واضح رہے کہ تاریخ حدیث سے پہلے لکھی گئی) لیکن اس کے بعد، پیر کے روز نمازِ ظہر سے نمازِ عشا تک، باجماعت نماز کا ذکر نہ تاریخ میں ہے، نہ حدیث میں۔ جب یہ پورا دن گزر جاتا ہے تو اگلے روز منگل کو، فجر کی باجماعت نماز کا دوبارہ ذکر ملتا ہے، جب پہلے خلیفہ کی حیثیت سے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

اکیسویں صدی عیسوی کا قاری یہ بھی ذہن میں رکھے کہ حضرت عروہؓ بن زبیرؓ کی روایت (زاغت الشّمس) پہلی صدی ہجری کی ہے۔ ان کی ولادت اور رسول کریم ﷺ کے وصال میں صرف تقریباً دس سال کا فرق ہے اور ان کا انتقال پہلی صدی ہجری ختم ہونے سے پہلے ہوا۔ ابنِ اسحٰق/ ابنِ ہشام کی روایت دوسری صدی ہجری کی ہے۔ اگر دوسری باتیں مختلف نہ ہوں تو یہ تاریخی اصول ہے کہ قریب العہد روایت کو بعید العہد روایت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ حضرت عروہؓ صرف قریب العہد ہی نہیں بلکہ ان کے خانوادے کو رسول کریم ﷺ سے جو قربت تھی، وہ بھلا ابنِ اسحٰق یا ابنِ ہشام کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ حضرت عروہؓ کی پہلی صدی ہجری کی روایت کو علامہ ابنِ شہاب زہری اور موسیٰ بن عقبہ جیسے جید صاحبانِ ''المغازی'' نے تسلسل سے دوسری صدی ہجری میں جاری رکھا۔ ابنِ اسحٰق/ ابنِ ہشام نے دوسری صدی ہجری میں اپنی روایت کی کوئی سند نہیں لکھی اور اگر انھوں نے ''اشتدالضحاء'' کے الفاظ ''زاغت الشّمس'' کے مفہوم میں استعمال کیے، تو ''زاغت الشّمس'' کی مستند، مستحکم اور مسلسل روایت کے الفاظ کی موجودگی میں وقتِ وصالِ نبویؐ کے لیے نئے الفاظ اختراع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور کیے تھے تو پرانی روایت کے رَد، اور نئی روایت کی تائید میں جو کچھ لکھنا لازمی تھا، وہ کیوں نہیں لکھا؟

اس کے بعد آگے کیا لکھا جائے، سوائے اس کے کہ اگر یہ تحریری کاوش دربارِ رسالت مآب ﷺ میں شرفِ قبولیت پائے، تو قلم یہ لکھے گا کہ رسول کریم ﷺ کے وصال کا وقت ۱۲/ ربیع الاوّل ۱۱ھ/ ۸/ جون ۶۳۲ء کو نمازِ ظہر کے اول وقت تھا، جب آفتاب نصف النہار سے ڈھل چکا تھا لیکن جون کی گرمی کی شدت نصف النہار پر تھی۔

اللّٰھم صلّ علیٰ محمد النبی الاّمی واٰلہٖ واصحابہٖ وسلم

حواشی وحوالہ جات:

۱ (i) سیرۃ النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی (اضافہ وتکملہ)، ص:۱۷۰ (حاشیہ) مطبع معارف، اعظم گڑھ، بھارت، ۱۹۳۳ء

(ii) ایضًا، ص:۱۷۶، (حاشیہ) بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، پاکستان، ۱۹۸۵ء

۲ (i) The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Vol:1)، ص:۴۰۳، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، باب "Looking around while praying" حدیث:۷۲۱ Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore.، ۱۹۷۶ء

(ii) صحیح بخاری شریف (مترجم) (جلد اول) مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: علامہ وحید الزماں، ص:۳۸۱، کتاب الاذان، حدیث:۷۱۷، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

۳ ایضًا

۴ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Vol:1)، ص:۴۰۲، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، باب "Looking around while praying" حدیث:۷۲۱ Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore.، ۱۹۷۶ء

۵ فتح الباری شرح صحیح البخاری (آٹھویں جلد)، مصنف: حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی، ص:۱۸۱، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، (چوتھا اڈیشن ۲۰۰۳ء)

۶ سیرۃ النبیؐ (جلد دوئم)، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی (اضافہ وتکملہ)، ص:۱۸۸، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، پاکستان، ۱۹۸۵ء

۷ السیرۃ النبویہؐ (عربی)، مؤلف: ابنِ ہشام، ص:۸۹۷، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان،

۲۰۰۹ء

۸ سیرت النبیؐ (عربی سے اردو ترجمہ) (جلد دوئم)، مؤلف: ابنِ ہشام، مترجم: عبد الجلیل صدیقی، نظر ثانی وتہذیب: مولانا غلام رسول مہر، ص:۸۰۳، شیخ غلام علی اینڈ سنز، انارکلی، لاہور، ۱۹۷۹ء

۹ رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، مصنف: قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص:۲۷۷، دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

۱۰ رسول کریمؐ اور خلفائے راشدین کے آخری لمحات، مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد، ص:۳۸، مکتبہ جمال، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۸ء

۱۱ الرحیق المختوم (عربی)، مصنف: صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص:۴۷۵، دار ابن حزم، بیروت، لبنان، ۲۰۱۰ء

۱۲ ایضًا، (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف ومترجم: صفی الرحمٰن مبارک پوری، ص:۶۳۰، مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۳ ایضًا، (عربی سے انگریزی ترجمہ)، ایضًا، ص:۴۷۹، مکتبہ دار السلام، لاہور/ ریاض، ۱۹۹۵ء

۱۴ The Life of Muhammad ("السیرۃ النبویہؐ" سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحٰق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۶۸۲، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء، (پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)

۱۵ مغازی رسول اللہ ﷺ العروۃ بن الزبیر (بروایت ابی الاسود)، مؤلف: حضرت عروہؓ بن زبیرؓ جامع: ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی، ص:۲۲۲، مکتبہ التربیت العربی لدول الخلیج، ریاض، ۱۹۸۱ء

۱۶ کتاب المغازی (عربی متن) (جلد۳)، مصنف: محمد بن عمر بن واقدی، تحقیق: ڈاکٹر مارسڈن جونز، ص:۱۱۲۰، (۱) پہلا عربی اڈیشن ۱۹۶۶ء میں اکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا۔ (۲) عالم الکتب، بیروت، لبنان (تیسرا اڈیشن)، ۱۹۸۴ء

۱۷ طبقات الکبیر (عربی متن) (جلد۲)، مصنف: محمد بن سعد، تحقیق: ڈاکٹر علی محمد عمر، ص:۱۷۱، مکتبہ الخانجی، الشرکہ الدولیہ للطباعۃ، منطقہ، صناعیہ ثانیہ، قطعہ ۱۳۹، شارع ۳۹، مدینہ ۶/

اکتوبر، قاہرہ، مصر، ۲۰۰۱ء

۱۸ طبقاتِ ابن سعد (عربی سے اردو ترجمہ) (حصہ اول)، مصنف: محمد بن سعد، مترجم: عبداللہ العمادی، ص:۴۷۴، نفیس اکیڈمی، سٹریچن روڈ، کراچی (اشاعت سوئم ۱۹۸۳ء)

۱۹ نبی رحمتؐ (عربی سے اردو ترجمہ)، مصنف: سید ابوالحسن ندوی، ص:۵۴۵، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی، سالِ اشاعت نہیں دیا۔

۲۰ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد:۱۲)، زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص:۱۲ے، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، پاکستان (دوسرا اڈیشن ۲۰۰۵ء)

۲۱ ایضًا (جلد۱۳)، ص:۲۷۳، ۱۹۷۶ء

۲۲ ایضًا

۲۳ سیرت نگاری۔ آغاز وارتقاء، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، ص:۱۰۳، قرطاس، پوسٹ بکس ۸۴۵۳، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔ ۷۵۲۷۰، ۲۰۱۰ء

۲۴ ایضًا، ص:۱۲۵

۲۵ ایضًا، ص:۱۲۶

۲۶ ایضًا، ص:۱۰۴

۲۷ ایضًا، ص:۱۲۶

۲۸ ایضًا

۲۹ The Life of Muhammad ("السیرۃ النبویہؐ" سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحٰق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۴۳ تا ۴۷، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

۳۰ The Life of Muhammad ("السیرۃ النبویہؐ" سے انگریزی ترجمہ)، مصنف: ابنِ اسحٰق، مترجم: الفرڈ گیوم، ص:۶۸۲، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء

۳۱ السیرۃ النبویہؐ (عربی)، مؤلف: ابنِ ہشام، ص:۸۹۷، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۹ء

۳۲ سیرت النبیؐ (عربی سے اردو ترجمہ) (جلد دوئم)، مؤلف: ابنِ ہشام، مترجم: عبدالجلیل

صدیقی، نظر ثانی وتہذیب: مولانا غلام رسول مہر، ص:۸۰۳، شیخ غلام علی اینڈ سنز، انارکلی، لاہور، ۱۹۷۹ء

۳۳ کتاب المغازی (عربی متن) (جلد۳)، مصنف: محمد بن عمر بن واقدی، تحقیق: ڈاکٹر مارسڈن جونز، ص:۱۱۲۰، (۱) پہلا عربی اڈیشن ۱۹۶۶ء میں اکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا۔ (۲) عالم الکتب، بیروت، لبنان (تیسرا اڈیشن)، ۱۹۸۴ء

۳۴ طبقات الکبیر (عربی متن) (جلد۲)، مصنف: محمد بن سعد، تحقیق: ڈاکٹر علی محمد عمر، ص:۱۷۱، مکتبہ الخانجی، الشرکہ الدولیہ للطباعۃ، منطقہ صناعیہ ثانیہ، قطعہ ۱۳۹، شارع ۳۹، مدینہ ۶/ اکتوبر، قاہرہ، مصر، ۲۰۰۱ء

۳۵ طبقاتِ ابنِ سعد (عربی سے اردو ترجمہ) (حصہ اول)، مصنف: محمد بن سعد، مترجم: عبداللہ العمادی، ص:۴۷۴، نفیس اکیڈمی، سٹریچن روڈ، کراچی (اشاعت سوئم ۱۹۸۳ء)

۳۶ فرہنگ فارسی۔ انگلیسی نوین (جلد اول)، مؤلف: محمد ساعتچی، ص:۴۱۱، انتشارات پائینئر، طہران، ایران (ایرانی سنہ ۱۳۷۰)

۳۷ فرہنگِ آصفیہ (جلد دوئم)، مرتب: مولوی سید احمد دہلوی، ص:۹۲، مرکزی اردو بورڈ، گلبرگ، لاہور، ۱۹۷۷ء

۳۸ اردو لغت، تاریخی اصول پر (جلد ہفتم)، مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:۲۷۶، اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ) کراچی، ۱۹۸۶ء

۳۹ رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)، مصنف: قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص:۲۷۷، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء

۴۰ مغازی رسول اللہ ﷺ (حضرت عروہؓ بن زبیرؒ) (عربی سے اردو ترجمہ)، تحقیق: ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی، مترجم: محمد سعید الرحمٰن علوی، ص:۲۲۹، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب رود، لاہور، ۱۹۹۰ء

۴۱ ایضًا، ص:۸۲

۴۲ ایضًا، ص:۸۳

۴۳ ایضاً،ص:۸۸

۴۴ ایضاً،ص:۶۸

۴۵ مغازی رسول اللہ ﷺ العروۃ بن الزبیر (بروایت ابی الاسود)، مؤلف: حضرت عروہؓ بن زبیرؓ، جامع: ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی، ص:۲۲۲، مکتبہ التربیت العربی لدول الخلیج، ریاض، 1981ء

۴۶ Arabic-English Lexicon (Part:3)، مؤلف: ایڈورڈ ولیم لین، ص:۱,۲۷۷، ولیمز اینڈ نورگیٹ، ہنریٹا سٹریٹ، کوونٹ گارڈن، لندن، ۱۸۶۳ء

۴۷ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Vol:1)، ص:۳۰۵، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، حدیث:۵۱۵، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore.، ۱۹۷۶ء

۴۸ صحیح بخاری شریف (مترجم) (جلد اول) مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: علامہ وحیدالزماں، ص:۳۰۵، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، حدیث:۵۱۱، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

۴۹ صحیح بخاری شریف (مترجم) (جلد اول) مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: علامہ وحیدالزماں، ص:۳۰۵، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، حدیث:۵۱۲، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء

۵۰ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Vol:1)، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، ص:۳۰۶، حدیث:۵۱۶، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore.، ۱۹۷۶ء

۵۱ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Vol:1)، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، کتاب الاذان، ص:۳۳۹، حدیث:۵۸۹، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore.، ۱۹۷۶ء

۵۲ The Translation of the Meanings of "Sahih Al-Bukhari" (Vol:1)، مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ، کتاب الاذان، ص:۳۳۰، حدیث:۵۸۶، Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road, Lahore.، ۱۹۷۶ء

جہاں حضور ﷺ آرام فرما ہیں

رسول کریم ﷺ آج جہاں آرام فرما ہیں وہاں سوا چودہ سو سال قبل آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا حجرہ مبارک تھا۔ اس کی لمبائی تقریباً سولہ فٹ اور چوڑائی بارہ فٹ تھی۔ آج کل کے کمروں کی لمبائی چوڑائی بھی عموماً یہی ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں ایسے کمرے ایک سے زیادہ ہوتے ہیں جن کے ساتھ غسل خانے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں باورچی خانہ اور بسا اوقات کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور مہمانوں کو بٹھانے کے لیے الگ جگہیں بھی ہوتی ہیں۔

مدینہ منورہ کے اس حجرے میں کوئی غسل خانہ تھا نہ باورچی خانہ۔ کھانے کے لیے کوئی الگ جگہ تھی نہ مہمانوں کے لیے۔ جو کچھ بھی تھا بس یہی دو سو مربع فٹ کا رقبہ تھا۔ ہمارے کمروں کی اونچائی اتنی رکھی جاتی ہے کہ اگر کوئی بالغ شخص فرش پر کھڑا ہو کر ہاتھ بلند کرے تو وہ چھت پر لگے ہوئے برقی پنکھے سے نہ ٹکرا جائے۔ اس مقدس حجرے کے بارے میں حضرت حسن بصریؒ جو رسولِ کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت اُمِّ سلمہؓ کی آزاد کردہ کنیز کے بیٹے تھے، بتاتے ہیں کہ اپنے لڑکپن کے ابتدائی دور میں وہ یہ حجرہ اور دوسری اُمّہات المومنینؓ کے حجرات دیکھنے جایا کرتے تھے، جب کھڑے ہوتے تو ان کا ہاتھ چھت سے لگتا تھا۔ حضرت حسن بصریؒ (حضرت عروہؒ بن زبیرؒ کی طرح) رسولِ کریم ﷺ کے وصال کے دس برس بعد پیدا ہوئے تھے۔

یہ تھی رسولِ کریم ﷺ کی ازواجِ مطہراتؓ کی رہایش گاہوں کی لمبائی، چوڑائی اور

اُونچائی۔ ان کی دیواریں کچی اینٹوں، اور چھتیں کھجور کے درخت کی لکڑی اور پتوں سے بنائی گئی تھیں۔ اللہ جانتا ہے کہ تیز بارش اور چلچلاتی دھوپ میں یہ چھتیں اپنے مکینوں کی کیسے حفاظت کرتی ہوں گی؟ ان حجروں کے دروازوں پر جانوروں کے بالوں سے بنے موٹے جھوٹے کمبل ڈال دیئے جاتے۔ ہر حجرے کے ساتھ تقریباً اسی طول وعرض کا ایک چھوٹا سا عقبی صحن ہوتا، جس کے گرد کھجور کی لمبی ٹہنیوں سے باڑھ باندھنے کے بعد ان ٹہنیوں پر بھی ایسے ہی کمبل ڈال دیئے جاتے تھے تاکہ ٹہنیوں کے درمیانی شگافوں سے بے پردگی نہ ہو۔

اگلی سطور پڑھتے وقت خیال رہے کہ مدینے میں قبلے کا رخ جنوب کی جانب ہے اور مسجدِ نبویؐ کے مشرق میں جنت البقیع ہے۔ رسولِ کریم ﷺ کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ کا حجرہ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہؓ کے حجرے کے ساتھ، اس کے شمال کی سمت میں تھا۔ ان دونوں حجروں کے دروازے مسجدِ نبویؐ میں کھلتے تھے۔ اب یہ دونوں مقامات گنبدِ خضرا کے سائے تلے ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرے کے مشرق اور اس سے متصل رسولِ کریم ﷺ کی دُوسری زوجہ محترمہ حضرت سودہؓ کا حجرہ تھا۔ مسجدِ نبویؐ کی تعمیر سے فارغ ہوتے ہی رسولِ کریم ﷺ نے اِن دونوں حجروں کو بیک وقت، ایک ہی طرز پر، تعمیر کرایا تھا۔

حضرت عائشہؓ کے حجرے کے جنوب، یعنی قبلے کی سمت اور حضرت عائشہؓ کے حجرے سے گز بھر آگے، حضرت حفصہؓ کا حجرہ تھا۔ پچھلے چودہ سو برسوں کے دوران، وہ اَربوں کلمہ گو جو رسول اللہ ﷺ کی قبرِ اطہر کے سامنے کھڑے ہو کر، گداز دِل اور تر آنکھوں سے، آپؐ پر درود و سلام بھیجتے رہے ہیں، ان میں سے بیش تر کو یہ علم نہ ہوگا کہ وہ جہاں کھڑے ہیں، اس سے کئی فٹ نیچی وہی جگہ ہے جو چالیس برس سے زیادہ حضرت حفصہؓ کی رہایش گاہ کا ایک حصہ رہی ہے۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے حجروں کے درمیان ایک انتہائی تنگ گلی تھی، جس میں سے ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ اپنے اپنے حجروں میں بیٹھے بیٹھے ایک دُوسرے سے باتیں کرلیا کرتی تھیں۔

حضرت فاطمہؓ اور ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے علاوہ صرف ایک اور حجرے کا صحیح محلِ وقوع معلوم ہے۔ اس میں آپؐ کی پانچویں بیوی حضرت زینب بنتِ خزیمہؓ صرف چند ماہ رہیں۔ جب چند ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا تو آپؐ نے حضرت اُمِّ سلمہؓ سے شادی کی جو اگلے چھپن برس یہاں رہائش پزیر رہیں۔ ازواجِ مطہرات میں سے حضرت اُمِّ سلمہؓ کا انتقال سب سے آخر میں ہوا۔ حضرت اُمِّ سلمہؓ کے حجرے کے بعد، شمال کی جانب، پانچ مزید حجرات تقریباً ایک قطار میں وقتاً فوقتاً بنتے گئے، جو رسولِ کریم ﷺ کی پانچ دیگر ازواجِ مطہراتؓ کی رہایش گاہیں تھیں۔

بالائی سطور سے یہ نقشہ سامنے آتا ہے کہ مسجدِ نبویؐ کے مشرق میں، قبلے یا جنوب کی سمت، سب سے پہلا حجرہ حضرت حفصہؓ کا تھا۔ اس کے نیچے یا شمال میں، دو دو حجروں کی دو قطاریں تھیں۔ پہلی قطار میں مغرب یعنی مسجدِ نبویؐ کی جانب پہلا حجرہ حضرت عائشہؓ کا تھا، جو حضرت حفصہؓ کے حجرے کے تقریباً سامنے تھا۔ دوسرا حضرت سودہؓ کا تھا جو حضرت عائشہؓ کے حجرے سے متصل، مشرق یعنی جنت البقیع کی جانب تھا۔ دوسری قطار میں مغرب یعنی مسجدِ نبویؐ کی جانب پہلا حجرہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کا تھا، جو حضرت عائشہؓ کے حجرے سے متصل تھا اور اس کا دروازہ بھی حضرت عائشہؓ کے حجرے کی طرح، مسجدِ نبویؐ میں کھلتا تھا۔ حضرت فاطمہؓ کے حجرے کے ساتھ دوسرا حجرہ حضرت اُمِّ سلمہؓ کا تھا جو حضرت سودہؓ کے حجرے کے نیچے مشرق یعنی جنت البقیع کی جانب تھا۔

اب یہ واضح ہوگیا ہے کہ زمین کا وہ خُوش نصیب ٹکڑا جسے آج گنبدِ خضرا نے ڈھانپ رکھا ہے، سوا چودہ صدیوں پہلے حضرت عائشہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت اُمِّ سلمہؓ کے حجروں اور حضرت حفصہؓ کے حجرے کے شمالی حصے کی جگہ تھا۔ حضرت اُمِّ سلمہؓ کے حجرے کے نیچے شمال کے رخ پر اسی طرح کے پانچ اور حجرے تھے، جو دوسری ازواجِ مطہراتؓ کی رہائش گاہیں تھیں۔ یہ تھے دو دو سو مربع فٹ کے وہ نو حجرے جن میں اللہ کے آخری رسول ﷺ نے اپنی زندگی کا آخری عشرہ گزارا۔ یہ تھیں وہ اقامت گاہیں جن میں آپؐ سوئے، اٹھے، بیٹھے، محوِ گفتگو

اور سجدہ ریز ہوئے۔ ان میں سے بعض میں آپؐ پر وحی اتری اور ان میں سے ایک میں آپؐ نے وفات پائی اور آج وہیں آرام فرما ہیں۔

جب کوئی زائر مسجدِ نبوی میں ریاض الجنّۃ کے قریب، جنوب کی جانب سنہری جالیوں کی وسطی جالی میں نصب تین گول دائروں میں سے پہلے اور بڑے گول دائرے کے بالمقابل کھڑا ہوتا ہے تو اس کے اور رسولِ کریم ﷺ کے درمیان، ظاہری طور پر، صرف سات آٹھ گز کا فاصلہ ہوتا ہے۔ سنہری جالیوں کے پیچھے، سب سے پہلے حضرت حفصہؓ کے حجرے کا ایک حصہ ہے اور پھر گز بھر چوڑی وہ گلی جو کبھی حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے حجروں کے درمیان ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ کا حجرہ ہے، جس میں جنوب مغرب یعنی قبلے اور ریاض الجنّۃ کی اطراف سے پہلی قبر رسول کریم ﷺ کی ہے۔ اس سے ذرا نیچے شمال کی جانب پہلے آپؐ کے خسر اور خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اس کے بعد ذرا نیچے آپؐ کے دوسرے خسر اور خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی قبریں ہیں۔ یہ تینوں قبریں اس سطحِ زمین سے جہاں زائرین کھڑے ہوتے ہیں، کئی فٹ نیچے ہیں۔ رسولِ کریم ﷺ کا سرِ مبارک مغرب یعنی مسجدِ نبویؐ کی طرف، پاؤں مشرق یعنی جنت البقیع کی طرف اور چہرۂ انور کا رخ قبلے یعنی جنوب کی طرف ہے۔ تدفین کے وقت یہی ترتیب آپؐ کے ان دو اصحابؓ کی رکھی گئی جو زندگی میں بھی آپؐ کے ساتھی تھے اور اب بھی آپؐ کے ساتھ آرام فرما ہیں۔

رسولِ کریم ﷺ کے سینے (اور بعض روایات کے مطابق کندھے) کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کا سَر اور حضرت ابوبکرؓ کے سینے (اور بعض روایات کے مطابق کندھے) کے سامنے حضرت عمرؓ کا سَر ہے۔ یہ تینوں قبریں تقریباً مربع شکل کی ایک مہر بند چار دیواری میں ہیں، جو کبھی حضرت عائشہؓ کا حجرہ تھا۔ اس چار دیواری کے گرد ایک ''پانچ دیواری'' ہے۔ اس پانچ دیواروں والے کمرے کو ہی آج کل ''حجرہ شریفہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ سربلند ''پانچ دیواری'' بھی مہر بند ہے اور اس کے چاروں طرف سبز غلاف چڑھا ہوا ہے۔ اس ''پانچ دیواری'' کی تفصیلات اگلی سطور میں دی گئی ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا ضروری ہے کہ تین گول دائروں والی

سنہری جالی کے اندر سے زائر کو جو نظر آتا ہے، وہ اس ''پانچ دیواری'' کا جنوبی یعنی قبلے کے رُخ والا حصہ ہے۔ حضرت عائشہؓ کا حجرہ نہیں۔

رسولِ کریم ﷺ کے وصال کے تقریباً اسّی برس بعد، اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں، مدینے کے گورنر حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کو مسجدِ نبویؐ کی مزید توسیع کا حکم دیا گیا۔ مسجدِ نبویؐ کا رقبہ، جس میں پہلی توسیع رسولِ کریم ﷺ، دوسری توسیع خلیفۂ دوئم حضرت عمر فاروقؓ اور تیسری توسیع خلیفۂ سوئم حضرت عثمانؓ نے کرائی تھی، اب اسلامی مملکت کے محیرالعقل پھیلاؤ اور مسلمانوں کی آبادی میں کثرت کے باعث پھر چھوٹا پڑ گیا تھا۔ بات تقریباً ۸۸ھ (بمطابق ۷۰۷ء) کی ہو رہی ہے۔ اس وقت تک تمام ازواجِ مطہراتؓ دُنیا سے رُخصت ہو چکی تھیں۔ خلیفہ کی ہدایت پر، حضرت عائشہؓ کے حجرے کے علاوہ باقی تمام حجرات گرا کر، ان کی زمین مسجدِ نبویؐ کی توسیع کے لیے استعمال کی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ جس روز یہ تقریباً سَو سالہ قدیم حجرے گرائے گئے، اس دن مدینے میں ہر آنکھ اشک بار تھی۔ لوگ کہہ رہے تھے اور مدتوں تک کہتے رہے کہ یہ حجرے جُوں کے تُوں برقرار رہنے چاہیے تھے تاکہ آنے والی نسلوں کو معلوم ہوتا کہ ان کے آقاؐ اور مولاؐ نے اپنی زندگی کے آخری دَس برس کِس فقیرانہ شان سے گزارے، حالانکہ فتحِ خیبر کے بعد اگر وہؐ چاہتے تو اپنے، اپنی بیٹی اور بیویوں کے لیے پختہ، وسیع اور آرام دہ مکانات بنوا سکتے تھے۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے حضرت عائشہؓ کے حجرے کی چار دیواری کی ازسرِنو تعمیر کی اور اس کے بعد اس کے گرد تقریباً سات میٹر یا ساڑھے سات گز اُونچی پانچ کونوں والی ایک بیرونی دیوار کا بھی اضافہ کیا۔ تعمیرِ نو اور توسیع کے اس عمل کے دوران، جب یہ حجرے گرائے گئے تو مدینے کی ایک بھیگی رات میں جو کچھ بیتی وہ ایک معاصر عبداللہ بن محمد بن عقیل کی زبانی سُنیے:

''اس رات مدینے میں بارش ہو رہی تھی۔ میرا معمول تھا کہ رات کے آخری پہر مسجدِ نبویؐ میں حاضری دیتا۔ پہلے رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام بھیجتا اور پھر نمازِ فجر تک مسجدِ نبویؐ میں رہتا۔ اس رات بھی میں حسبِ معمول نکلا۔ ابھی حضرت مغیرہ بن شعبہؓ

کے مکان تک پہنچا تھا (جو جنت البقیع کے بالکل پاس تھا) کہ اچانک ایسی خُوشبو آئی جو میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ مسجدِ نبویؐ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ کے حُجرے کی ایک دیوار (مشرقی دیوار جو جنت البقیع کی جانب ہے) گری ہوئی ہے۔ میں اندر گیا اور رسولِ کریم ﷺ کی خدمت میں درود و سلام پیش کیا۔ ابھی وہیں تھا کہ مدینے کے گورنر حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز آ گئے۔ اُن کے حکم پر حُجرے کو ایک بڑے کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔ علی الصبح مستری کو حُجرے کے اندر جانے کے لیے کہا گیا۔ اس نے کہا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی چلے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز اٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پوتے بھی تیار ہو گئے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے یہ دیکھا تو کہا کہ ہمیں اس مقدس مقام کے مکینوں کے سکون میں خلل اندازی سے گریز کرنا چاہیے۔ انہوں نے صِرف اپنے آزاد کردہ غلام مزاحم کو اندر جانے کی ہدایت کی، جس نے بعد میں بتایا کہ پہلی قبر دوسری دو قبروں کے مقابلے میں تھوڑی سی نیچی تھی۔''

اس واقعے سے کم از کم پینتیس بَرس قبل، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایک پوتے نے جب اپنی پھوپھی حضرت عائشہؓ کی زندگی میں، ان کی اجازت سے، یہ تینوں قبریں دیکھیں تو وہ سطحِ زمین سے نہ بہت بلند تھیں اور نہ زمین کے ساتھ لگی تھیں۔ تینوں قبروں پر سرخ رنگ کی مٹی نظر آ رہی تھی۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز ہی کے دَور کے ایک اور ہم عصر کا بیان ہے کہ انہوں نے جب یہ تینوں قبریں دیکھیں تو وہ سطحِ زمین سے تقریباً چار انچ اوپر تھیں۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے حضرت عائشہؓ کے حجرے کے گرد جو چار دیواری کھنچوائی اس میں وہی سیاہ رنگ کے پتھر استعمال کیے گئے، جیسے خانہ کعبہ کی دیواروں میں لگے ہیں۔ اس کی تصدیق صدیوں بعد، ان لوگوں نے کی، جنہیں مرمت کے دَوران یہ مہر بند چوکور کمرہ دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ اس چار دیواری کے گرد ''پانچ دیواری'' بنوانے کا ایک مقصد یہ تھا کہ اللہ کے آخری رسول ﷺ کی آخری آرام گاہ کا طرزِ تعمیر اللہ کے گھر کے طرزِ تعمیر سے مختلف رہے

جو چار دیواروں پر مشتمل ہے۔

اس ''پانچ دیواری'' کا نقشہ کچھ یوں ہے کہ جب آپ تین گول دائروں والی سنہری جالیوں یعنی مواجہہ شریف کے سامنے کھڑے ہوں تو ان کے درمیان میں سے آپ کو حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی تعمیر کردہ بیرونی دیوار کا جنوبی حصّہ نظر آئے گا جو ساڑھے آٹھ میٹر لمبا اور خطِ مستقیم میں ہے۔ان جالیوں میں سے آپ کو عربی تحریر سے مزّین جو سبز کپڑا اندر نظر آئے گا، یہ وہ سبز غلاف ہے جو حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی تعمیر کردہ بیرونی دیوار کے جنوبی حصّے پر چڑھا ہوا ہے، نہ کہ حضرت عائشہؓ کے حجرے کی دیوار پر۔

مشرق میں یعنی جنت البقیع کی جانب بیرونی دیوار (جو ظاہر ہے سبز جالیوں کے اندر ہے) خطِ مستقیم میں نہیں بلکہ دو حصّوں میں ہے۔جنوب (یعنی قبلے کی جانب) سے شمال کو جاتے ہوئے بیرونی دیوار کا ایک حصّہ جو تقریبًا چھ میٹر لمبا ہے خطِ مستقیم میں ہے، لیکن آگے جا کر اس دیوار کا دوسرا حصّہ وتر کا زاویہ بناتا ہوا شمال مغرب کی سمت مڑ جاتا ہے۔اس دوسرے حصّے کی لمبائی تقریبًا سات میٹر ہے۔

اسی طرح مغرب یعنی ریاض الجنّة کی جانب بھی بیرونی دیوار مکمل طور پر خطِ مستقیم میں نہیں۔ریاض الجنّة میں جنوب سے شمال کو جاتے ہوئے آپ کو سبز جالیوں میں تین ستون نصب نظر آئیں گے، جو آدھے سبز جالیوں کے اندر اور آدھے باہر ہیں۔ان کے نام بالترتیب ''السرّیر''، ''الحرس'' اور ''الوفود'' ہیں۔السرّیر سے الوفود کو جاتے ہوئے سبز جالیوں کے اندر بیرونی دیوار کا ایک حصہ جو تقریبًا آٹھ میٹر لمبا ہے خطِ مستقیم میں ہے، لیکن آگے جا کر اس دیوار کا دوسرا حصہ جس کی لمبائی چھ میٹر ہے، وتر کا زاویہ بناتے ہوئے، شمال مشرق کی طرف مڑ جاتا ہے اور پھر شمال میں اپنے بالمقابل دیوار سے مل جاتا ہے۔

اس طرح حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی تعمیر کردہ بیرونی دیوار کی مجموعی لمبائی ساڑھے پینتیس میٹر بنتی ہے۔ قبلے یعنی جنوب کی جانب ساڑھے آٹھ میٹر لمبی دیوار خطِ مستقیم میں ہے۔ مشرق اور مغرب کی سمت یہ دیوار دو حصّوں پر مشتمل ہے۔جنوب سے شمال کو جاتے ہوئے ان

دیواروں کا ایک حصّہ خطِ مستقیم میں، اور دوسرا حصہ وتر کا زاویہ لیے ہوئے ہے۔ اس طرح جنوب کی سمت صرف ایک دیوار ہے۔مشرق کی طرف دو دیواریں، مغرب کی طرف دو دیواریں اور شمال کی سمت مشرقی اور مغربی دیواروں کا نقطۂ اتصال ہے اور کوئی دیوار نہیں۔اس طرح کُل پانچ دیواریں بن جاتی ہیں۔

ان پانچ دیواروں کے گرد وہ جالی ہے جو ہر زائر کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتی ہے۔اس کی لمبائی جنوب یعنی قبلے کی سمت سے شمال تک تقریبًا سولہ میٹر اور مشرق سے مغرب (ریاض الجنّة) تک تقریبًا پندرہ میٹر ہے۔اس جالی میں چار دروازے ہیں جو شمال، جنوب، مشرق اور مغرب میں ہیں۔مشرقی دروازے کے علاوہ باقی تینوں دروازے بند رکھے جاتے ہیں۔

مشرقی دروازہ بھی اسی وقت کھولا جاتا ہے، جب کسی خصوصی مہمان یا وفد کو اندر لے جانا ہو۔ یہ خصوصی مہمان سبز جالی کے اندر تو داخل ہو جاتے ہیں لیکن اس مہر بند بیرونی ''پانچ دیواری'' کے اندر نہیں جا سکتے، جس کی اولیں تعمیر حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے سوا تیرہ صدی قبل کرائی تھی اور ظاہر ہے کہ اس مہر بند اندرونی چار دیواری کے اندر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس میں رسول اللہ ﷺ آرام فرما ہیں۔

اس مقدس اور قدیم چار دیواری کے اوپر ایک چھوٹا گنبد اور اس چھوٹے گنبد کے اوپر وہ بڑا سبز گنبد ہے جو ۱۲۵۳ھ (بمطابق ۱۸۳۷ء) سے، اپنے رنگ کی نسبت سے دنیا بھر میں ''گنبدِ خضرا'' کے نام سے مشہور ہے۔ان دونوں گنبدوں میں قبلے یعنی جنوب کی جانب، ایک دوسرے کے متوازی، ایک ایک سوراخ اس طرح رکھا گیا ہے کہ جب سُورج کی کرنیں گنبدِ خضرا کے سوراخ پر پڑتی ہیں تو وہ اندرونی گنبد کے متوازی سوراخ سے گزرتی ہوئی روضۂ اقدس میں بھی پہنچتی ہیں اور جب تیز بارش ہوتی ہے تو وہ بھی اسی طرح اس پاک روضے میں پہنچتی ہے۔

رسولِ کریم ﷺ نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے حجرے کے باہر شمال کی سمت میں واقع کھلی جگہ میں نمازِ تہجد ادا کی ہے۔ یہاں ایک محراب ہے جو ''محرابِ تہجد'' کہلاتی ہے لیکن سبز جالیوں کے باہر سے نظر نہیں آتی کیوں کہ اس کے آگے آج ایک چبوترہ بنا ہوا ہے جس

کے سامنے پیتل کی ایک دیدہ زیب مُنقّش جالی نصب ہے۔ چبوترے پر ایک لمبی اور اونچی الماری ہے جس میں قُرآن کے سیکڑوں نسخے رکھے ہیں۔ اس پیتل کی مُنقّش جالی کے عین سامنے وہ گزرگاہ ہے جو مشرق کی سمت بابِ جبریل اور مغرب کی سمت ریاض الجنّۃ کی طرف جاتی ہے۔

اگر آپ بابِ جبریل سے مسجدِ نبویؐ میں داخل ہوں، جو ہر زائر کی ترجیح ہوتی ہے، تو چند گز بعد آپ کے بائیں جانب پیتل کی منقش جالی اور دائیں جانب قالینوں سے مزیّن ایک بڑا چبوترہ ہے، جسے اکثر زائرین غلطی سے اہلِ صفّہ کا چبوترہ سمجھ کر، اس پر جگہ حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگ جاتے ہیں۔ اہلِ صُفّہ کے قیام کا وہ مقام جہاں دَورِ رسالتؐ میں رسولِ کریم ﷺ کے ساٹھ ستر اصحابؓ بیک وقت قیام کرتے تھے، یہ نہیں ہے۔

موجودہ چبوترہ رسولِ کریم ﷺ کے وصال کے تقریباً ساڑھے پانچ صدیوں بعد، باالفاظ دیگر آج سے تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال قبل، مصر اور شام کے حکمران سلطان نورالدین زنگی نے ۵۵۷ھ (بمطابق ۱۱۶۲ء) میں ایک سنگین واقعے کے بعد مسجدِ نبویؐ کے خادموں اور محافظوں کے بیٹھنے کے لیے بنوایا تھا اور اب یہاں زائرین کی نشست ہوتی ہے۔ ''اہلِ صُفّہ'' کی جگہ موجودہ چبوترے سے خاصی آگے مغرب کی جانب تھی۔ اگر آپ اسطوانہ عائشہؓ سے شمال کی سمت یعنی قبلے کی مخالف رُخ چلیں تو پانچواں ستون جس مقام پر ہے وہاں ۷ھ سے پہلے اہلِ صُفّہ کا چبوترہ اور سائبان ہوتے تھے۔ ۷ھ سے قبل، مسجدِ نبویؐ کی شمال مغربی حد بھی یہیں تک ہوتی تھی۔ آج کل اس ستون یا مقام کی شناخت کے لیے کوئی نشان نہیں۔

۵۵۷ ہجری میں وہ رسوائے زمانہ سنگین واقعہ پیش آیا، جب مراکش کے دو عیسائیوں نے رسولِ کریم ﷺ کے جسدِ مبارک کو نکالنے کی ناپاک (اور ناکام) جسارت کی۔ اس واقعے کا ذکر مدینے کی مشہور اور مختصر تاریخ ''وفاالوفاء'' کے مصنف علامہ نورالدین ابوالحسن سمہودی (۸۴۴ھ تا ۹۱۱ھ بمطابق ۱۴۴۰ء تا ۱۵۰۵ء) نے کیا ہے، جسے بعد میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بھی اپنی مشہور کتاب **جذب القلوب الی دیار المحبوب** میں تحریر کیا ہے۔

علامہ سمہودی، علامہ جمال الدین کی کتاب کے حوالے سے، لکھتے ہیں کہ ایک رات

نمازِ تہجد کے بعد سلطان نورالدین زنگی نے خواب میں دیکھا کہ رسولِ کریم ﷺ دو سُرخی مائل رنگت کے آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے سلطان سے کہہ رہے ہیں کہ مجھے ان کے شر سے بچاؤ۔ سلطان ہڑبڑا کر اٹھا، وضو کیا، نفل ادا کیے اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ وہی خواب دیکھا۔ اٹھا، وضو کیا، نفل پڑھے اور سو گیا۔ تیسری بار پھر وہی خواب دیکھا۔ اب اس کی نیند اڑ گئی۔

اس نے اپنے مشیر جمال الدین موصلی کو بلایا اور پورا واقعہ سنایا۔ اس نے سنتے ہی کہا: ''سلطان! یہ خواب دیکھنے کے بعد آپ یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟ فوراً مدینے کے لیے روانہ ہو جایئے، مناسب ہوگا کہ اس خواب کا کسی اور سے ذکر نہ کریں۔''

اگلے روز سلطان صرف بیس افراد اور بہت سے تحائف کے ساتھ تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر مدینہ کے لیے روانہ ہو گیا اور سولھویں روز مدینہ طیبہ پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے روضۂ رسولؐ پر حاضری دی اور مسجدِ نبویؐ میں بیٹھ گیا۔ امیرِ مدینہ نے شہر میں منادی کرادی کہ مدینے کے سب مرد مسجدِ نبویؐ میں پہنچ جائیں جہاں سلطان اہلِ مدینہ میں تحائف تقسیم کرے گا۔ لوگ آتے گئے اور سلطان باری باری ہر ایک کو تحفہ دیتا رہا۔ اس دوران وہ ہر شخص کو غور سے دیکھتا رہا لیکن وہ دو چہرے نظر نہ آئے جو اسے ایک رات میں تین بار خواب میں دکھائے گئے تھے۔

سلطان نے حاضرین سے پوچھا: ''کیا مدینے کا ہر شخص مجھ سے مل چکا ہے؟'' لوگوں نے اثبات میں جواب دیا۔ سلطان نے پھر پوچھا کہ کیا تمہیں یقین ہے کہ ہر شہری مجھ سے مل چکا ہے؟

اس بار حاضرین نے کہا: ''سوائے دو کے۔'' راز تقریباً فاش ہو گیا تھا۔ سلطان نے پوچھا: ''وہ دو کون ہیں، کیوں نہیں آئے اور اپنا تحفہ کیوں نہیں لیا؟'' جواب ملا: ''یہ مراکش کے دو متقی صوم وصلوٰۃ کے پابند باشندے ہیں۔ دن رات رسولِ کریم ﷺ پر درود وسلام بھیجتے اور ہر ہفتے مسجدِ قبا جاتے ہیں۔ فیاض اور مہمان نواز ہیں اور کسی کا دیا نہیں لیتے۔''

سلطان نے کہا: ''سبحان اللہ!'' اور حکم دیا کہ ان دونوں کو بھی تحائف وصول کرنے کے لیے طلب کیا جائے۔ جب انہیں یہ خصوصی پیغام ملا تو انھوں نے کہا: ''الحمدللہ! ہمارے پاس

اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور ہمیں کسی تحفے تحائف یا خیر خیرات کی ضرورت نہیں۔'' جب یہ جواب سلطان تک پہنچایا گیا تو اس نے حکم دیا کہ ان دونوں کو فوراً پیش کیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔

اُن کی ایک جھلک اُن کی شناخت کے لیے کافی تھی، تاہم سلطان نے اپنا غصہ قابو میں رکھا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم مراکش کے رہنے والے ہیں۔ حج کے لیے آئے تھے اور اب روضۂ رسولؐ کے سائے تلے زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ سلطان نے سختی سے کہا کہ کیا تم نے سچ نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے؟ وہ چپ رہے۔ سلطان نے حاضرین سے دریافت کیا کہ یہ دونوں مدینے میں کہاں رہ رہے ہیں؟ بتایا گیا کہ روضۂ مبارک کے بالکل نزدیک ایک مکان جو مسجدِ نبویؐ کی دیوار کے ساتھ جنوب مغرب (قبلے کی سَمت) میں تھا۔ سلطان فوراً اٹھا اور انہیں ساتھ لے کر اُس مکان میں داخل ہو گیا۔

ہر طرف قیمتی ساز و سامان بکھرا پڑا تھا۔ اچانک قیمتی اور نئے سامان سے بھرے اس مکان میں سلطان کی نظر فرش پر بچھی ایک چٹائی پر پڑی تو دونوں مراکشی باشندوں کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ سلطان نے چٹائی ہٹائی تو ایک تختہ نظر آیا، تختے کو ہٹایا تو نیچے ایک تازہ کھدی ہوئی سرنگ تھی جو روضۂ رسولؐ کی طرف جا رہی تھی۔ سلطان نے گرج کر کہا: ''کیا اب بھی سچ نہ بولو گے؟'' ان کے پاس سچ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

انھوں نے اعتراف کیا کہ وہ عیسائی ہیں اور ان کے بادشاہ نے انہیں بہت سا مال وزر اور ساز و سامان دے کر حاجیوں کے رُوپ میں مراکش سے حجاز اس منصوبے پر بھجوایا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح رسولِ کریم ﷺ کا جسدِ اقدس روضۂ مبارک سے نکال کر لے آئیں تاکہ مسلمانوں کی مرکزیت ختم ہو جائے اور اُن کا نام و نشان مٹ جائے۔ اس ناپاک مشن کی تکمیل کے لیے انھوں نے حج کا بہانہ کیا اور اس کے بعد روضۂ رسولؐ سے نزدیک ترین جو مکان کرائے پر مل سکتا تھا، لے کر اپنا مذموم کام شروع کر دیا۔ ہر رات وہ سرنگ کھودتے جس کا رخ روضۂ مبارک کی طرف تھا۔ ہر صبح وہ کھدی ہوئی مٹی بوریوں میں بھر کر جنت البقیع لے جاتے اور قبروں پر بکھیر دیتے۔ ان کی مہم آخری مراحل میں تھی کہ ایک رات خوفناک بجلی گری اور زلزلے نے

زمین کو جھنجھوڑ ڈالا۔

سلطان نے حکم دیا کہ ان دونوں کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ سلطان سجدۂ شکر بجالایا اور اس کے بعد روضہ شریف کے اردگرد اتنی گہری خندق کھدوائی کہ پانی نکل آیا۔ پھر اس خندق میں سطحِ زمین تک سیسہ پگھلا کر بھروا دیا تاکہ آئندہ کوئی بدبخت ایسی مذموم حرکت کے ارتکاب کے بارے میں سوچ بھی نہ سکے۔

یہ واقعہ ۵۵۷ھ (بمطابق ۱۱۶۲ء) کا ہے۔ تین صدیوں بعد ۸۸۱ھ (بمطابق ۷۷-۱۴۷۶ء) میں حضرت عائشہؓ کے حجرے کی چاردیواری اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی بنوائی ہوئی ''پانچ دیواری'' دونوں کی ازسرِنو تعمیر کی ضرورت پڑ گئی۔ تاریخِ مدینہ ''وفاالوفاء'' کے مصنف علامہ نورالدین ابوالحسن سمہودی کو تعمیرِ نو کے اس مبارک کام میں رضا کارانہ طور پر حصہ لینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۴ر شعبان ۸۸۱ھ (بمطابق ۲ر دسمبر ۱۴۷۶ء) کو ''پانچ دیواری'' مکمل طور پر ڈھا دی گئی۔ تب دیکھا کہ اندرونی ''چاردیواری'' میں بھی دراڑیں پڑی ہوئی تھیں، چنانچہ وہ بھی ڈھا دی گئی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اب مقدس حجرہ تھا۔

مجھے داخلے کی سعادت ملی۔ میں پچھلی طرف (یعنی شمالی سمت سے جو قبلے کے مخالف سمت ہے) سے داخل ہوا۔ خُوشبو کی ایسی لپٹ آئی جو زندگی میں کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں نے رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے دونوں خلفا کی خدمت میں ادب سے سلام پیش کیا۔ مقدس حجرہ مربع شکل کا تھا اور اس کی چاردیواری سیاہ رنگ کے پتھروں سے بنی ہوئی تھی، جیسے خانہ کعبہ کی دیواروں میں استعمال ہوئے ہیں۔ چاردیواری میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ میری پوری توجہ تین قبروں پر مرکوز تھی۔ تینوں سطحِ زمین کے تقریباً برابر تھیں۔ صرف ایک جگہ ذرا سا ابھار تھا۔ یہ شاید حضرت عمرؓ کی قبر تھی۔ قبروں پر عام سی مٹی پڑی تھی۔ میں تعمیرِ نو کے کام میں مشغول ہو گیا جو (سات ہفتوں میں) سات شوال ۸۸۱ھ (بمطابق ۲۳ر جنوری ۱۴۷۷ء) کو مکمل ہوا۔

اس بات کو پانچ صدیاں بیت چکی ہیں جن کے دوران شاید ہی کوئی انسان ان مہر بند

اور مستحکم دیواروں کے اندر داخل ہوا ہو۔ آج کل لوگ رسولِ کریم ﷺ کی قبر کی شبیہ دکھاتے ہیں یا اس کی طباعت، اشاعت اور تشہیر کرتے ہیں۔ ان تصویروں پر کچھ لکھا نہیں ہوتا۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ پچھلی صدی میں لیا ہوا فوٹو ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ صدیوں قبل کے کسی مصور کی نقاشی کا شاہکار ہے۔ بات افراد تک محدود نہیں بلکہ بعض اوقات اخبارات بھی، پوری نیک نیتی سے، یہ تصاویر چھاپ دیتے ہیں۔ عقیدت مند مسلمان یہ تصاویر احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انہیں دیدہ زیب فریموں میں لگا کر کسی اونچی یا مرکزی جگہ پر رکھا، یا لٹکایا، جاتا ہے۔ بعض عقیدت مند، جن میں بعض بہت تعلیم یافتہ اشخاص بھی شامل ہوتے ہیں، ان تصاویر کا عقیدت سے بوسہ لیتے ہیں، انہیں آنکھوں سے لگاتے اور سر پر رکھتے ہیں۔

اب تک یہ کام خاموشی سے اور محدود پیمانے پر ہوتا رہا۔ انٹرنیٹ کے بعد ان تصاویر کی تشہیر و اشاعت میں ناقابلِ یقین حد تک اضافہ ہو چکا ہے اور اب یہ کروڑوں گھروں میں، پہنچ چکی ہیں۔ انٹرنیٹ زیادہ تر اس نوجوان نسل کے زیرِ استعمال ہے جسے ان حقائق کا علم نہیں جو اس مضمون میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ نوجوان ان تصاویر پر آسانی سے یقین کر لیں گے۔ اس قسم کی ایک تصویر کا عکس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ قونیہ (ترکی) میں، مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار کے فوٹو سے ناقابلِ یقین مشابہت رکھتی ہے، جسے ثابت کرنے کے لیے مولانا رومیؒ کے مزار کا فوٹو بھی کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

ان جعلی تصاویر یا نقاشی کے شاہکاروں میں رسولِ کریم ﷺ کی قبر سطحِ زمین سے کافی اونچی دکھائی دیتی ہے۔ اس پر ایک منقش چادر تنی ہوئی ہے اور سرہانے بھاری عمامہ نظر آتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جن مہر بند دیواروں کے اندر شاذ و نادر ہی کوئی انسان داخل ہوا ہو، اور جہاں قبریں موجودہ سطحِ زمین سے کئی فٹ نیچے ہوں، وہاں کسی قبر کا فوٹو کیسے لیا جا سکتا ہے؟ علاوہ ازیں کیمرے کی ایجاد ۱۸۲۰ء تا ۱۸۳۰ء کے عشرے میں دو فرانسیسی موجدوں نے کی، گویا کیمرہ کو ایجاد ہوئے ابھی دو صدیاں بھی نہیں گزریں۔

جہاں تک مصوّری کا تعلق ہے تو اولاً نقاشی کے ان شاہکاروں پر نہ مصوّر کا نام درج

ہوتا ہے اور نہ یہ لکھا ہوتا ہے کہ یہ رسولِ کریم ﷺ کی قبر کی شبیہ ہے۔ ثانیاً خواہ پہلی صدی ہجری ہو یا نویں صدی ہجری، ان قبروں کو جب بھی دیکھا گیا، وہ نہ سطحِ زمین سے بلند تھیں، نہ پکّی تھیں، نہ ان کے گرد کوئی کٹہرا تھا، نہ ان کے اوپر کوئی چادر تھی اور نہ ان کے سرہانے کوئی عمامہ تھا۔

اکیسویں صدی عیسوی میں، جہاں ہر انسان کا یہ حق ہے کہ اسے سچائی کا علم ہو، وہاں اس کا یہ فرض بھی بنتا ہے کہ وہ جھوٹ کو رَد کر دے۔ غلط فہمی دور کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی غلط بیانی۔ اگر فہم یا بیان کی ان غلطیوں کا تعلق اللہ کے آخری رسول ﷺ کی ذات سے ہو تو ہر مسلمان کا، انسان اور مسلمان ہونے کے ناطے، یہ دہرا فرض بنتا ہے کہ وہ سچ کا بلا تاخیر اظہار کرے اور اس کی حسبِ توفیق تشہیر و اشاعت کرے تا کہ حقیقت دُنیا کے کونے کونے تک پہنچے۔

گزشتہ صفحات میں، جن مقدس مقامات کا نقشہ الفاظ میں کھینچا گیا تھا، وہ اگلے صفحے پر ایک نقشے کی شکل میں پیش ہیں۔

اللھم صل علیٰ محمد النبی الامّی و اٰلہٖ و اصحابہٖ وسلّم

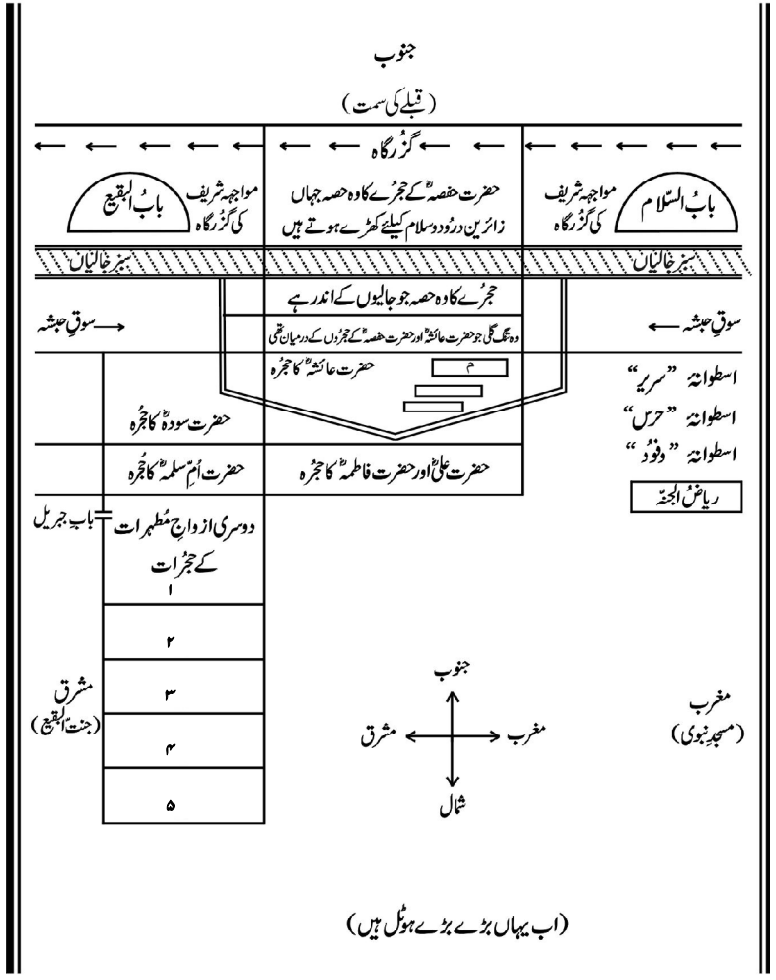

کتابیات:

(۱) وفاء الوفا بأخبار دار المصطفیٰ (عربی متن)، جلد دویم، ص: ۱۸۵ تا ۱۸۹،
مؤلف: علامہ نور الدین علی بن احمد سمہودی، ناشر: دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان،
سالِ اشاعت: ۲۰۰۶ء

(۲) **دیار المحبوب (جذب القلوب الی دیار المحبوب** کا اردو ترجمہ) ص: ۱۲۷ تا ۱۲۹، مصنف: شیخ عبد الحق
محدث دہلویؒ، مترجم: حکیم سید عرفان علی، ناشر: تاج کمپنی، ترکمان گیٹ، دہلی، سالِ اشاعت: ۱۹۹۰ء

(۳) صحابہؓ کے مکانات، ص: ۱۸ تا ۳۴/ اور ۴۳ تا ۴۵، مؤلف: ڈاکٹر محمد الیاس عبد الغنی،
ناشر: مطابع الرشید، مدینہ، سالِ اشاعت: ۲۰۰۳ء

(۴) مسجد نبوی شریف، ص: ۱۲۶، ۱۲۷/ اور ۱۲۹ تا ۱۳۸، مؤلف: ڈاکٹر محمد الیاس عبد الغنی،
ناشر: مطابع الرشید، مدینہ، سالِ اشاعت: ۲۰۰۳ء